

فیض سعید (جلد سوم)

مقالاتِ اصلاحی

مجموعہ مضامین

مولانا محمد عبد القوی

خليفة حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب مدظلہ العالی

جمع و ترتیب

مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی

استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ناشر

برکات Barakaath بک ڈپو
Book Depot



۶۱

تفصیلاتِ طباعت

نام کتاب:	: فیض سعید (جلد سوم)
مجموعہ مضامین:	: حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ
جمع و ترتیب:	: سید خواجہ نصیر الدین قاسمی
صفحات:	: ۲۸۸
قیمت:	: 200/-
طباعت و سرورق:	: السبلاغ گرافکس، حیدرآباد 9441025508
ناشر:	: برکات بکڈپو، خواجہ باغ کالونی، سعیدآباد، حیدرآباد

ملنے کے پتے

040-65709415	مکتبہ فیض ابرار، نزد مسجد اکبری، اکبر باغ، حیدرآباد۔ ۳۶
040-24070681	ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ، سعیدآباد حیدرآباد۔ ۵۹
09849766790	فیضی کتب خانہ، نزد مدرسہ فیض العلوم، سعیدآباد، حیدرآباد
9885655591	مکتبہ کلیمیہ، نزد یوسفین چوراہا، نام پٹی، حیدرآباد،
09421956690	مدرسہ خیر المدارس، چودھری نگر، لاٹور، مہاراشٹر

فہرست عناوین

۶	کلماتِ بابرکات از حضرت مولانا شاہ جمال الرحمن صاحب مدظلہ العالی	۱
۷	تقریر از حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مدظلہ	۲
۸	تاثرات از حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری مدظلہ	۳
۱۱	پیش گفتار	۴
۱۳	فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ	۵
۱۷	ہائے یہ اردو صحافت!	۶
۲۰	جب چڑیا چک گئی کھیت	۷
۲۹	عالم یہ جل رہا ہے برس کر بھجائیے!	۸
۳۸	اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے	۹
۴۳	چوں کفر از کعبہ برخیزد	۱۰
۵۳	دارالعلوم دیوبندی کا تیجہ کیوں؟	۱۱
۷۱	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا	۱۲
۸۹	مسلم بھائی بہنوں سے ایک اہم گزارش	۱۳
۹۵	بابری مسجد قضیہ کا فیصلہ	۱۴
۱۰۰	اگر ایسا نہ کرو گے تو۔۔۔۔۔	۱۵
۱۰۵	علاقائی زبانوں میں کام کی ضرورت	۱۶
۱۱۰	شراب سے معاشرہ کو بچائیے	۱۷

۱۱۸	منشیات و محذرت اور مسلم نوجوان	۱۸
۱۲۲	عالم عرب میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا؟	۱۹
۱۲۵	گرما کی چھٹیاں اور ان کا استعمال	۲۰
۱۳۱	کرنے کے چند اہم کام یہ بھی ہیں	۲۱
۱۴۲	رمضان المبارک مولائے مہربان کے لئے یا نفس و شیطان کے لئے	۲۲
۱۴۵	ایصالِ ثواب کا عقیدہ برحق اور اجماعی ہے	۲۳
۱۵۷	برہنہ سری اسلامی تہذیب کے خلاف ہے	۲۴
۱۶۴	سن ہجری تاریخ و احکام	۲۵
۱۶۸	حیاتِ برزخی علامہ ابن تیمیہ کی نظر میں	۲۶
۱۷۹	اعتکاف میں آداب کی رعایت	۲۷
۱۸۲	رمضان کے بعد!	۲۸
۱۸۴	منکرینِ فقہ کا ظلم و عدوان	۲۹
۱۹۴	انہا شہادۃ	۳۰
۱۹۹	وَمَا كُنَّا لِنَهْتِدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَيْنَا اللَّهَ	۳۱
۲۰۳	وقف بورڈ سے ائمہ و موزنین کو تنخواہوں کی ادائیگی کا مسئلہ	۳۲
۲۱۲	رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ پس منظر اور ضرورت	۳۳
۲۱۷	دارالعلوم دیوبند میں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس	۳۴
۲۲۳	دو گھنٹے حکیم جسم و جاں کی صحبت میں	۳۵
۲۳۰	قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا	۳۶
۲۴۷	ادھر بھی تو دیکھئے!	۳۷

۲۵۵	اختلاف سے کہاں مفر ہے؟	۳۸
۲۶۰	چند معروضات علماء کرام کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ	۳۹
۲۶۸	ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں	۴۰
۲۷۸	لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو	۴۱
۲۸۰	لوٹ پیچھے کی طرف اے مسلمان تو	۴۲
۲۸۴	تبصرہ بر ”عمدة الاقاویل فی تحقیق الاباطیل	۴۳

کلماتِ بابرکات^۱

از
عارف باللہ حضرت مولانا شہ محمد جمال الرحمن صاحبِ مفتاحی دامت برکاتہم

مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد ان اہل علم و خوش نصیب افراد میں سے ہیں جن سے حق تعالیٰ دینی خدمات کے مختلف میدانوں میں خوب کام لے رہے ہیں، مولانا ایک بڑے مدرسہ کے ناظم اور بہت سی دینی و عصری مدارس کے سرپرست و نگران ہیں، وہ متعدد دینی تنظیموں اور اداروں کے ایک فردِ فعال ہیں، وعظ و ارشاد اور اصلاح باطن و تربیت نفوس کی جدوجہد میں مشغول ہیں، تصنیف و تالیف اور قلمی دنیا میں بھی بہت گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہی میں سے ایک وہ ماہنامہ ہے جو پہلے ”اشرف العلوم“ کے نام سے بعد ازاں ”اشرف الجرائد“ کے نام سے شائع ہو رہا ہے، تقریر کی طرح مولانا کی تحریر بھی شستہ و پرتاثر ہوتی ہے، موصوف محترم کے مضامین و نگارشات عوام و خواص سب کے لئے نہایت نافع ہیں، بندے نے بھی مولانا کی متعدد تصانیف اور مضامین سے استفادہ کیا ہے، عام طور پر ماہنامے موقتی تقاضوں اور احوال کی مناسبت سے تحریر کئے جاتے ہیں، نتیجہً عوام مہینوں کے گزرنے کے ساتھ ان جرائد سے بھی بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں، حالانکہ دینی ماہنامے کے مواد و مضامین اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، روزناموں کی خبروں کی طرح دن گزرنے کے

۱۔ تینوں تقریظات فیض سعید کی پہلی اور دوسری جلد کے لئے لکھی گئی تھیں، برکتِ تیسری جلد میں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔

ساتھ غیر اہم نہیں ہوتے، اسی لئے مولانا کے فیض یافتہ شاگرد رشید مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب نے مولانا کے ان مضامین کی افادیت کے پیش نظر انہیں یکجا کر کے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو جمع کیا ہے، جس کا نام ”فیض سعید“ رکھا گیا ہے، جو صاحبِ مضامین کے شیخ محترم کی طرف منسوب ہے، جو انشاء اللہ مزید موجب برکات ہوگا۔

محترم مرتب کی یہ کاوش کسی شاگرد کی جانب سے اپنے استاد محترم سے حسن عقیدت اور متعلقہ حقوق کی ادائیگی کی شکلوں میں ایک عمدہ و مستحسن شکل ہے، حق تعالیٰ مرتب و مضمون نگار کی ان خدمات کو شرف قبول بخشے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادہ کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا شاہ) محمد جمال الرحمن (صاحب) مفتاحی



تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب دامت برکاتہم
ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً اما بعد!

پیش نظر علوم و معارف پر مبنی مجموعہ مضامین جو کہ فیض سعید کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، ملاحظہ و تقریظ کیلئے میرے پاس بھیجا گیا، مضامین کے دیکھنے کا موقع ملا الحمد للہ مختلف مضامین پر مشتمل بہترین گلدستہ ہے، مضامین نہایت مفید اور کارآمد ہیں اور ان

میں تقریباً ضرورت کے اہم عنوانات آگئے ہیں، جس طرح شاہین کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی ہے اسی طرح عزیزم مولانا حافظ محمد عبدالقوی سلمہ اللہ کے مضامین روحانی اعتبار سے بلند سے بلند تر ہیں۔ عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین قاسمی سلمہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ان مختلف مضامین کو کتابی صورت میں استفادہ عام کیلئے مرتب کر دیا ہے۔

بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب ہذا کو مقبولیت عامہ و تمامہ نصیب فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مخلوق کو منتفع ہونے کی توفیق بخشے اور آخرت کیلئے صدقہ جاریہ بنائے، نیز مولف و مرتب دونوں کو اپنی شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی (صاحب مظاہری)

۲/ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ / ۲۰ جنوری ۲۰۱۰ء



تأثرات

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذ ادب دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب حامی دامت برکاتہم، ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد، و نائب ناظم مجلس علمیہ آندھرا پردیش، جنوبی ہند کے اُن باتوفیق علماء میں سے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے دین متین کی کثیر جہتی خدمت کیلئے منتخب فرمایا ہے، اُن کا قائم کردہ

ادارہ اشرف العلوم بہت کم وقت میں دکن کی ایک معیاری تعلیم گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کا اندازہ اس کی جانب طلبہ کے رجوع عام اور یہاں کے مستفید طلبہ کے مادرِ علمی ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں بکثرت داخلہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد سے باہر، انتہائی ضرورت کے علاقوں میں مکاتب و مدارس کے قیام کا سلسلہ بھی مولانا نے شروع فرمایا ہے، جن میں سے ایک اہم ادارہ امداد العلوم (نارائن کھیڑ) کے اجلاس میں احقر کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

ان انتظامی اور ملی خدمات کے علاوہ مولانا موصوف کا قلمی جہاد بھی جاری ہے، ان کے ادارہ سے ایک معیاری ماہنامہ ”اشرف الجرائد“ شائع ہوتا ہے جو ان کی بصیرت امسروز تحریروں سے مزین ہوتا ہے، جو وقت اور حالات کے تحت ہر قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، انہی تحریروں اور مضامین و مقالات کو ادارہ کے استاذ جناب مولانا سید خواجہ نصیر الدین صاحب زید مجدہم نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس وقت احقر کو اس مجموعہ سے — جس کا نام ”فیض سعید“ رکھا گیا ہے — استفادہ کا موقع ملا۔ احقر نے فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بعض حصوں کو سرسری دیکھا اور بعض مقالات کو بالاستیعاب پڑھا جس کے بعد احقر بلا تکلف اپنا یہ تاثر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا موصوف اپنی تعلیمی، تربیتی اور ملی ذمہ داریوں کی طرح اس میدان میں بھی پوری طرح کامیاب اور موفق من اللہ ہیں، اُن کی تحریر میں الحمد للہ زبان و بیان کی سلاست کے ساتھ ساتھ مسلک حق کی کامیاب ترجمانی اور حضرات اکابر سے حاصل ہونے والا توازن و اعتدال نمایاں ہے۔

ان مقالات و مضامین کے موضوعات کا انتخاب بھی مولانا کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے، بلکہ بعض موضوعات تو اُن کی جرأت و بیباکی اور سلیقہ کیساتھ حق گوئی کا شاہکار ہیں، پھر اس قدر تعلیمی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کے ساتھ اس معیار کی تحریری خدمات انجام دینا

بلاشبہ ایک کرامت کی چیز ہے۔ یہ مضامین یقیناً اس لائق تھے کہ ان کو مستقل کتابی شکل میں شائع کر کے ان کے فائدہ کو عام کیا جاتا، اس لئے میں اس کتاب کی اشاعت پر حضرت مولانا موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور حق جل مجدہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ باری تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور اس کو تمام مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس علاقہ کے لئے — جہاں صحیح فکری رہنمائی کی ضرورت زیادہ ہے — رشد و ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا) محمد سلمان عفی اللہ عنہ (صاحب)

خادم التدریس دارالعلوم دیوبند

(نزیل حیدر آباد دکن)

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ ۷ مارچ ۲۰۱۰ء، چہار شنبہ



پیش گفتار

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم! ما بعد!

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کے انعاماتِ کثیرہ میں سے ایک عظیم انعام یہ بھی ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جو اکابر اہل حق سے وابستہ اور دین کی خدمت میں مشغول تھا، ایک دینی مدرسہ کے ماحول میں پیدائش ہوئی اور پیدائش سے تادم تحریر زندگی کے پانچ دہے مکمل مدرسہ کے ماحول میں گذر گئے، فللہ الحمد ولا فیخر، اللہ پاک سے دعا ہے — قارئین بھی آمین فرمائیں — کہ بقیہ زندگی جتنی بھی اس کے علم محیط اور کتاب مبین میں باقی ہے اپنے دین کی مخلصانہ خدمات سے وابستہ رکھے، اور کسی ناقدری و ناشکر گزاری کی پاداش میں اس خدمت سے کبھی معزول نہ فرمائے۔

یہ شعبان ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۳ء کی بات ہے، جبکہ اس عاجز کی عمر ۳۴ سال تھی اسی کے اگلے سال محرم الحرام ۱۴۱۴ھ سے میں نے اپنی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے ادارہ اشرف العلوم سے بنام خدا ایک ماہنامہ کا اجراء کر دیا، یہ ماہنامہ ابتداءً ”اشرف العلوم“ کے نام سے آٹھ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا، پھر بعض عوارض کی بنا پانچ سال تک موقوف رہا، اس کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا سلسلہ جنوری ۲۰۰۶ء سے بنام ”اشرف الجرائد“ شروع ہوا، جو تاہنوز بفضلہ تعالیٰ جاری ہے، اور علاقہ کے اردو جرائد میں اچھی نظر سے دیکھا جا رہا ہے، اس ماہنامہ کی برکت سے مجھے کچھ لکھنے کا موقع ملتا رہا، کبھی حالاتِ پیش آمدہ پر، کبھی مواقع و مواسم کی مناسبت سے، کبھی کسی مسئلہ شرعی پر روشنی ڈالنے کیلئے اس عرصہ

میں اس عاجز نے جو کچھ لکھا ہے زیر نظر کتاب انہی متفرق و متنوع مضامین کا مجموعہ ہے۔
 کتاب کا نام مرشدی و مربی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنامیٹی مدظلہ العالی
 کے اسم گرامی سے تبرک حاصل کرتے ہوئے ”فیض سعید“ رکھا ہوں، حضرت والا دامت
 برکاتہم کے اس عاجز پر مرشد اول محی السنۃ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے
 بعد بے انتہا احسانات اور خصوصی توجہات ہیں، اسی کی برکت سے یہ بندہ عاجز و عاصی
 مسلمانوں کی نظر میں کسی عزت کا مستحق ہو سکا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر صحت اور سلامتی میں
 بے انتہا برکت نصیب فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے بندوں کی دینی و فکری راہنمائی کیلئے حسب حیثیت
 کی گئی اس سعی کو شرف قبول عطا فرمائے، اور تمام ترکوتاہیوں کے باوجود محض اپنی قدرت
 سے ان مضامین کے نفع کو تمام و عام فرمائے۔ آخر میں عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین سلمہ
 نے اس کی ترتیب میں جو صبر آزمائے تعاون کیا ہے اسکا میں ممنون ہوں اور ظاہری و باطنی
 ترقیات کی دعاؤں کے ذریعہ شکر یہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

محمد عبد القوی غفرلہ

یکم ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

فَلَبَّاسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ

اس کائنات رنگ و بو میں بنی نوع انسانیت کے وجود کا مقصد عیش کوئی، لذت اندوزی اور شہوت رانی نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد بندگی کی آزمائش اور وفاداری کا امتحان ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: اللہ وہ ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا، تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے (سورۃ الملک: ۱) دوسری جگہ فرمایا: تاکہ اللہ تعالیٰ (علم مشاہدہ میں) جان لے کہ تم میں سے کون ایمان لاتا ہے اور کون منافق بنتا ہے؟ (سورۃ العنکبوت: ۱۱) ایک اور جگہ فرمایا گیا: تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ تم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ (سورۃ العنکبوت: ۲) حاصل یہ کہ اس دنیا میں انسانوں کو زندگی حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی بندگی کے لیے دی گئی ہے۔

جب تخلیق انسانی کا منشاء عبودیت و بندگی کا امتحان قرار پایا تو مشیت الہی و حکمت ایزدی نے مناسب سمجھا کہ انسانوں کو دیگر حیوانات کے مقابلہ میں زیادہ عقل و شعور بخشا جائے اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اُن کی ہدایت و رہنمائی کا انتظام کیا جائے، اسی ضرورت اور مصلحت کے مد نظر ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا ایسا عظیم الشان نظام ہدایت انسانوں کو عطا کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ بندگانِ خدا بہ سہولت و آسانی اپنے خالق و مالک کو پہچان سکیں اور بحسن و خوبی اُس کی بندگی کا فریضہ انجام دے سکیں، چنانچہ ایک دوہیس ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں بھیجے گئے، جن کی ابتداء سب سے پہلے

انسان ابونا حضرت آدم علیہ السلام سے کی گئی اور انتہاء سب سے افضل انسان سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر!

تاریخ انبیاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی انبیاء علیہم السلام کسی قوم کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیے گئے اور انہوں نے اپنی قوم کو توحید و رسالت اور عقیدہ آخرت کی طرف دعوت دی تو ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک حصہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے انبیاء کی دعوت کو قبول کر کے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا شرف حاصل کر لیا، دوسرے نے ان کی دعوت کو جھٹلا کر مخالفت و ایذا رسانی پر کمر کس لی، اللہ تعالیٰ نے پہلے انہیں سوچنے سمجھنے اور پوری بصیرت کے ساتھ فیصلہ کر لینے کے لیے جب تک چاہا مہلت دی اور بہت دی، اس کے باوجود بھی جب ان کی یہ صورت حال نہ بدلی، طرز عمل تبدیل نہ ہوا، وہ اسی طرح اپنے نبی کی خیر خواہی کا جواب بدخواہی و ایذا رسانی سے دیتے رہے اور اہل ایمان کو تنگ و بددل کرتے رہے تو پھر انبیاء علیہم السلام اور ان کی فرمانبرداری جماعت کو تو اللہ تعالیٰ نے نجات و حفاظت عطا فرمائی اور دوسرے گروہ کو اپنے عذاب و عقاب میں مبتلا فرما کر ان کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حین حیات اور ان کی موجودگی میں پیش آنے والی صورت حال کا ذکر تھا، اقوام عالم کے احوال پر غور کرنے سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس طرح انبیاء کی دعوت کے زمانہ میں ان کی قوم ”مومن و کافر“ کے دو زمروں میں منقسم ہو جاتی ہے، اسی طرح ان کے دنیا سے پردہ فرما لینے کے بعد ان کی امت کے اہل ایمان بھی دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، ایک وہ جو ان کی دعوت، محنت اور تعلیم کو اپنا مشن اور اوڑھنا بکھونا بنا لیتے ہیں، اس پر بہ صد ذوق و شوق عمل کرتے اور بہ ہزار مشقت و محنت دوسروں تک پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ان کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں، ان کے دین اور ان کی امت کی صلاح و فلاح اور ہدایت و نجات کے لیے ہر راحت و آرام کو قربان

کرتے اور ہر طرح کی مشقت و کلفت کو گوارہ کر لیتے ہیں، دوسرا وہ جو نخر و اور نعروں میں مگن اور محض چیخ و پکار، نام و نمود کے کاموں میں لگا رہتا ہے، یوم ولادت، یوم وفات جیسے مواقع سے چند من پسند رسوم کی تکمیل اور من گھڑت اعمال کی تعمیل ہی کو وفاداری کا تقاضہ سمجھتا ہے، اس طبقہ کو نبی کی تعلیم و دعوت سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے اور اُن کے پیغام کو اقوام عالم تک پہنچانے کی فکر و اور محنتوں سے قطعاً دلچسپی نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام ہوتی ہے، نبی ﷺ کا دین مٹتا رہتا ہے مگر انھیں اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، نبی ﷺ کی سنتیں مٹی رہتی ہیں پر انھیں اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا، نبی ﷺ کی امت الحاد و ارتداد کی شکار اور دشمنان اسلام کی سازشوں سے دوچار رہتی ہے، انھیں محافل مولود اور مجالس فاتحہ و درود سے بڑھ کر کوئی کام سمجھ ہی میں نہیں آتا، ان کے نزدیک شریعت کے احکام، مسائل حلال و حرام، اور سنت والے نظام کی اشاعت و حفاظت سے زیادہ ضروری بدعات و خرافات اور رسوم و رواج کا تحفظ ہوتا ہے، وہ لَا يَنْفَعِي مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَنْفَعِي مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ جیسی پیشین گوئیوں کے مصداق ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں اُن کے اور اہل حق کے درمیان تعارض و تصادم ہوتا رہتا ہے، اہل حق اور اہل وفا کو ہر دم نبی کے مقاصد کا تحفظ کرنے اور امت کو سنت کی صراطِ مستقیم پر جمائے رکھنے کی دن رات فکر لگی رہتی ہے، انھیں ایجادِ بندہ رسوم سے قطعاً دلچسپی نہیں ہوتی، اس کشمکش میں بظاہر کبھی وہ طبقہ غالب آ جاتا ہے، کبھی یہ! مگر نبی کے سچے عاشقوں اور اُس کے دین کے حقیقی محافظوں کے حوصلے کسی حال میں پست نہیں ہوتے، اس لیے وہ اپنے نبی کے مشن کو لے کر مسلسل ان غافلوں سے نبرد آزما رہتے ہیں، جب ان کو حق بات سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کے لیے اہل حق کا طبقہ سامنے آتا ہے تو وہ کَاتَمَّهُمْ حُمْرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ کی عملی

۱۔ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور قرآن کی صرف رسم رہ جائے گی۔ (ارشاد نبوی)
 ۲۔ گویا کہ وہ وحشی گدھے ہوں جو جنگل کے شیر کو دیکھ کر بھاگ رہے ہوں۔ (ارشاد خداوندی)

تصویر بن جاتے ہیں، نہ خود حق کو قبول کرتے ہیں نہ دوسروں کو آگے بڑھنے دیتے ہیں، جب یہ حالات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو ایسے وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جانب غضب کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کرنے والوں کو چھوڑ کر سب ہی پر اپنا عذاب نازل فرما دیتا ہے: **الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ مِّمَّا كَانُوا يَفْسُقُونَ** ﴿۱۵﴾

افسوس اور صد افسوس! کہ آج حضرت محمد ﷺ کی امت میں بھی ایک بڑا طبقہ یادوں، جشنوں، جلوسوں اور نعروں کے فریب میں مبتلا اور نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، احلاق و اعمال اور دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے دور بلکہ نفور ہو گیا ہے، ربیع الاول کے اس مبارک مہینہ کے آغاز سے تادم تحریر امت کے نوجوانوں اور عشق و محبت کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے جو احوال سامنے آرہے ہیں وہ ہمارے اس دعوے کی کھلی دلیل ہیں۔ والعیاذ باللہ من الزیغ بعد الہدی۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کی صحیح فہم عطا فرمائے، اور سچا عشق رسول نصیب فرما کر اس کے تقاضوں کی تکمیل میں مصروف فرمائے، آمین۔

(اداریہ مارچ ۲۰۰۹ء)

سے جب انہوں نے ہماری تعلیمات کو بھلا دیا تو ہم نے برائی پر نکیر کرنے والوں کو تو نجات دے دی اور ظالموں کو آن کی بدگلی کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر دیا۔ (ارشاد خداوندی)

ہائے یہ اردو صحافت!

کتابت و صحافت مافی الضمیر کے اظہار اور حق کے احقاق و اخبار کا بہترین ذریعہ اور مفید ترین وسیلہ ہے، حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی پہلی ہی وحی میں انسان کو مَالِکٌ یَعْلَمُ کی تعلیم ”قلم“ کے ذریعہ دئے جانے کی نسبت اپنی ذاتِ عالی کی طرف کر کے اور پھر دوسری جگہ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُونَ کی قسم کھا کر کتابت و صحافت کی عظمتوں کو اوج کمال تک پہنچا دیا اور انسانی سماج میں اس کی بنیادی اہمیت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے، جس کے بعد اس سلسلہ میں مزید کسی کی تائید و تقویت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی؛ یہ تو نفسِ فضیلت کی بات تھی، جہاں تک اس کے استعمال کے لیے اسلامی آداب و احکام کی بات ہے تو اس میں کوئی شک یا دورائیں نہیں ہو سکتیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اسلامی احکام و آداب کے دائرہ حدود و قیود سے باہر ہو، اسلامی نقطہ نظر سے مسلمان بہ حیثیتِ مسلمان کسی میدان میں اور کسی کام میں کلیۃً خود مختار و آزاد نہیں ہو سکتا، چنانچہ صحافت کے سلسلہ میں بھی وہ اپنی فکر و عقل کی اتباع یا دیگر اقوام کی نقالی میں آزاد نہیں ہے بلکہ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ احکام و آدابِ اسلامی کا اپنے آپ کو پابند رکھے۔

اسلام نے صحافت و اخبار سے متعلق جو احکام دئے ہیں اور جن آداب و اقدار کا اپنے تابعین کو پابند کیا ہے وہ ایک مستقل و مفصل موضوع ہے، جو قرآن کریم اور احادیثِ شریفہ میں ضمناً بھی مذکور ہیں اور مستقلاً بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں

واقعات کو یقیناً نقل کرنے اور حذف و اضافہ سے بچنے کی ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ، اے نبی ﷺ! آپ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ ان لوگوں کو ٹھیک ٹھیک سنا دیجئے۔ (سورۃ المائدہ: ۲۷) غیر معتبر لوگوں سے پہونچنے والی اطلاعات پر اعتماد نہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا، اگر غیر معتبر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ (سورۃ الحجرات: ۶) نامناسب اور نقصان دہ خبروں کی اشاعت سے گریز کرنے کا حکم دیتے ہوئے تنبیہ فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۹ فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ ۝۲۰، بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کے معاشرہ میں بُری باتیں عام ہوتی رہیں اُن کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب الیم ہے۔ (سورۃ النور: ۱۹) اور لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ، اللہ تعالیٰ بُری باتوں کے اعلان کو پسند نہیں فرماتا، سوائے مظلوم کے۔ (سورۃ النساء: ۱۲۸)

قرآن کریم کی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی تعلیمات میں ان آداب کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ فَكَأَنَّمَا اَحْيَا مَوْتُوْدَةً فِي قَبْرِهَا، جس شخص نے کسی کے عیب کو چھپا لیا تو گویا اس نے ایک زندہ درگور کی جانے والی لڑکی کو بچا لیا۔ (شعب الایمان) اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا: جس نے کسی مسلمان بھائی کی پردہ دری کی یعنی اس کے عیوب افشاء کر کے بے آبرو کیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کو مخلوق پر اس طرح ظاہر کریں گے کہ وہ اپنے گھر کے اندر بھی عزت کے ساتھ نہیں رہ پائے گا۔ (ابن ماجہ: ۲۵۴۶) تقریر و تحریر کے ممکنہ مضرات سے بچنے کا انتہائی حکیمانہ نسخہ عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَنْ حَسَنَ اسْلَامَ الْمَرْءِ تَرَكَ مَا لَا يَعْنِيهِ، آدمی کے ایمان و اسلام کی تکمیل و تزئین لا یعنی کے ترک پر موقوف ہے۔ (ترمذی: ۲۳۱۸) مؤمن کی امتیازی شان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَانِ وَلَا اللَّعَانِ وَلَا

الفاحش ولا البذی، مسلمان طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، بدکلام اور بدخو نہیں ہوتا۔ (سنن ترمذی: ۱۹۷۷) ان کے علاوہ بے شمار آیات و احادیث ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت مقصود نہیں ہے، بطور اشارہ و مثال کے ان میں سے چند ایک کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

ان احکام و آداب کے برخلاف آج کل مسلم صحافت کی جو صورت حال عموماً پورے ملک میں خصوصاً ہماری ریاست میں پائی جا رہی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک ہے، ایک دوسرے کی بے آبروئی روز روز کا مشغلہ بن گیا ہے، باہمی مخاصمتوں کو ملی ہمدردیوں کے عنوان سے جوڑ کر دشنام و انتقام کی بدترین مثال قائم کی جا رہی ہے، ایک دوسرے کی خانگی زندگیوں میں سے تک نکال کر ایسی ایسی باتیں منظر عام پر لائی جا رہی ہیں جن سے ایک طرف ملت غیروں کی نظر میں خوار ہو رہی ہے تو دوسری جانب خدمت گزاران قوم کی شبیہ بگڑ کر عوام الناس کی نظر میں ان کا اعتماد مجروح ہوتا جا رہا ہے؛ تیسری جانب لوگوں میں غیبتوں، بہتان طرازیوں اور تبصروں کا بازار گرم ہوتا جا رہا ہے، اس سے بھی بڑھ کر شرمناک بات یہ ہے کہ بعض دینی و اسلامی جماعتوں کے اختلافات کے نتیجہ میں بسا اوقات مذہبی جرائد و مجلات میں بھی ایسے تبصرے و تذکرے دیکھنے میں آ رہے ہیں جو اہل علم و اصحاب دین کے قلم سے ہونے کے باوجود اسی عامیانہ سطح جہالت پر گرے ہوئے ہیں۔ فیاللاسف مختصر یہ کہ صحافت بالخصوص اسلامی صحافت انتہائی ذمہ دارانہ کام ہے، اس کے لیے بہت ہی صبر و ضبط، حلم و تدبر اور قوم کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی کی ضرورت ہے؛ اور ظاہر ہے کہ اس کی پاسداری متعلقہ آداب و احکام سے اچھی طرح واقفیت اور بھرپور رعایت کے بغیر ممکن نہیں! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے کرم سے ہمیں ہر میدان کار میں سدا و صواب پر قائم اور افراط و تفریط سے محفوظ رکھے۔ آمین

(اداریہ اپریل ۲۰۰۹)

جب چڑیا چک گئی کھیت

دین اسلام ایک مکمل دین ہے جو عقیدہ و عمل کا جامع ہے، اس کی اساس اور بنیاد اصلاً کتاب و سنت اور اجماع امت پر ہے اور ضرورۃً قیاس سے مدد لی جاتی ہے، اسی وجہ سے جمہور امت کے ہاں ”اصول الاسلام اربعۃ“ کہا اور مانا جاتا ہے، جو لوگ قیاس و اجماع کے اصول میں ہونے کے منکر ہیں وہ بھی انکار کے باوجود ان سے عملاً مستغنی نہیں ہیں، اس لیے یہ بات طے ہے کہ اسلام کے — خوائی نہ خوائی — یہی چار اصول ہیں، اور سب کے ہاں معمول بہا ہیں۔

یہ بات بھی طے ہے کہ اسلام کا بڑا حصہ وہ ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ سب کے ہاں متفق العمل ہے، صرف چند مسائل ایسے ہیں جو بعض مسئلہ مشکلات کی وجہ سے تنقیح طلب ہوتے ہیں، انہی چند مسائل میں محققین و مجتہدین کی رائے تمام تر خلوص و للہیت اور حتی المقدور سعی و کوشش کے باوجود بھی یکساں نہیں ہوتی، بلکہ اپنے اپنے طریقہ تحقیق اور اصول اجتہاد کی روشنی میں مختلف ہو جاتی ہے۔ جب کہ ایسا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ یہ اختلاف صحابہ کرامؓ میں بھی تھا، تابعین عظام میں بھی تھا، ائمہ مجتہدین میں بھی تھا، ائمہ محدثین میں بھی تھا، اور صدرِ اول سے تھا آج تک ہے قیامت تک رہے گا، کسی زمانہ میں علماء اسلام کو یہ خیال نہ ہوا کہ ایسا کیوں ہوا؟ یا ایسا ہونا تقاضہ دین کے منافی ہے، یا اس سے امت کو کوئی عملی مشکل پیش آرہی ہے یا یہ کہ اس کو ختم کر کے کسی ایک رائے یا کسی ایک کی رائے پر انحصار کر لینا چاہیے وغیرہ، کبھی کسی عالم دین کو دین میں اس اختلاف

کے پائے جانے پر کسی قسم کی کھٹک نہیں ہوئی، بلکہ اس کے برخلاف ہر زمانہ کے علماء و ائمہ کے نزدیک یہ اختلاف تقدیر الہی میں طے شدہ اور امت کے حق میں مختلف پہلوؤں سے باعثِ سہولت و رحمت ہے۔

البتہ ایک مختصر طبقہ اہل اسلام میں اُن لوگوں کا بھی رہا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام مسائل میں صرف کتاب و سنت پر بغیر کسی قیاس و اجتہاد کے عمل کرتے ہیں، صرف نظر اس بات کے کہ یہ دعویٰ عملاً کس حد تک حق بجانب ہے، خود اس طبقہ کے علماء کے نزدیک بھی قیاس و اجتہاد کی راہ سے احکام کی تحقیق و تعیین کرنے والے اسلام ہی کے پائے والے اور سنت ہی کو تلاش کرنے والے سمجھے جاتے رہے، فکر کے اختلاف اور اپنے موقف پر شدت سے اصرار کے باوجود مسلمانوں کو مسلمان ہی مانتے تھے، فروعی اختلاف کو عبوری اتحاد کے بکھرنے کا سبب بننے نہیں دیتے تھے، لیکن دھیرے دھیرے اس طبقہ کی شدت نے ناحق ظلم و زیادتی کی راہ اختیار کر لی، اور یہ طبقہ صرف اپنے کو حق کا پانے والا اور باقی سب مسلمانوں کو باطل پر مصر اور گمراہی پر قائم رہنے والا قرار دینے کے خبط میں مبتلا ہو گیا۔ جمہور علماء ان کی اس جہالت کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کو اعتدال کے متواتر راستہ کی طرف دعوت دیتے رہے، لیکن جب سے اس طبقہ غیر مقلدین کو مملکتِ سعودیہ عربیہ میں قدم جمائے اور وہاں کے غیر محقق اور سطحی علم رکھنے والے جنابی علماء کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لینے کا موقع مل گیا اسی وقت سے اس مسلک کے بدنیت اور متعصب گروہ نے ان غیر محقق سعودی علماء کے ذریعہ مملکت کے دینی و دعوتی اداروں کے سربراہوں کو غلط فہمی اور دھوکہ دہی میں مبتلا کر کے امت کے سوادِ اعظم سے بدگمان بلکہ نفور کر دیا، پھر اس بدگمانی اور دوری کا استحصال کرتے ہوئے فقہی مسائل اور اجتہادی اختلافات کو حق و باطل، ہدایت و گمراہی اور توحید و شرک کے خانوں میں بانٹ دیا، نیز مملکت سے مالی اعانتوں اور میڈیا کی سہولتوں کو حاصل کر کے پورے عالم میں انتشار بین المسلمین کی مکر وہ و مذموم کوششوں میں مشغول و مصروف ہو گیا۔

ان کے اس غیر ذمہ دارانہ، جانبدارانہ اور متعصبانہ طرزِ عمل سے امت کو پورے عالم میں — بالخصوص موجودہ نازک ترین صورتحال میں — جو نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے ان سے اصحابِ علم و خبر بے خبر نہیں ہیں، ان نقصانات کی المناک تصویر کشی اس وقت ہمارے مدِ نظر نہیں ہے، تلاًنا صرف یہ ہے کہ کافی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہو جانے اور پورے کھیت کے چُک جانے کے بعد — ممکن ہے محقق علماء کی فکر مندی و توجہ دہانی کی وجہ سے — مملکتِ سعودی عرب کو اپنے ملک میں گزشتہ دو دہوں سے جاری یہ ظلم و نا انصافی نظر آئی، اور انہوں نے تلافیِ مافات — دینی یا سیاسی — کی خاطر مملکت کے صیغہٴ امور مذہبی کو چوکنا کیا، جس کے نتیجے میں اس مسلکی تشدد کو رفع کرنے کے لیے کچھ دانشمندانہ اقدامات کئے جانے کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سعودی اخبارات کی وہ سرخیاں بھی ہیں جو گزشتہ سال شعبان سے جاریہ سال صفر تک وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً:

(۱) ”سعودی عربیہ کی وزارتِ امور مذہبی نے اپنے ماتحت اداروں پر پابندی عائد کر دی ہے کہ وہ ایسی کتابوں کی اشاعت سے گریز کریں جن میں کسی اسلامی منہر قی یا جماعت یا تنظیم کی تردید شامل ہو“۔ (روزنامہ عکاظ)

(۲) ”سعودی فرمانروا خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ نے..... سعودی عرب کے سربراہ و ردہ علماء بورڈ میں حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی مکاتبِ فکر کو نمائندگی دے کر متاثرہ استحسان اقدام کیا ہے“۔ (اردونیوز)

(۳) ”سعودی علماء بورڈ میں مذاہبِ اربعہ کی نمائندگی تاریخی فیصلہ ہے، سنی مذاہب کی شراکت فقہی اجتہادات کو وسیع البنیاد اور مؤثر بنانے کی جہت میں کامیاب اقدام اور اسلامی شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے“۔ (عالم عرب)

(۴) ”سعودی علماء بورڈ میں حنفی عالم شیخ یعقوب کی اور مالکی عالم شیخ محمد الشنقیطی کی

تقرری“ (عالم عرب)

(۵) ”مسئلی تشدد ناجائز ہے، ائمہ مسالک راسخین فی العلم تھے۔“ (اریاض)

ان عنوانات کے تحت کچھ تفصیلات بھی ہیں، ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ان بیانات کا اصل مقصد مملکت کے تئیں پیدا ہونے والے مخالف رجحانات کو نرم کرنا ہے، نہ کہ مسلکی تعصب و ظلم کو ختم کرنا، اب ہو سکتا ہے کہ ان بیانات کے ذریعہ علماء نے تو اسی انکارِ مسالک و مذاہب کے بڑھتے ہوئے اثرات پر قابو پانا چاہا ہو مگر رپورٹرز نے اس میں اس طرح کی رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ مملکت کے دینی شعبوں اور کارندوں پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہو سکے۔ ذیل میں ایک بڑے عالم و صاحبِ افتاء بزرگ کے مطبوعہ بیان کو مکمل نقل کر کے اس کھٹک کی معقولیت واضح کی جا رہی ہے۔

”شیخ علامہ عبداللہ بن جبرین نے اپنے ایک محاضرے بہ عنوان ”دین اور زندگی“ کے دوران فرمایا کہ: ”لامذہبیت۔۔۔ غیر مقلدیت۔۔۔ یا مسلک سے دوری کی دعوت دینا درحقیقت ایک بدعت ہے، کیونکہ یہ چیز سابقہ زمانوں میں نہیں تھی اور یہ بھی کہ اس کے ان مسالک کے ائمہ امت کے قابل علماء ہیں یعنی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ایمان، علم اور تفقہ فی الدین میں (ہم لوگوں پر) سبقت حاصل تھی، تاہم وہ معصوم نہیں ہیں، اس لیے مخالف دلیل حکم دینے کی صورت میں (وہ خائن نہیں معذور ہیں اور) ان کا عذر دلیل تک ان کی رسائی کا نہ ہونا ہے۔ نیز فرمایا کہ ان علماء میں ہر ایک اس بات کا معترف تھا کہ اس نے تمام علوم کا احاطہ نہیں کیا، چنانچہ ان سے کبھی کبھی غلطی بھی واقع ہو جاتی ہے، اسی بناء پر ہم ائمہ کے پیروکاروں سے کہتے ہیں کہ جب تمہارے سامنے کوئی دلیل واضح ہو جائے تو تم پر ضروری ہے کہ تم اس کے قائل ہو جاؤ اور تم اپنے امام کا مذہب چھوڑ دو، اس وجہ سے کہ حق اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ جس کی وجہ سے اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اپنا صحیح نہیں ہے اور وہ لوگ امام ابوحنیفہ، امام

مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور لیث بن سعد رحمہم اللہ کے تبعین پر نکیر کرتے ہیں ہم ان سے کہتے ہیں کہ تم ان ائمہ کے تبعین پر نکیر مت کرو، کیونکہ یہ لوگ ان مذاہب کی جانب اجتہاد اور صحیح حدیثوں کے ثبوت کے بعد گئے ہیں، ہاں! تم ایسے شخص کو نصیحت ضرور کرو جو غلطی پر مصر ہے اور اپنے مذہب کو ہی اختیار کئے ہوئے ہیں، ہرگز یہ نہ ہو کہ تم ان کے ائمہ پر لعن طعن کرنے لگو، کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے فتاویٰ کئی مؤلفات میں جمع کیے گئے ہیں، جبکہ ان کو امام ابو یوسفؒ اور محمد بن الحسنؒ نے ترتیب دیا ہے، ان کا غالب اعتماد نظر و تحقیق پر ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ صاحب فکر و ذکاؤ اور سرلیج الفہم تھے، اور امام صاحب اہل کوفہ کی اس فقہ پر بھروسہ کرتے تھے جو ابن مسعودؓ کے شاگردوں اور اس زمانہ کے دیگر علماء سے منقول ہوتی، جب ان کے تبعین سے غلطی ہو تو ان کے امام پر تنقید کرنا جائز نہیں بلکہ ہر ایسے شخص کو نصیحت کریں کہ جس کے پاس دلیل ہو وہ دلیل پر عمل کرے، نہ مذہب کے ساتھ تعصب برتے اور نہ مذہب کی وجہ سے کسی دلیل کا انکار کرے۔ اور امام مالکؒ کے تبعین نے ان کی کتاب ”موطا“ پر اعتماد کیا جو کتب حدیث میں بہت معتبر سمجھی جاتی ہے اور فوائد کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے، یہ اور بات ہے کہ اس میں بہت سے علوم ذکر سے رہ گئے ہیں، اور اسی وجہ سے منصور عباسی نے ”موطا“ پر عمل کو لوگوں پر لازم کر دینے کی اجازت چاہی تو امام مالکؒ نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور وجہ یہ بیان کی کہ صحابہؓ میں بھی مسائل کا اختلاف تھا، حالانکہ ان کے پاس وہ علوم تھے جو ہم تک نہیں پہنچے، (اس لیے ان علمی اختلافات کو باقی رہنے دیا جائے، ایک کتاب کا پابند کر کے ختم نہ کیا جائے) پھر ان کے تلامذہ میں سے ایک عالم نے بہت سے سوالات کو جو ان کے مذہب سے متعلق تھے ایک بڑی کتاب میں جمع کر دیا جس کا نام ”مدونہ“ ہے، اس کتاب پر ان کے تبعین نے اعتماد کیا اور ہم ان سے بھی یہی کہتے ہیں کہ جب تمہارے سامنے کوئی ایسی دلیل آجائے جو تمہارے مذہب کے خلاف ہو تو اس کی اتباع کر لو۔ رہ گئے امام شافعیؒ تو انہوں نے احکام فقہ کو اپنی

کتاب ”الام“ اور اس کے علاوہ بہت سے رسائل میں تحریر کیا ہے، جو ان کے متبعین کی معتمد علیہ کتاب ہے، باوجود اس کے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا مذہب ”حدیث“ ہے، آپ فرماتے تھے کہ صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔ جہاں تک امام احمد بن حنبل کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے مسائل کو لکھنے سے منع فرمایا، خود بھی فقہ میں کوئی کتاب نہیں لکھی اور اس بات کو زیادہ پسند کیا کہ لوگ مسائل دین میں کتب حدیث سے مراجعت کریں، لیکن ان کے تلامذہ نے بہت سے ایسے مسائل کو جمع کیا ہے جو آپ کے سامنے پیش آئے اور آپ نے ان کا جواب دیا تھا، ان مسائل کا مجموعہ بیس جلدوں پر محیط ہے، ان کے مذہب کے متبعین انہی مسائل کا اتباع کرتے ہیں۔

اخیر میں شیخ ابن جبرین نے اپنی تقریر کو اس بات پر ختم کیا کہ مذاہب (فقہ) میں تشدد جائز نہیں ہے، کیونکہ ان مذاہب کے ائمہ راسخ فی العلم ہیں اور ان کو غلط قرار دینا صحیح نہیں ہے جب کہ ان پر تنقید و اعتراض کرنے والے ان ائمہ کرام کے مقابلہ میں ایک فیصد علم بھی نہیں رکھتے، اور فقہاء اپنے مذہب میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ عمل کی منتخب و مختار صورتیں جمع کر دیں، دلیل صریح نہ ہونے کی صورت میں دو یا تین امکانات بھی نقل کر دیتے ہیں، اس کی وجہ ان کے اجتہاد کی قوت اور نظر کی پختگی ہوتی ہے، اور ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے ثمرہ کا مستحق ہے۔ (۱۸ ربیع ال آخر ۱۴۲۹ھ - عکاظ)

اس مضمون میں — ان کے اخلاص و للہیت اور نیک نیتی پر کوئی شبہ کئے بغیر صرف طرز عمل اور بنے ہوئے ذہن کو سمجھنے کی خاطر — توجہ دلانا ہے کہ موصوف بار بار اس کا اعادہ کر رہے ہیں کہ ”ہم متبعین مسالک سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دلیل کا اتباع کریں“ اسی طرح وہ اصلاحی جدوجہد کرنے والے اداروں سے بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ ”متبعین مسالک کو دلیل کے اتباع کی تلقین کریں، مسلک و مذہب پر اصرار کرنے سے منع کریں“ سوال یہ ہے کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک متبعین مسلک علماء کو کیا یہ بات نہیں معلوم کہ دلائل کا

اتباع کرنا چاہیے اور مسلک کو اصل نہیں سمجھنا چاہیے؟ اور کیا ان کے علاوہ دوسرے مسالک کے علماء کرام نے بھی اپنے اپنے مسلکوں میں حق کو پانے اور اس پر قائم رہنے کے لیے جس کسی مسئلہ میں اپنے ائمہ کی تحقیق و استدلال میں ضعف کو پایا تو اس کو دلیل صحیح یا راجح کے مطابق کر کے اس پر فتویٰ نہیں دیا ہے؟ تحقیق اور دلیل کا کام تو صدیوں پہلے ہو چکا، اب صرف اتباع کا کام باقی ہے، آپ اپنی دلیل کے مطابق عمل کیجئے، دوسرا اپنی دلیل کے مطابق عمل کرے گا، سب کو آپ ہی تلقین کرنے اور تدین سکھانے والے کون؟ اگر آپ یہ بات اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آپ کے نزدیک آپ کے امام کی تحقیق ہی دلیل صحیح ہو سکتی ہے تو اسی اعتماد و ثوق کی بنیاد پر ہم بھی آپ کو یہی تلقین کریں گے کہ آپ بھی ہماری فہم کے مطابق دلیل کا اتباع کیجئے، اس صورت میں پھر بات تو وہی تشدد علیٰ المسلك — الثورۃ علی المذہبیۃ — ہی کی رہ جائے گی جس کو آپ بدعت اور ناجائز قرار دے چکے ہیں۔ شیخ موصوف کا کہنا ہے کہ ”تمہیں دلیل مل جائے تو تم اپنے امام کا مذہب چھوڑ دو“۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ایسا صدیوں پہلے کر چکے ہیں، تمام مسائل کے دلائل پر ان لوگوں نے جنہیں خود آپ راسخ فی العلم فرما رہے ہیں غور کر لیا ہے اور جہاں جہاں رجوع کی ضرورت تھی وہ رجوع کر چکے ہیں، اب صرف اجتہادی نتائج کا اختلاف ہی باقی ہے، جس پر تشدد نہ کرنے اور ہر ایک کو اس کے متبوع امام کی تحقیق پر عمل کرنے کا حق دلانے کے لیے آپ نے یہ مقالہ لکھا ہے تو اس اصرار کا حاصل اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ہم جس کو دلیل کہیں اسی کو دلیل مانو، اور اس وقت سارا فساد و خلاف اسی ناروا مطالبے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

ائمہ کرام کی جلالت علمی اور ان کے محیر العقول فقہی کارناموں کو سرائے کے انداز میں بھی اس جھول یا ذہول کو ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے امام اعظمؒ کی فقہ کی خصوصیت ”و غالب اعتمادہ علی الرأی والنظر“ کہہ کر ان کے دلائل کے سلسلہ میں نقلی کے بجائے محض عقلی ہونے کی طرف اشارہ کیا جو سراسر ظلم ہے۔ اگر چیکہ آگے کمزور انداز میں ابن مسعودؓ کی

مرویات پر ان کے اعتماد کا اشارہ دیا ہے۔ برخلاف اس کے جب امام احمدؒ کا ذکر کیا تو یہ کہا کہ انہوں نے کوئی فقہ مرتب نہیں کی بلکہ انہوں نے چاہا کہ عوام الناس کتاب و سنت ہی سے قریب اور ان ہی سے مستفید ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے تلامذہ نے بعد میں کسی وقت ان سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات کو باقاعدہ جمع کر دیا جب کہ وہ فقہی واجتہادی جوابات اتنے زیادہ ہو گئے کہ بیس مجلدات میں سما سکے۔ آپ غور کریں گے تو یہی صورت امام اعظمؒ کے ہاں بھی ہوئی کہ انہوں نے تو صرف کتاب و سنت سے استدلال کر کے مسائل کی تعیین کا کام کیا تھا اور پیش آمدہ و پیش آئندہ مسائل کا حل فرما دیا تھا، بعد میں ان کے تلامذہ نے ان مسائل کو ممدون کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انہوں نے کتابتِ فقہ سے خود اپنے کو بچایا اور دوسروں کو روکا اور یہ چاہا کہ لوگ براہِ راست کتاب و سنت سے مستفید ہو جائیں تو ان کے متبعین نے کیوں ان کی فقہ مرتب کی؟ اور کیوں سعودی دارالافتاء اس کے مطابق فتویٰ دیتا ہے؟ اور کیوں ہزاروں مسائل اور فتاویٰ میں قرآن و حدیث کے ساتھ قال علمائنا سے تقویت حاصل کی جاتی ہے؟ اگر یہ ان کے ہاں خلافِ دلیل اور خلافِ کتاب و سنت نہیں تو پھر احناف و شوافع کے لیے ہی یہ نصیحت و موعظت اور بار بار کی تاکید کیوں؟ کیا سعودی علماء کے اس انداز میں اسی عامیانہ الزام کی جھلک نظر نہیں آتی کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین شرعی دلیل کے بجائے اندھی تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں، صرف سلفیہ اور حنابلہ کتاب و سنت کے اتباع کا اہتمام کرتے ہیں؟

ان سب اشکالات و شکایات کے باوجود ہم مملکتِ سعودی عرب اور اس کے صیغہ امور مذہبی کی تعریف و تحسین کو ضروری سمجھتے ہیں کہ بہت دیر اور ناقابلِ تلافی نقصان کے بعد ہی سہی مسلکی تشدد کے ظلم کے خلاف انہوں نے آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس کی اور یہ تو بہت بڑا کارنامہ کر دیا کہ سعودی علماء بورڈ میں حنفی عالم کا بھی تقرر کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور مزید وسعتِ فکر اور ہمتِ اصلاحات سے سرفراز فرمائے آمین۔

ہمارے نزدیک ان اعلانات اور فیصلوں کا حقیقی و عملی نفع اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ

مملکت اور اس کے بااثر عہدہ دار عملی طور پر بھی جالیات کے سابقہ طرز عمل کو تبدیل کرنے کی طرف پیش قدمی کریں۔ بالخصوص

(۱) جالیات کے ذریعہ تقسیم ہونے والی کتب میں مذاہب معتبرہ کی رعایت کی جائے۔ مثلاً حج کے مسائل میں دسویں تاریخ کے اعمال میں فقہ حنفی میں ترتیب کے واجب ہونے کا اظہار اور احناف کو اس کے لحاظ کی تلقین کو شامل کیا جائے، وغیرہ۔

(۲) تبلیغ کے شعبوں میں سلفیہ اور حنابلہ کی طرح دیگر مسالک کو بھی نمائندگی دی جائے، اور بیرونی ملکوں میں بھی جانے والی اعانتوں میں مسلکی تفریق بند کی جائے۔

(۳) سعودی جامعات میں مذاہب اربعہ کو کام کرنے کے لیے یکساں مراعات دی جائیں۔

(۴) غیر قانونی طور پر مذہبی تشدد کرنے اور خارجی باشندگان کی کم علمی کا فائدہ اٹھا کر انہیں کسی مخصوص مسلک سے متنفر کرنے اور کسی مخصوص مسلک ہی کے برحق ہونے کا پرچار کرنے والوں کا مواخذہ کیا جائے اور اس کے لیے متاثرین کی شکایات سننے کا بسند دروازہ کھول دیا جائے۔

(۵) حرمین شریفین میں حنفی عالم کو بھی درس و تدریس کا موقع دیا جائے۔

(۶) تعلیق و تحقیق کے نام پر مملکت سے چھپنے والی تمام قدیم و جدید کتابوں پر شیخ البانی کی تصحیح و تضعیف کو مسلط کرنے کی بدعت کو ختم کر کے محدثین کرام کے اعتماد اور سابقہ طریقہ تحقیق کو بحال کیا جائے وغیرہ۔

اور اگر ان اعلانات کے بعد عملی اقدامات نہیں کئے گئے اور ایک مخصوص اور متعصب طبقے کے تسلط کو عملاً کمزور نہ کیا گیا تو یہ فیصلے اور اعلانات وہ نتائج نہیں دے سکتے جن کا ارادہ کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

وفق الله ولأه المسلمین وایانا لما یحبہ ویرضاه۔ وصلی اللہ علی النبی
الکریم
(اداریہ جون ۲۰۰۹ء)

عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے!

ملک میں بڑے پیمانے پر ”چٹ فنڈ“ کے ادارے قائم کر کے کاروباریوں اور سرمایہ داروں کو لوٹنے کا سلسلہ تو عرصہ سے قائم ہے، آئے دن ان کمپنیوں کے ”دیوالیہ“ ہو جانے کا اعلان کر کے ممبران کاروبار کو تباہ و برباد کیا جاتا رہتا ہے، لیکن چھوٹے موٹے انداز سے بستیوں اور بازاروں میں جو چٹھیاں چلائی جاتی ہیں ان کا سلسلہ بھی دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے، یہ چٹھیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ مثلاً دس آدمی مل کر ہر ماہ سو سو روپے کسی ساتھی کے پاس جمع کرنے کا عہد کر لیتے ہیں اور اتفاق رائے سے یا پھر قرضہ اندازی کے ذریعہ باری باری ایک ایک ہزار روپے لے لیتے ہیں، اس صورت میں ہر ایک کی رقم اس کو مکمل واپس ہو جاتی ہے، اس کا فائدہ بس یہ ہے کہ یکبارگی معتد بہ رقم مل جانے سے اپنے کاموں اور ضرورتوں میں سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ صورت امدادِ باہمی اور اخوتِ اسلامی کے حوالہ سے کارِ خیر ہی ہے، البتہ جن لوگوں نے پیشگی رقم اٹھالی ہے وہ دوسروں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر ہر ماہ رستم ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے اور پریشان کرنے سے بچیں، کیونکہ اس میں ظلم، دھوکہ اور وعدہ خلافی جیسے گناہوں کا وبال ہے۔

(۲) دوسری صورت جو عام طور سے مارکٹوں اور فینانسروں میں رائج ہے، وہ غالباً ”ہراج کی چٹھی“ کہلاتی ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ جس کو رقم کی فوری ضرورت ہے وہ اپنی چٹھی ہراج کرتا ہے، لوگ اس کی قیمت حق سے گھٹا کر لگاتے ہیں، وہ شخص اپنی مجبوری اور جلدی کی وجہ سے جتنی بھی رقم مل جائے لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور فینانسراں بچی ہوئی

رقم میں سے اپنا کمیشن نکال کر ماباقی رقم کو بقیہ ممبروں میں تقسیم کر دیتا ہے، اس طرح جو جتنی جلدی اپنی چٹھی اٹھاتا ہے اتنا ہی زیادہ اپنے مال سے محروم ہوتا ہے اور جو جس قدر دیر سے لیتا ہے اتنا ہی دوسرے کے مال سے ناحق اضافہ لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دوسری صورت سراسر سود، قمار اور حرام ہونے کے علاوہ انسانیت سوزی اور ظلم و زیادتی پر مبنی ہے، انسانیت ایک دوسرے کی مدد کرنے اور وقت پر کام آنے کا نام ہے، خود غرضی اور حق تلفی انسانیت نہیں حیوانیت اور جانور پن ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اسلامی سرمایہ کاری انسانیت نوازی کی بہترین مثال ہے، کسی کے مال کو نقصان پہنچائے بغیر ایک دوسرے کو نفع پہنچانے اور ضرورت پر کام آنے میں مدد دینا بڑے اجر و ثواب کی بات ہے، جو چٹھی کی پہلی صورت میں واضح ہے، اور اسلام کے تجارتی و مالیاتی احکام اس حقیقت کا ثبوت ہیں۔ اسلام کے برخلاف یہودی ساہوکاری کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ خود غرضی و حق تلفی پر مبنی ہوتی ہے، اس کی بنیاد ہر ایک کو محروم کر کے اپنی جھولی بھرنے پر قائم ہوتی ہے، اسی کی بدترین مثال چٹھی کے مرؤجہ کاروبار اور ہمارے علاقوں میں رائج رہن سنٹرز اور ان میں ہونے والے مالی معاملات ہیں، جو سو فیصد سودی اور جوازی معاملات ہیں اور آج کل بہت زوروں پر ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ آج کل متوسط سے نیچے طبقے کے مسلمان گلی گلی قائم رہن سنٹرز میں جا کر اپنا زیور، ساز و سامان، بہو کا جہیز وغیرہ تو چند سو روپیہ قرض کے عوض رہن رکھا ہی رہے ہیں، قرض ادا کر کے انہیں چھڑانے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی گروی ہوتے جا رہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ غریب مسلمانوں کی اکثریت کا مال اور ان کی آمدنیاں اپنی دوکانوں سے بھی بڑا منہ کھول کر بیٹھے ہوئے ظالم مارواڑیوں کے پیسے میں روزانہ لاکھوں کے حساب سے جا رہی ہیں۔

ادھر بیوپاریوں اور کاروباریوں کا حال یہ ہے کہ وہ موجودہ کاروبار اور اس کی بقدر

ضرورت آمدنی پر قناعت نہ کر کے تانا شاہی منصوبوں کی خاطر سودی قرض یا قمار کی چٹ کے دھندوں میں پھنس کر اپنی تھوڑی سی کمائی سے بجائے اپنے بال بچوں کا پیسہ پالنے کے فینانسروں کی دوزخ بھر رہے ہیں۔ پھر اگر سود در سود کی ادائیگی سے عاجز ہو جا رہے ہیں تو چٹھی چلانے اور قرضے دینے والے خونخوار درندوں کے ظلم و بربریت کا شکار ہو رہے ہیں، ان کے مار کھا رہے ہیں، گالی گلوچ سن رہے ہیں، ذلیل ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ ان کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنی بہو بیٹیوں کا منہ کالا کرنے کا انہیں موقعہ دے رہے ہیں، یا خودکشی کر کے دنیا و آخرت برباد کر رہے ہیں۔

کسی بھی قوم کی اگر یہ صورتحال ہوتی تو ہو سکتی تھی، کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسا دین نہیں ہے جو ان کی مدد کر سکے اور حرص و حماقت کے اندھیروں سے نکال کر خودداری اور قناعت کی روشنی میں پہنچا سکے، غلامی کی ذلت سے نکال کر آزادی کی عزت دلا سکے، انہیں بتلا سکے کہ آبرو بیچ کر عیش و عشرت کرنے سے بہتر عزت نفس کے ساتھ فقر و فاقہ کر لینا ہے۔ مگر مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ اسلام کا مبارک سایہ سروں پر ہونے اور نبی پاک کی ہمت افزا اور عزت رسا تعلیمات سینے میں رکھنے کے باوجود ان گندگیوں بلکہ حماقتوں میں مبتلا ہو کر دنیا و آخرت برباد کر رہے ہیں؟ ان حرکات و واقعات کا سبب صرف غربت ہی نہیں ہے کیونکہ پچھلے زمانوں میں بھی محتاج لوگ سماج میں پائے جاتے تھے، غریبوں اور ضرورت مندوں کا طبقہ معاشرہ میں شامل رہتا تھا، مگر اس قسم کی حرکتوں سے محفوظ اور عفت و استغناء سے موصوف ہوتا تھا، اس کی اصل وجہ دین اور دینی تعلیمات سے واقفیت اور والدین کی جانب سے اولاد کی اسلامی تربیت تھی، آج جہالت عام ہے، کہنے کو تو اس کو روشنی کا دور کہا جاتا ہے، کیونکہ تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، مگر حقیقت میں دیکھ سبب ہے تو یہ اندھیرے کا زمانہ ہے، کیونکہ مذہب کو مٹانے اور اپنے راستہ سے ہٹانے کی جدوجہد بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُّورٍ ﴿۵﴾

”اللہ تعالیٰ نے جس کو روشنی عطا نہیں فرمائی تو اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہو سکتی“۔ (سورۃ النور) پھر محض چار نکلے کمانے کے لائق بنانے والی یہ عصری تعلیم اخلاق و کردار کی ضمانت کیسے دے سکتی ہے؟ آج اخبارات میں جرائم و حادثات کے عنوان سے جتنے واقعات چھپ رہے ہیں — اور ان سے کئی گنا زائد حادثات ظالموں کے اثر و رسوخ میں چھپ رہے ہیں — کیا ان کے مرتکبین سب جاہل ہیں؟ ہرگز نہیں، غریبوں اور جاہلوں کے علاوہ اچھے اچھے خاندانوں اور بڑی بڑی ڈگریوں والے بھی ان حادثات میں شامل ہیں! معلوم یہ ہوا کہ اصل سبب مسلمانوں کا دینی علم اور اسلامی اخلاق سے محروم ہو جانا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اسلام نے اسنادِ جرائم کے لیے صرف قانون سازی کو کافی نہیں سمجھا، اس کے ساتھ بندوں کے قلوب میں خوفِ خدا اور جوابدہی کا احساس پیدا کرنے کو بھی ضروری سمجھا ہے۔“

پچھلے دنوں حیدرآباد کے اخبارات نے قرض خواہوں کے مظالم میں ہلاک ہونے والی عورتوں کی تصاویر اور واقعات شائع کئے، بیشک یہ واقعی دل دہلا دینے اور رو گٹنے کھڑے کر دینے والے واقعات تھے، ان کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اس کے اسباب و وجوہ بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ماں کے ہوتے ہوئے بھی جوان کنواری لڑکی قرض خواہ کے گھر کیوں گئی؟ اس کے پھسلانے سے اس کے ساتھ تفریح کرنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئی؟ ماں کو اس کی عزت متاثر ہونے کا کھٹکا کیوں نہیں ہوا؟ اس کا خاندان اور اس کے بڑے کہاں ہیں؟ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب مزید جرائم اور فواحش سے پردہ اٹھاتے ہیں، بات دراصل یہی ہے کہ مسئلہ صرف غربت و فلاکت کا نہیں، اسلام سے دوری اور دینی تعلیم سے جہالت کا ہے۔ بیشک ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں ان کی معاشی تنگی اور سخت مجبوری سا ہو کار کی چوکھٹ تک لے گئی ہوگی جو سماج کے اہل حیثیت افراد کے لئے واقعی ڈوب مرنے کی بات ہے، لیکن تجربہ یہی ہے کہ غریب و ناخواندہ

طبقہ کی اکثریت رہن سنٹرز اور لون سنٹرز پر ضرورت کی وجہ سے کم، خواہشات و لوازمات کی وجہ سے زیادہ وابستہ ہے، ایک عادت اور لت سی پڑ گئی ہے کہ ذرا کوئی بات پیش آئی اس طبقے کی عورتیں خود بھی قرض لے آتی ہیں اور دوسروں کو بھی دلاتی پھرتی ہیں، ان عورتوں سے نمازیں پڑھی جاتی ہیں نہ روزے رکھے جاتے ہیں، ہم محلہ عورتوں کی اسی لیڈر شپ میں صبح و شام کرتی پھرتی ہیں۔

اس لیے ان مصیبتوں کے خاتمے اور ان حادثات کی روک تھام کے لیے سب سے مؤثر اور اہم تدبیر سماج کے ہر طبقے بالخصوص بچھڑے ہوئے اور متوسط حیثیت سے بھی گرے ہوئے طبقہ میں دینی تعلیم اور اسلامی دعوت کی صورتیں نکالنا ہے، اگر فواحش و منکرات اور بدکاری و حرام خوری کی وعیدیں کتاب و سنت کی روشنی میں ان تک پہنچائی جائیں گی اور ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کو بجالانے کی جدوجہد کی جائے گی تو انشاء اللہ فائدہ ہوگا اور ضرور ہوگا، انسانوں کے خالق و مالک کا ارشاد ہے: **وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ** ﴿۵۵﴾ ”نصیحت کیجئے، کیونکہ نصیحت کرنا اہل ایمان کو نفع دیتا ہے۔“ (سورۃ الذاریات)

اب جہاں تک ان کی محتاجی و مفلسی کا معاملہ ہے تو یقیناً ہر باشعور مسلمان کو غریب امت کے ان مسائل کی طرف توجہ دینا چاہئے، اللہ پاک نے کسی مصلحت سے بندوں کے درمیان رزق کی تقسیم میں کمی بیشی کو مناسب سمجھا: **اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ** ﴿۲۶﴾ ”اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے روزی بڑھاتا ہے جس کیلئے چاہتا ہے گھٹاتا ہے۔“ (سورۃ الرعد: ۲۶) اور غور کرنے سے اس تفریق میں انسانوں ہی کی ہزار ہا حکمتیں اور مصلحتیں سمجھ میں بھی آتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ سماج میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی انتظام فرمادیا ہے کہ جن کی روزی بڑھائی ہے ان کی روزیوں میں کم نصیبوں کا حصہ ”حق“ کے نام سے رکھ دیا ہے: **وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ** ﴿۱۹﴾ ”اور مالداروں کے مال میں اس

کا بھی حق ہے جو ضرورت سے مجبور ہو کر سوال کرتا ہے اور اس کا بھی حق ہے جو ضرورت کو چھپا کر صبر کرتا ہے۔“ (سورۃ الذاریات)

اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہوا کہ انسان کے اندر مخفی انسانی صفات و خصوصیات سرگرم عمل ہو کر منصہ شہود پر آئیں، صحابہ کرامؓ کا سماج جس کی روشن مثال ہے۔

حضرت حسن ؓ کے احوال میں آتا ہے کہ ان کے پڑوسی نے اپنے قرض کے بوجھ اور قرض خواہ کی سختی کا ذکر کر کے ان سے مدد کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے اسی وقت ان کے گھر میں جو کچھ میسر تھا، عطا کر کے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا، پھر جب گھر میں واپس آئے تو روتے ہوئے آئے، اہلیہ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں کہ گھر کا سب کچھ اٹھا کے دے آیا بلکہ اس لیے رونا آ رہا ہے کہ ”اپنے ایک پڑوسی کی حاجت سے میں اس کے اظہار سے قبل ہی کیوں نہ واقف ہو سکا، اسے میرے سامنے سوال کر کے ذلیل ہونے کی نوبت کیوں آئی، اگر اللہ پاک مجھ سے اس کی بابت سوال کریں تو میں کیا جواب دے سکوں گا؟ یہ سوچ کر مجھے رونا آ رہا ہے۔“

ایک مرتبہ نبی کریم ؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، صبح کا وقت تھا، قبیلہ بنو مضر کے کچھ لوگ ملاقات کے لئے اس حال میں حاضر ہوئے کہ گلے میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں، پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور چہرہ بشرہ سے فقر و فاقہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، انہیں دیکھتے ہی غایت شفقت و رحم سے آپ کا دل بھر آیا اور چہرہ مبارک متاثر و متغیر ہو گیا، آپ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور گھر میں۔۔۔ کچھ لانے کے لیے یا وضو بنانے کے لیے۔۔۔ تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد باہر آئے تو موزن کو اذان دینے کا حکم فرمایا۔۔۔ غالباً ظہر یا جمعہ کی۔۔۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا، اس میں سورۃ نساء کی آیت یا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ الْآیۃ۔ (سورۃ النساء: ۱) سورۃ حشر کی آیت یا اَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّامَتْ لِغَدٍ ۖ الْآيَةُ (سورة الحشر: ۱۸) کی تلاوت فرما کر ایک دوسرے کی قرابت داری کا خیال رکھنے، صلہ رحمی کی اہمیت کو سمجھنے اور انفاق و خیرات کے ذریعہ آخرت میں ذخیرہ اندوزی کرنے کی ترغیب دی، اور حکم دیا کہ ان لوگوں کے لئے ہر شخص کچھ نہ کچھ اکٹھا کرے، دینار، درہم، کپڑے، اناج جو ہو سکے لاؤ، حتیٰ کہ کچھ نہ ہو سکے تو کھجور کی ایک پھانک ہی سہی مگر کوئی محروم نہ رہے، لوگ گھر گئے اور جس سے جو بن پڑا لا کر جمع کرتے رہے، ایک شخص نے تو دیناروں سے بھری اتنی بڑی تھیلی لائی کہ اس سے سنبھل بھی نہیں پار ہی تھی، دیکھتے دیکھتے مسجد نبوی کے صحن میں غلے اور کپڑے کے دو ڈھیر اکٹھے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے جب ان بد حال و فاقہ کش مسلمانوں کی مدد کے لیے کی گئی اپیل پر مسلمانوں کی اس بھائی چارگی اور اثر پذیری کا نقشہ دیکھا تو انتہائی مسرور ہوئے اور خوشی سے چہرہ مبارک اس طرح دکنے لگا جیسے پگھلا ہوا سونا چمکتا ہے، پھر آپ نے یہ مال ان لوگوں کے حوالہ فرمایا، اور مسلمانوں کو شاباشی دیتے ہوئے اور ہمت افزائی کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی کہ

من سن فی الاسلام سنة حسنة	جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کی ابتداء کی
فله اجرها واجر من عمل بها من	تو اس کو اس کے اجر کے علاوہ آگے اس پر
بعده من غير ان ينقص من	عمل کرنے والوں کے اجر سے بھی حصہ ملے
اجورهم شيء ومن سن في	گا، اگرچہ ان کے ثوابوں میں بھی کوئی کمی نہیں
الاسلام سنة سيئة كان عليه	کی جائے گی۔ اور جس نے اسلام میں کسی
وزرها ووزر من عمل بها من	برے کام کو رواج دیا تو وہ اپنی سزا کے علاوہ
بعده من غير ان ينقص من	آگے اُس پر عمل کرنے والوں کی سزا میں بھی
اوزارهم شيء۔	برابر کا شریک رہیگا، اگرچہ ان کی سزاؤں
(مسلم: ۲/۵۵۷)	میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

یہ اور اس قسم کی بیشمار احادیث اور معتبر واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں نماز روزہ جیسی عبادتوں کی ترغیب اور فضیلت بیان کی ہے، وہیں غرباء پروری و اقرباء نوازی کی بھی تعلیم دی ہے، قولاً بھی عملاً بھی، یہ تو انسانیت ہے اور انسانیت نبی سے بڑھ کر کس کے اندر کامل ہو سکتی ہے؟ اس کے برخلاف آج ہمارے اندر اعزہ و اقرباء نیز غرباء کے دکھ درد کا احساس ہی نہیں رہا، ان کے عبادت ہونے کا اعتقاد تک ختم ہوتا جا رہا ہے، بڑی بڑی تسبیحیں پڑھنے، لمبے لمبے ذکر کرنے اور زہد و تقویٰ کی باتیں کرنے والے بھی صلہ رحمی، اور اقرباء نوازی کے فریضے سے غافل ہیں، چہ جائیکہ عنبر بقاء پروری کا خیال رکھیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایک جگہ ایمان کے بعد پہلے اسی عمل کا ذکر کر کے پھر نماز روزہ کا ذکر فرمایا:

نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور سب پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، اور گردن چھڑانے میں بھی خرچ کرے، اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، اور جو اپنے عہد کو نباہے اور جو تنگدستی، بیماری اور قتال کے وقت صبر سے کام لے، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُّوا وُجُوهَكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ
وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى
وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ
السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى
الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا
عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُونَ ﴿٥٠﴾ (سورة البقرہ)

قطب عالم حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا گڑھی رحمہ اللہ کا یہ شعر پیغام بن کر ہر مسلمان کے دل میں اتر جانے کا قابل ہے ۔

رحمت کا ابر بن کر سارے جہاں پہ چھائیے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے
اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں دین کے تمام شعبوں کو زندہ رکھنے میں جدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی غفلت سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین
(اداریہ جولائی ۲۰۰۹ء)

اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے

قوموں پر جب بُرے دن آتے ہیں تو وہ سب سے پہلے عقل و خرد کی نعمت سے محروم کر دی جاتی ہیں، پھر بھلی چیزیں اُنہیں بُری لگنے لگتی ہیں اور بُری چیزیں بھلی! یہاں تک کہ ان کی عقلی در ماندگی اور فکری افلاس کے سامنے انسانیت و شرافت سرپیٹ کے رہ جاتی ہے، جانوروں کو تک ان کی اخلاقی گراوٹ پر حیا آنے لگتی ہے، اور وہ اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ کے مصداق ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک پر انگریزوں کے دو سو سالہ اقتدار کے دوران تھوپے گئے یورپین کلچر کے نتیجے میں ہماری اخلاقی قدریں اور تہذیبی علامتیں تو بہت پہلے ہی مٹ گئی تھیں، ان کے نظامِ تعلیم کی نحوست سے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد کی عقلیں بھی ماری جا رہی ہیں۔ اربابِ حکومت کا کام ملک کی زمینی سرحدوں کے تحفظ کے ساتھ آئینی و تہذیبی متدروں کی حفاظت بھی ہے، مگر بد قسمتی سے اب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہے جن کے افکار مغربی تہذیب کے دلدادہ اور دماغ امریکن کلچر سے شکست خوردہ ہیں، اُنہیں ملکی تہذیب و تمدن کو زندہ کرنے سے زیادہ بیرونی طور طریقوں کو در آمد کرنے کی فکر رہتی ہے، مغربی اقوام کی کاسہ لیبی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے، یہ لوگ گن تو حب الوطنی اور قوم پرستی کے گاتے ہیں مگر کام ملک دشمنی اور قوم فروشی کے کرتے ہیں۔

کچھ زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے وزیرِ تعلیم نے ایڈز جیسی مہلک

بیماریوں پر قابو پانے کے لیے بچوں کے نصابِ تعلیم میں جنسیات کو شامل کرنے کی نامعقول سفارش کی تھی، اور اب دہلی ہائی کورٹ کے فاضل جج نے باشندگانِ ملک کے بنیادی حقوق کو بحال کرنے کے لئے ہم جنس پرستی کے گھناؤنے جرم اور گندی حرکت کو قانونی موقف دئے جانے کی بات کہی ہے۔ اگرچہ اس کے ردِ عمل میں ملک کی تمام اقوام اور مذاہب کے پیشواؤں نے ناپسندیدگی اور خفگی کا اظہار کیا ہے مگر حکومت کے ذمہ داروں نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے رعایا کی تشویش اور اندیشے دور ہو سکیں، وزیرِ قانون نے بس اس قدر اطمینان دلایا ہے کہ اس مسئلہ میں جلد بازی اور عجلت نہیں برتی جائے گی، ظاہر ہے کہ اس کو طفل تسلی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے امریکہ نواز اور مغرب مآب مسائل کو قصداً اٹھایا جاتا ہے، اور کچھ وقفہ کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے، دوسرے معنی میں یوں سمجھئے کہ ان مسائل کا شوشہ چھوڑ کر عوامی ردِ عمل کی قوت کا اندازہ کیا جاتا ہے، پھر اسے یا تو نافذ کر دیا جاتا ہے یا پھر مناسب وقت تک کیلئے موقوف کر دیا جاتا ہے۔

یوں بھی اب حکومتوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ عوام کسی بھی معاملہ کی زیادہ دیر تک مخالفت نہیں کر پاتے، دھیرے دھیرے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اس لیے ایسے مسائل میں یہی ہو رہا ہے کہ عوام زیادہ ناراض ہوتی ہے تو ان مسائل کو چند دن کے لیے برفدان میں ڈال دیا جاتا ہے اور اگر ان کی ناراضگی کم ہوتی ہے یا کچھ جوش دکھانے کے ختم ہو جاتی ہے تو حکم دانوں کی بلی تھیلے کے باہر آتی اور سر چڑھ کر بولتی بلکہ سینے پر لوٹتی ہے، اس وقت قوم کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم!

اب اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اس ملک اور اس کی تہذیبی قدروں کی حفاظت فرمائے، اور کشتیِ ملک کے ناخداؤں کو اتنی فہم و بصیرت عطا فرمائے کہ بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر، ملک و قوم اور اس کی تہذیبی شناخت کو گروی رکھ دینے کی حماقت سے محفوظ رہیں۔

اللَّهُمَّ لَا تَسْلِطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَخَافُكَ وَلَا يَرْحَمُنَا۔ آمین

جہاں تک ہم جنس پرستی کی شرعی حیثیت اور مذہبی نوعیت کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں مستقل کچھ لکھنے کے بجائے حال ہی میں مرتب شدہ اس عاجز کے مجموعہ مضامین ”شادی کا اسلامی تصور اور ہمارا طرز عمل“ سے چند سطور نقل کر دینے کو کافی سمجھتا ہوں۔

ہم جنس پرستی ایک غیر انسانی حرکت ہے:

سفاح یعنی زنا ہی کی ایک اور قسم لواطت ہے، بلکہ یہ اس سے بھی گئی گزری اور انتہائی غیر فطری حرکت ہے کہ آدمی صنف مخالف کے بجائے اپنی ہی جنس کے ساتھ شہوت رانی و بدکاری کرے۔ العیاذ باللہ۔ یہ حرکت گزشتہ اقوام میں بھی کسی قوم میں نہیں تھی، صرف ایک قوم۔۔۔ یعنی اہل سدوم جن کی طرف حضرت لوط علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے تھے۔۔۔ میں پائی جاتی تھی، یہ قوم اس بری حرکت میں مبتلا تھی، ان کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے اس بری عادت کو چھڑانے کی بہت مخلصانہ کوشش کی تھی، مگر انہیں اس کی ایسی پختہ عادت پڑ گئی اور ایسی لت لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح اس حرکت کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا ایسا سخت عذاب نازل فرمایا کہ فرشتے نے ان کی بستی کو آسمان پر اٹھا کر پہلے انہیں گرایا پھر بستی کو ان پر الٹ دیا، اور ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش کی گئی، سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے فرمانبرداروں کے اور کوئی شخص اس عذاب الہی سے بچ نہ سکا۔ اس خبیث مرض کی خطرناکی اور ملعونیت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس سے بچنے کی تاکید کی اور اس کے بُرے نتائج سے ڈرایا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اس حرکت کے فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد: ۴/۱۵۸) اگرچہ کہ آپ کے دور میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، محض ذکر آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سخت حکم ارشاد فرمایا جس سے اس کی شناخت اور واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ہی دوسری روایت میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے قوم لوط کی حرکت کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (نسائی: ۴/۳۳۲) لعنت رحمت خداوندی سے دوری کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے کس قدر سخت وعید ہے!

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت سے سب سے زیادہ جس چیز کا خوف کرتا ہوں وہ قوم لوط کا عمل (یعنی لواطت) ہے کہ کہیں وہ اس میں مبتلا نہ ہو جائے۔ (ترمذی: ۱۴۵۷)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی حرکت کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ اس کی صبح و شام اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی میں ہوتی ہے۔

(شعب الایمان: ۲/۷۵۶)

امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ یہ گندی حرکت جانوروں میں بھی سوائے گدھوں اور خنزیروں کے کسی اور جانور میں نہیں پائی جاتی، یعنی جانور تک اس سے نفرت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ ایسی حرکت کرنے والوں کو قتل کر دینے یا اونچے مکان سے گرا کر اوپر سے سنگ باری کرنے کا حکم دیتے تھے، حماد بن ابراہیمؒ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو دو بار سنگسار کیا جاسکتا تھا تو یہ خبیث اس قابل تھے کہ انھیں دو بار سنگسار کر دیا جائے۔ حضرت محبؒ فرماتے ہیں کہ لواطت کرنے والا آسمان وزمین کے تمام پانیوں سے غسل کر لے تو بھی پاک نہ ہوگا، نجس کا نجس ہی رہے گا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: لواطت کرنے والا اگر بغیر توبہ کے مرجائے تو قبر میں خنزیر بنا دیا جائے گا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: جو مرد یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ بد فعلی کی یہ حرکت کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر نسوانی شہوت پیدا کر کے اس کو شیطانِ مردود بنا دیتا ہے۔ (شعب الایمان/ الزواجر وغیرہ)

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے انہیں اطلاع دی کہ بعض دیہاتوں میں ایسے شخصوں کی اطلاع ملی ہے جو مردوں کو اپنے ساتھ اُن حُرکتوں کا

موقعہ دیتے ہیں جو عورتوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ ایسے لوگوں کو کیا سزا دینی چاہئے، حضرت علیؓ نے فرمایا: آپ لوگ — جانتے ہیں کہ یہ وہ گندی اور خبیث حرکت ہے کہ پچھلی امتوں میں بھی سوائے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے کسی اور قوم میں بھی نہیں ملتی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی آپ لوگوں کو معلوم ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو آگ میں ڈال دیا جائے، حضرت علیؓ کی اس رائے سے تمام صحابہ کرامؓ نے اتفاق فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ نے اسی کا فیصلہ فرمادیا۔ (شعب الایمان: ۷۵۶/۲)

مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ کسی راستہ سے گذرتے ہوئے ایک شخص کو آگ میں جلتا ہوا دیکھا، آپ نے ازراہ شفقت پانی منگا کر اس کو بجھانے کی کوشش کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگ ایک لڑکا بن گئی اور آدمی آگ بن کر اس لڑکے کو جلانے لگا، بہت حیران ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان لوگوں کو زندگی دی جائے تاکہ حقیقت حال معلوم کر سکیں، اللہ پاک نے انہیں زندہ کر دیا تو اس شخص نے بتلایا کہ میں زندگی میں اس لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ بد فعلی کیا کرتا تھا، جب میں مر گیا اور یہ بھی اپنے وقت پر مر گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ کبھی میں آگ بن کر اس کو جلاتا رہوں اور کبھی یہ آگ بن کر مجھ کو جلاتا رہے۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ (الزواجر: ۷۸۹/۱)

مذکورہ بالا اخبار و آثار مسئلہ کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے کہ اسلام کی تعلیمات اس سلسلہ میں بہت سخت ہیں، خود انسانی مزاج بھی — اگر وہ مسخ نہ ہو گیا ہو — اس سے متنفر ہے، اس لئے یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ کس طرح اس خبیث حرکت کو جسے نہ کوئی مذہب قبول کرتا ہے اور نہ فطرتِ سلیمہ تسلیم کرتی ہے، انسانی حق قرار دے کر جواز مفسراہم کرنے کی سفارش کی جا رہی ہے؟

(اداریہ اگست ۲۰۰۹ء)

چوں کفر از کعبہ بر خیزد

اسلام چونکہ ایک ابدی اور آفاقی مذہب ہے اس لئے اس کے احکام میں بھی ابدیت و آفاقیت ملحوظ ہے، یعنی اس میں ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں کے لئے قابل قبول اور لائق عمل ہونے کی شان پائی جاتی ہے، رد و بدل، حک و فک کی ضرورت اُن دستوروں میں ہوتی ہے جو انسانی تجربات اور ناقص علم کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، اس کے برخلاف جو دستور حق تعالیٰ کی حکمت بسیط اور علم محیط سے نکلتا ہے وہ تجربہ اور تبدیل کے نقص سے پاک ہوتا ہے، اسلامی احکام جب۔۔۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ کے نازل و نافذ کردہ ہیں اور حضرت محمد ﷺ۔۔۔ جن کے ذریعہ یہ احکام بھیجے گئے۔۔۔ آخری اور بالکل آخری نبی ہیں، آپ کے بعد اب قیامت تک کوئی آسمانی ہدایت ہم بندوں کے لیے آنے والی نہیں ہے، (نہ کلی نہ جزوی، نہ ظلی نہ بروزی) تو آپ کے پردہ فرمانے کے وقت ”دین اسلام“ جس شکل و ہیئت میں قائم تھا اس پر تکمیل و اتمام کی مہر لگا دی گئی، اور اس کے جو احکام جس طرح نافذ تھے وہ اسی طرح قیامت تک کے لیے استقرار پا گئے۔ امت کا کام اب ان احکام کی حفاظت، تعمیل اور تبلیغ ہے۔ علماء اسلام انہی احکام کی تشریح و تفہیم کے ذمہ دار ہیں تو حکام مسلمین انہی احکام کی تنفیذ اور اس کے مطابق امت مسلمہ کی تنظیم کیلئے جوابدہ ہیں۔

جہاں تک احکام اسلامی میں ”اجتہاد“ کی بات ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام

میں اجتہاد کی اُس وقت تک گنجائش ہے جس وقت تک زمانہ تغیر پذیر ہے اور اس کو اجتہاد کی ضرورت ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مجتہد اس کی اہلیت رکھتا ہو اور اجتہاد اپنے دائرہ حدود میں ہو، یہ نہیں کہ اسلامی مزاج کی شناخت و معرفت اور اس کے احکام سے تفصیلی واقفیت کے بغیر کوئی شخص مجتہد بن بیٹھے اور بنیادی احکام کو کھودنے اور اسلام کے ڈھانچے ہی کو ڈھانے لگے، جیسا کہ آج کل کے بنا کسی استاذ کے تعلیم یافتہ نام نہاد مجتہدین محض شخص مطالعہ کے ذریعہ چند سطحی معلومات کو لے کر بنیادی احکام اور اصول و قواعد سے بے خبر ہونے کے باوجود اجتہاد کے نام پر بنیادی احکام اور تعلیمات اسلامیہ کی مٹی پلید کر رہے ہیں، بلکہ فی الحقیقت دشمنان اسلام کی جانب سے لائے جانے والے مصنوعی اسلام کے دست و بازو بن کر ملت اسلامیہ کو اسلام حقیقی سے دور بلکہ نفور کر رہے ہیں۔

مجتہد میں اجتہاد کی اہلیت اور مجتہد فیہ مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش کا ہونا یہ دونوں ایسی لازمی شرائط ہیں کہ اگر ان میں تساہل اور مدافعت برتی جاتی ہے تو دین اسلام کا حلیہ بگڑ کر ایک متوازی دین وجود میں آ جاتا ہے اور اگر ان شرائط کی پختگی و دیانت کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے تو اس اجتہاد کے ذریعہ دین اسلام کی ہمہ گیری اور اس کی آفاقیت و ابدیت کا وصف نمایاں ہوتا ہے، نیز اس کی وسعت و رحمت سے اہل زمانہ کو نفع پہنچتا ہے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی احکام دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن میں رد و بدل اور کمی زیادتی کا کسی کو کوئی حق نہیں، وہ اٹل ہیں اور گویا دین اسلام کا ڈھانچہ اور اس کی بنیاد ہیں، دوسرے وہ احکام و مسائل جن میں لچک اور حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اول الذکر میں کسی قسم کی کوئی مداخلت کرنے کا بندوں کو حق حاصل نہیں ہے، وہ بعینہ قائم ہیں اور قائم رہیں گے، ان میں تبدیلی دین ہی کی تحریف ہے، ان میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ
الْكَذِبَ هَذَا حَلَلٌ وَهَذَا حَرَامٌ
لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ
الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۶﴾ (سورۃ النحل)

جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا
جھوٹا زبانی دعویٰ ہے اُن کے بارے میں
یوں مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ
حرام ہے (جس کا حاصل یہ ہوگا) کہ تم
اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دو گے، بلاشبہ جو
لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں وہ
فلاح نہ پائیں گے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے امت کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

مَنْ كَذَبَ عَلَىَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا
مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔
(مقدمہ مسلم موسوعی ص: ۶۷۴) بنالے۔

جس نے جان بوجھ کر میری طرف عنط
بات منسوب کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو

احکام کی دوسری قسم سے متعلق واضح رہنمائی اس روایت میں ہے جس میں نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک محبوب اور چہیتے صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے
ہوئے پوچھا تھا:

كَيْفَ تَقْضِي؟ فَقَالَ أَقْضِي بِمَا فِي
كِتَابِ اللَّهِ قَالَ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي
كِتَابِ اللَّهِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَإِنْ لَمْ
يَكُنْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ قَالَ
أَجْتَهِدُ رَأْيِي قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي
وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللَّهِ۔

تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ انہوں نے کہا
کتاب اللہ سے، آپ ﷺ نے پوچھا اگر
وہ صورت کتاب اللہ میں نہ ہو تو؟ انہوں
نے عرض کیا ایسی صورت میں اللہ کے
رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ
ﷺ نے پوچھا اگر وہ سنت رسول اللہ میں
بھی نہ ہو تو؟ انہوں نے عرض کیا: ایسی

(ترمذی: باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی) صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں

گا، آپ ﷺ نے فرمایا تمام تعریفیں

اُس اللہ کیلئے ہیں جس نے اپنے رسول

کے قاصد کو (صحیح بات کی) رہنمائی کی۔

معلوم ہوا کہ دین اسلام کے احکام کچھ تو بنیادی ہیں اور کچھ فروعی، پہلے میں رد و بدل کی کوئی گنجائش نہیں، دوسرے میں بوقت ضرورت اجتہاد و قیاس سے مدد لینے کی گنجائش موجود ہے۔

اجنبی عورتوں اور مردوں میں اختلاط سے اجتناب اور حجاب کا بنیادی مسئلہ احکام کی پہلی نوعیت سے تعلق رکھتا ہے، اس سلسلہ کے قرآنی احکامات، نبوی ہدایات اور صحابہ کرامؓ جو کتاب و سنت کے اولین جاننے اور عمل کرنے والے ہیں۔۔۔ کے واقعات اور مزاج اسلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں اجنبی عورتوں اور مردوں کا اختلاط اور باہم میل جول۔۔۔ خواہ وہ کسی غرض سے ہو۔۔۔ مقاصدِ عبودیت کے لیے مضر ہونے کے علاوہ معاشرۂ اسلامی کی طہارت و پاکبازی کے لیے بھی سخت نقصان دہ عمل اور شیطانی کھیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سوائے حج کے۔۔۔ جس کی ادائیگی کے ایام و اماکن مختص ہیں۔۔۔ کسی بھی عمل میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط نہیں رکھا گیا بلکہ حج میں بھی اگرچہ عورت کا احرام چہرہ کھلا رکھنا ہے، اس کے باوجود اس کو بے حجابی و بے پردگی کی اجازت نہیں دی گئی ہے، بنا محرم سفر کی اجازت نہیں، نظروں کی حفاظت کی تاکید ہے، اسی طرح ”نماز باجماعت“ جو اسلام کا بنیادی عمل ہے اس میں بھی عورتوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ پورے ذخیرہ احادیث میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس میں عورتوں کو باجماعت نماز پڑھنے یا اس کے لیے کم از کم مسجد کی جماعت میں شرکت کرنے کی ترغیب اور فضیلت دی گئی ہو، جب کہ مردوں کو نہ صرف اس کی ترغیب دی گئی ہے بلکہ عدم شرکت اور لا پرواہی پر انہیں سخت سے سخت وعیدیں

سنائی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم کی چند آیات پیش خدمت ہیں، امت کے سب سے
باعتقاد و باحیاط طبقہ خواتین یعنی ازواجِ مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:
وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى
اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور
قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق
(الاحزاب: ۳۳) مت پھرو۔

اس کی تفسیر میں مشہور تابعی مجاہدؒ وقتاً دہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ کی عورتیں بن
ٹھن کر مردوں میں گھوما پھرا کرتی تھیں، آیت کے ذریعہ اہل اسلام کی عورتوں کو اس سے منع
کیا گیا ہے۔

دوسری طرف تقویٰ و پرہیزگاری کے معیارِ اعلیٰ حضراتِ صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:
وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا
فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ
ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ
اور جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے
کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگا
کرو، یہ بات تمہارے دلوں اور ان کے
(الاحزاب: ۵۳) دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کو تاریخِ انسانیت کے سب سے پاکیزہ سماج سے متعلق ہدایت دی
گئی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ
وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ
مِنْ جَلَابِئِهِنَّ
اے پیغمبر! اپنی بیبیوں سے اور اپنی
بیٹیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی
بیبیوں سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں
سر کے اوپر سے کچھ نیچے (بھی) کر لیا
(سورۃ الاحزاب: ۵۹) کریں یعنی چہروں پر گھونگھٹ ڈال لیں۔

ایک اور موقعہ پر ہدایت دی گئی:

وَلْيَضْحَكُنَّ يَخْمُرُهُنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۚ
(سورۃ النور: ۳۱)
اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔

دل کی دنیا صالح و طاہر رکھنے کے لیے نگاہوں کی حفاظت کا حکم دیتے ہوئے ارشاد

فرمایا:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ
أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۖ
ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا
يَصْنَعُونَ ﴿۳۱﴾
وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ
وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَلْيَضْحَكُنَّ يَخْمُرُهُنَّ عَلَىٰ
جُيُوبِهِنَّ ۚ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ
الآیۃ

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ
اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ
صفائی کی بات ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کو سب
خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں اور (اسی
طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ
دیجئے (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور
اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی
زینت (کے مواقع کو آگے بیان کردہ چند
رشتوں کے علاوہ کسی کے سامنے) ظاہر نہ
کریں۔ (النور: ۳۰، ۳۱)

حضرت مریم علیہا السلام کی خلوت میں فرشتہ کے بصورتِ آدمی پہونچنے پر ان کی

گھبراہٹ اور عاجزی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ ۖ إِنَّ
كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾
کہنے لگیں کہ میں تجھ سے (اپنے خدائے)
رحمن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو (کچھ) خدا

ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جا) (سورۃ مریم)

مذکورہ بالا ارشادات ربانیہ کے بعد اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی چند ہدایات بھی ملاحظہ فرمائیے، آپ نے فرمایا:

ایاکم والدخول علی النساء۔ تم مرد لوگ اجنبی عورتوں کے پاس (بخاری: ۵۲۳۲) آمدورفت سے بچو۔

اس پر ایک انصاری صحابیؒ نے عرض کیا ”الحمو“ — شوہر کے قریب ترین عزیزوں مثلاً دیور — کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:

الحمو الموت وہ تواحیط وجاب میں مثل موت کے (متفق علیہ) ہیں۔

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لان یطعن رأس احدکم بمخیط تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی سلاخ
من حديد خیر له من ان یمس ٹھونس دی جائے اس سے بہتر ہے کہ وہ
امرءة لا تحل له۔ (طبرانی و بیہقی) نامحرم عورت کے جسم کو چھوئے۔
اسی طرح ارشاد گرامی ہے:

لا یخلون رجل بامرءة الا مع ذی کوئی عورت بغیر محرم کے کسی مرد سے تنہائی
محرم (بخاری: ۵۲۳۳) میں نہ ملے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور حضرت میمونہؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک نابینا صحابیؒ آپ سے ملاقات کے لیے آئے، آپ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا:

احتجبا تم لوگ پردہ میں ہو جاؤ

ہم نے عرض کیا وہ تو نابینا ہیں (ہمیں دیکھ نہیں پاتے) اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

افعمیا وان انتما
تم لوگ تو اندھی نہیں ہو، تمہاری نظر
تو پڑے گی!

— اس سے معلوم ہوا کہ اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی طرف نظر کرنا
اور ایک دوسرے کو دیکھنا بھی منع ہے۔

جہاں تک ان تعلیمات وارشادات کے بعد خود صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کا معاملہ ہے تو
درج ذیل چند واقعات سے اس کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ ابوالقیسؓ — جن کی زوجہ نے حضرت عائشہؓ کو
دودھ پلایا تھا — کے بھائی حضرت عائشہؓ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے تھے، حضرت
عائشہؓ نے انہیں گھر میں داخل ہونے سے اس لیے منع فرمادیا کہ ان کے محرم ہونے میں ان
کو تردد تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے مسئلہ دریافت
کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں ہوتے تھے، جب
دوسرے سوار ہمارے قریب سے گزرتے تو ہم لوگ اپنی چادر سے چہرہ ڈھانک لیتے تھے،
جب وہ آگے نکل جاتے تب ہم چہرے کھول لیتے۔

حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نے حضرت عائشہؓ کے سامنے مہاجر عورتوں کے
فضائل کا ذکر کیا، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ مہاجر خواتین کے بڑے
فضائل ہیں، لیکن میں نے بخدا انصار کی عورتوں سے زیادہ کتاب اللہ کی تصدیق کرنے والی
اور قرآن کریم پر پختہ یقین رکھنے والی عورتیں نہیں دیکھیں، جب آیت وَلْيَضْحَكُنَّ
مُخْمِرَاتٍ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ نازل ہوئی تو ان کے مردوں نے گھر جا کر اپنی عورتوں کو یہ حکم
سنایا، اور ان عورتوں نے — اللہ ان پر رحم فرمائے — صبح ہی سے اس پر عمل کرنا شروع
کر دیا کہ بڑی بڑی چادروں میں اپنے کو لپیٹ کر اس میں مخفی ہو کر رہے لگیں۔

یہ چند مثالیں ہیں اسلام میں حجاب کے لزوم اور مردوں و عورتوں کے درمیان اختلاط کے ممنوع ہونے کے سلسلہ میں کتاب و سنت اور اسلاف کی تعلیمات اور صحابیات کے عمل کی۔ اس وقت چونکہ اس موضوع کی تفصیل مد نظر نہیں ہے، اس لیے انہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسلام کے برخلاف دیگر ادیان و اقوام نے مسئلہ حجاب اور اختلاط کو زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ یورپ کے جدید کلچر نے تو اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے اسے عورتوں کے طبقہ پر ظلم اور ان کے ساتھ نا انصافی قرار دیا، اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا، اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم اور نیم برہنگی کے ذریعہ کالج کلچر کو عام کیا، مزید ظلم یہ کہ اپنی عورتوں کو بے حجاب کرنے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے تمام اقوام کی عورتوں بالخصوص مسلمان عورتوں کا مسلسل تعاقب کیا۔ ادھر مسلم حکمرانوں اور عامہ مسلمین کی اکثریت کی مغرب پرستی اور عشرت پسندی نے اپنی بے دینی پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا اور بے سند و من گھڑت دلائل سے مسلمان عورتوں کی عفت و عصمت پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا، نتیجتاً عالم اسلام میں بھی بے حجابی و بے باکی عورتوں کی شان اور کمال بننے لگی۔ ایک سعودی عرب۔۔۔ جو بے دعوائے خویش مملکت اسلامیہ کہلایا جاتا ہے اور بہت حد تک صحیح بھی ہے۔۔۔ بے حجابی کی اس صورتحال سے کم از کم بیرون خانہ محفوظ تھا اور فی الحال ہے بھی، لیکن یورپ کے بڑھتے ہوئے دباؤ، گلوبلائزیشن کے صہیونی پریش اور امریکی فراعنہ کے جارحانہ مطالبات کا مقابلہ نہ کر سکنے والے موجودہ حکمران شاہ عبداللہ نے گذشتہ دنوں سعودی عرب میں سائنسی علوم پر مشتمل ایک یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا، جو اگرچہ تعلیمی ترقی کے اعتبار سے ایک خوش آئند اقدام ہے، مگر اسی کے ساتھ اس یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کی پینچ لگا کر آزادی حجاب سے محفوظ واحد مملکت کو بھی بے پردگی و آزادی ثقافت کا سنگل دے دیا۔ یہ دنیا بھر کے غیور مسلمانوں کے لیے ایک حیرتناک المیہ ہے، اور نا طقہ سرگرمیاں ہے کہ۔

چوں کفر از کعبہ بر خیزد، کجا ماند مسلمان؟

دوسری جانب نام نہاد تجدید پسندوں اور غیر اسلامی ترقی کے متوالوں کی طرف سے داد و تحسین کی صدائیں ہر چہار سمت سے بلند ہو رہی ہیں، اور خود مکار و عیار یورپ خوشی کے شاد دیا نے بجا رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ علماء اسلام حکام اسلام کی توجہ ان امور کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے کا اپنا فرض ادا کریں۔ بالخصوص سعودی عرب کے والی مملکت خادم الحرمين الشريفین کی خوبیوں اور خدمتوں کے اعتراف کے ساتھ اس فیصلے کی سنگینی اور نقصانات کی مذمت کریں، یہ نہ سمجھیں کہ ہماری چیخ و پکار سے کیا ہونے والا ہے؟ اس لیے کہ بقول حضرت مفتی شفیع صاحب ”بیماری عام ہو جائے تو بھی اس کو بیماری کہا جاتا ہے صحت نہیں کہا جاتا“ اور بقول شیخ الاسلام تقی عثمانی دامت برکاتہم ”چاہے کوئی سنے نہ سنے فریضہ امر و نہی تو ادا ہو ہی جاتا ہے“۔

الحمد للہ مجلس علمیہ آندھرا پردیش کے ذمہ داروں نے مغذیۃً الی ربکم وَلَعَلَّہُمْ یَتَّقُونَ کے بموجب اس مسئلہ پر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ایک مناسب و معتدل احتجاجی نوٹ ریاست کے تمام علماء کرام کی طرف سے خادم الحرمين الشريفین کی خدمت میں روانہ کر دیا ہے، اور تمام علماء کرام سے خواہش کی ہے کہ وہ بھی اپنی طرف سے اس کی کاپیاں مملکت کو روانہ کریں۔

اللہ تعالیٰ حکام اسلام میں کھوئی ہوئی ہمت و جرأت اور اسلامی غیرت دوبارہ پیدا فرما کر انہیں سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل اور مذہب اسلام کے لیے الحاد و زندقہ کا ڈھال بنا دے۔ نیز علماء اہل اسلام کو سلف صالحین کی روش اختیار کر لینے، مصلحت کے نام پر مدہانت میں اور حکمت کے حوالہ سے دین کی ذلت میں مبتلا ہو جانے سے محفوظ فرمائے۔ آمین

(اداریہ جنوری ۲۰۱۰ء)

(الف)

دارالعلوم دیوبند ہی کا پیچھا کیوں؟

ادھر کچھ عرصہ سے میڈیا میں دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے کچھ نہ کچھ خبریں شائع ہو رہی ہیں، بالخصوص ”فتاویٰ“ کے سلسلہ میں دانستہ طور پر اس عظیم اسلامی یونیورسٹی کی شبیہ بگاڑنے کی مسلسل سعی کی جا رہی ہے، پچھلے دنوں کسی مفتی کو رشوت لیتا ہوا دکھا کر الکٹر انک میڈیا میں دارالعلوم دیوبند کے نام کو ناحق بدنام کیا گیا، اس کے بعد سے برابر کوئی نہ کوئی فتویٰ بلا ضرورت اور بے موقع اخبارات میں شائع ہوتا ہی رہتا ہے، ساتھ ہی اخبار والوں کی طرف سے ”یاد رہے کہ“ اور ”اس جگہ یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ“ جیسے جملوں کے ساتھ پچھلے فتاویٰ جن کی وضاحتیں بھی ہو چکی ہوتی ہیں دہرائے جاتے ہیں، اور اس کے معاً بعد سیاسی و سماجی حلقوں کے تبصرے شروع ہو جاتے ہیں۔ میڈیا کے اس طرز عمل پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش اور بنی بنائی پلاننگ کے تحت ہے۔ مثال کے طور پر جاریہ مہینے کے دوران اخبارات کی سرخیاں بنے چند فتاویٰ اور ان پر سماجی و سیاسی شخصیات کے تبصرے روزنامہ منصف حیدر آباد کے شکریہ کے ساتھ بعینہ ذیل میں درج ہیں، ان خبروں میں آپ کو نیوز میکروز یعنی خبر سازوں کا بین السطور یا تحت اللفظ بھی اچھی طرح سمجھنے کو ملے گا:

ماڈلنگ اور فلموں میں اداکاری غیر اسلامی: دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

مظفرنگر۔ 2 مئی (پی ٹی آئی) برصغیر کی ممتاز دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے نستوی

جاری کیا گیا جس میں مسلم خواتین کی ماڈلنگ اور اداکاری کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ شریعت کی رو سے یہ ایک سنگین جرم اور بدترین گناہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نائب ناظم اعلیٰ مولانا عبدالحق مدراسی نے کہا کہ پرودہ مذہب کا اہم ترین اصول ہے، بے پروگی حرام ہے۔ جہاں تک ماڈلنگ اور فلموں میں اداکاری کا تعلق ہے خواتین اس میں نہ صرف اپنا پروہ اتار دیتی ہیں بلکہ جسم کی نمائش بھی کرتی ہیں۔ لہذا شریعت کی رو سے یہ ایک سنگین جرم ہے۔ مولانا نے مزید بتایا کہ اسلامی قوانین کی روشنی میں ماڈلنگ کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کا مفتیان کرام کو جواز حاصل ہے۔ اس استفسار پر کہ سابقہ فتویٰ میں ہندوستان کی ٹینس اسٹارٹھانیہ مرزا کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مختصر لباس کا استعمال ترک کرے جس سے جسم نمایاں ہوتا ہو، بالخصوص ٹینس اسکرٹس کے استعمال سے گریز کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالحق مدراسی نے کہا کہ مفتیان کرام کو فتویٰ جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل ضرور ہے لیکن اگر عوام فتویٰ پر عمل نہیں کرتے تو اس کے لیے وہ (عوام) ہی گنہگار یا ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مولانا نے وضاحت کی کہ فتویٰ پر عمل آوری لازمی حیثیت نہیں رکھتی، یہ ایک عمومی مشورہ ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے جاری کیے جانے والے فتوے ملک کے قوانین کے مغائر نہیں ہو سکتے۔ ان کی نوعیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ہندوستان بھر میں پنچایتوں کے احکامات یا افغانستان و پاکستان کے بعض علاقوں میں جرگہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔ فتویٰ کوئی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک رہنمایانہ اصول ہوتا ہے۔ جو شخص رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے کسی مفتی سے رجوع ہوتا ہے اور فتویٰ حاصل کرتا ہے تو اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا اس کا اختیار تیزی ہوتا ہے۔ ملک میں پہلی مرتبہ ممتاز دینی درسگاہ کے کسی سینئر عالم دین نے فتویٰ کی حقیقت اور اس کی حیثیت پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا عبدالحق مدراسی نے وضاحت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ فتویٰ پر عمل کیا جاسکتا ہے اور اس کو نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس شخص کی خلوص نیت پر منحصر ہے جو فتویٰ حاصل کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اس فتوے سے اختلاف کرتے ہوئے ممبئی کی فلمی شخصیتوں (سلبرٹیز) نے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ ماڈلنگ و اداکاری ہرگز غیر اسلامی نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ کیوں اٹھایا جا رہا ہے ناقابل فہم ہے۔ اداکار اور ماڈل زلفی سید نے اپنے ردِ عمل میں کہا کہ اسلام ایک عصری مذہب ہے جس میں اداکاری اور ماڈلنگ ممنوع نہیں ہے۔ جو لوگ مذہب کا گہرا علم نہیں رکھتے وہ اس طرح کی چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اس میں کوئی معقولیت کی بات نہیں ہے۔ شہر علی نامی اداکار نے بھی کہا کہ کسی بھی مذہب میں ماڈلنگ اور اداکاری ممنوع نہیں ہے۔ دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح ماڈلنگ

اور اداکاری کے شعبہ میں بھی سخت ترین محنت اور جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس مسئلہ پر فتویٰ جاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (روزنامہ منصف ۳ مئی ۲۰۱۰ء)

انشورنس پالیسی کو اپنانا شریعت کے مغائر: دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

لکھنؤ۔ 14 مئی (پی ٹی آئی) دارالافتاء دارالعلوم دیوبند نے بنکوں میں ملازمت کو غیر اسلامی قرار دینے کے بعد اب انشورنس پالیسی کے اختیار کرنے کو بھی اسلامی اصولوں کے خلاف قرار دیا ہے۔ ملک کی اس سب سے بڑی دینی جامعہ سے جاری کردہ فتویٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ”انشورنس پالیسی غیر شرعی ہے کیونکہ وہ سود اور جوئے پر مبنی ہے“ فتویٰ اس استفسار کے جواب میں جاری کیا گیا ہے کہ ”شریعت کی روشنی میں انشورنس پالیسی حاصل کرنا جائز ہے؟“ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان انشورنس پالیسیاں لیتے ہیں جو ایک معاہدہ ہے جس کے ذریعہ طمانیت دی جاتی ہے کہ نقصانات یا جو کھم کی صورت میں بیمہ شدہ شخص یا اس کے نامزد کردہ کسی شخص کو متعین رقم دی جائے گی۔ اسی دوران دہلی کے ایک عالم دین مولانا فروز مجتہبی نے کہا ہے کہ فتاویٰ حباری کرنے والے علماء (مفتیان) کو چاہیے کہ وہ اس پس منظر کی بھی وضاحت کر دیں جس میں فتویٰ جاری کیا جا رہا ہے تاکہ کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ دریں اثناء جمعیت العلماء ہند کے ترجمان مولانا عبد الحمید نعمانی نے کہا ہے کہ فتاویٰ کو عمومیت نہیں دی جانی چاہیے اور یہ دیکھا جانا چاہیے کہ ایک فتویٰ کس پس منظر میں جاری کیا گیا ہے۔ ”لوگوں کو چاہیے کہ وہ بین السطور مفہوم اخذ کریں اور فتاویٰ کو عمومیت (حکم عام) کا موقف نہ دیں۔ قبل ازیں دارالعلوم دیوبند نے بنکوں میں سود پر مبنی تحریروں اور حساب کتاب کے کام کو غیر شرعی قرار دیا تھا۔ یہ فتویٰ اس استفسار کے جواب میں تھا کہ آیا مسلمان کسی بنک یا انشورنس کمپنیوں میں کام کر سکتے ہیں؟۔ (روزنامہ منصف ۱۵ مئی ۲۰۱۰ء)

دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کی مذمت پر خود ساختہ دانشور کی ملامت

نئی دہلی۔ 15 مئی (پی ٹی آئی) بالی ووڈ کے ممتاز نغمہ نگار جاوید اختر کو ای میل پر موت کی دھمکی دی گئی ہے۔ انہوں نے ایک ٹی وی چینل پر بحث کے دوران برسر روزگار مسلم خواتین کے خلاف دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کو پاگل پن قرار دیا تھا۔ جاوید اختر نے بتایا کہ انہیں ای میل پر ایک پیغام موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ ”اب آپ کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے“۔ پی ٹی آئی سے بات چیت کرتے ہوئے جاوید نے بتایا کہ فتویٰ کے خلاف ان کے بیان کے بعد ہاٹ میل پر بے شمار ای میل

موصول ہوئے جس میں ان کی لعن طعن کی گئی۔ انہیں اسلام اور مسلم دشمن قرار دیا گیا۔ جاوید اختر نے فوری پولیس کو اطلاع دی تاکہ انہیں معقول سکیورٹی فراہم ہو سکے، چنانچہ ان کی رہائش گاہ پر سکیورٹی اہلکار تعینات کروئے گئے ہیں۔ اختر نے کہا فتوؤں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، معاشرے میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اس بات پر بعض مسلمان مشتعل ہو گئے اور انہوں نے نفرت انگیز ای میل پیغامات روانہ کئے۔ بعض ای میلس دھمکی آمیز تھے۔ ایک میں انہیں جان سے مار دینے کی بھی دھمکی دی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے حال ہی میں فتویٰ جاری کیا گیا تھا کہ مسلم خواتین کے لیے وفاتر میں مرووں کے ساتھ میل جول بڑھانا ناجائز ہے بلکہ ایسی اجرت شریعت میں حرام قرار پاتی ہے۔ مسلم خواتین کو چاہیے کہ وہ ایسے مقامات پر روزگار یا ملازمت کرنے سے گریز کریں جہاں ان کا مرووں کے ساتھ میل جول ہوتا ہو۔ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ افتاء کے سربراہ مفتی حبیب الرحمن کی زیر صدارت علماء کی کمیٹی نے یہ فتویٰ جاری کیا تھا۔ ٹی وی چینل پر اس فتویٰ کے سلسلہ میں بحث کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جاوید اختر نے یہ دوران مباحثہ فتویٰ کی مذمت کی تھی۔ جاوید اختر کو دھمکی دیتے ہوئے ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوری مسلمانوں سے معذرت خواہی کریں، بصورت دیگر سنگین عواقب کے لیے تیار ہو جائیں۔ (روزنامہ منصف ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء)

دیوبند کے فتاویٰ سے مسلمانوں کی ترقی غیر متاثر: سلمان خورشید

نئی دہلی۔ 15 مئی (یو این آئی) مرکزی وزیر اقلیتی امور سلمان خورشید نے دارالعلوم دیوبند کے حالیہ فتاویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے آج کہا کہ بحیثیت مسلمان وہ ان سے متاثر نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے رد عمل سے ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ دارالعلوم نے اپنے فتوؤں میں خواتین کی ملازمت کی مخالفت کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ انشورنش پالیسی اختیار کرنا شریعت اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ سلمان خورشید نے یہاں ایک پریس کانفرنس کے دوران اس مسئلہ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مزید بینکوں اور اسکولوں کے قیام کے لیے مسلمانوں کے مطالبات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس استفسار پر کہ آیا علماء کی جانب سے ایسے فتوؤں سے مسلمانوں کی ترقی متاثر نہیں ہو رہی ہے اور کیا ان کی وزارت کو اس کا نوٹ نہیں لینا چاہیے؟ سلمان خورشید نے کہا کہ اقلیتوں کی ترقی کے لیے ان کی وزارت کی اسکیمات پر ایسے فتوؤں کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے کام کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ کوئی ہمیں روکنے نہیں آ رہا ہے۔ ہم ان (فتوؤں) سے قطعی متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ اور اگر کوئی مجھے اپنے کام سے روک دے تو پھر میں اس کا نوٹ لوں گا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی

وزارت مزید بینکوں کا قیام عمل میں لائے گی اور قائدانہ رول ادا کرنے خواتین کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ ان اسکیموں اور پروگراموں پر مسلمانوں کا ردِ عمل کافی حوصلہ افزا رہا ہے اور یہ بے حد کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک مسلمان ہوں اور اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس انشورنس پالیسی ہے اور میں بینکنگ نظام کے فوائد سے بھی استفادہ کرتا ہوں۔ یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند نے جو برصغیر کی ایک ممتاز دینی درسگاہ ہے، انشورنس پالیسی اختیار کرنے کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ یہ سود اور جوئے پر مبنی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ دارالافتاء نے اس استفسار پر کہ آیا شریعت کی روشنی میں انشورنس پالیسی لینا جائز ہے، یہ فتویٰ جاری کیا۔ دارالعلوم دیوبند اسلامی بینکنگ متعارف کرنے کی وکالت کرتا رہا ہے جس کے تحت صارفین قرضہ جات پر سوداوا نہیں کرتے اور اس میں رقومات جمع کرنے والوں کو سوداوا نہیں کیا جاتا۔ (روزنامہ منصف ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء)

علماء کو مسلمانوں کی پسماندگی کا جائزہ لینے کا مشورہ

دیوبند کے فتویٰ پر شدید ردِ عمل، دہلی کی خواتین سے آئی اے این ایس کا انٹرویو نئی دہلی۔ 17 دہلی (آئی اے این ایس) کئی نوجوان مسلم خواتین نے خواتین اور مردوں کے فکاتر میں گھل مل کر کام کرنے پر دیوبند کی دینی درسگاہ کے جاری کردہ فتویٰ پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وقت آچکا ہے کہ علماء مسلمانوں کے لیے پریشان کن حقیقی مسائل کا جائزہ لیں جن میں معاشی پسماندگی بھی شامل ہے۔ ایک کال سینٹر میں ملازم 20 سالہ جینس میں ملبوس لڑکی فرزانہ تسنیم نے آئی اے این ایس کو بتایا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ کس بناء پر یہ باور کرتے ہیں کہ خواتین کو کام کرنے سے روکنا ممکن ہے۔ تسنیم نے بتایا کہ وہ ایک در خواست علماء کے گوش گزار کرتی ہیں۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں بتایا کہ آیا علماء نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوئی کام انجام دیا ہے؟ تسنیم نے بتایا کہ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے تو انہیں اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ مغربی اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں واقع دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے علماء نے 14 اپریل کو ایک آن لائن استفسار پر ایک فتویٰ جاری کیا تھا۔ تاہم مسلم اسکالرس کے بشمول دیگر متعدد گوشوں کی جانب سے فتویٰ کو نشانہ بنایا گیا۔ بہت سے لوگ اس اقدام کو دینی درسگاہ کی غسیب ضروری مداخلت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ دارالعلوم ویب سائٹ کے دارالافتاء پیج پر ایک گمنام سوال کنندہ نے یہ دریافت کیا تھا کہ آیا ہندوستان میں مسلم خواتین سرکاری یا خانگی ملازمتیں کر سکتی ہیں؟ آیا انہیں جو تنخواہ

کام کے معادضہ میں حاصل ہوگی وہ حلال ہوگی یا حرام؟ اس کے جواب میں دینی درسگاہ نے بتایا تھا کہ ایسے خانگی یا سرکاری اداروں میں جہاں مرد و زن مل جل کر کام کرتے ہیں اور خواتین کو نقاب کے بغیر بے باکی کے ساتھ مردوں سے بات چیت کرنی پڑتی ہے وہاں کام کرنا مسلم خواتین کے لیے جائز نہیں ہے۔ دینی درسگاہ کے علماء نے اگرچہ بتایا کہ اگر خواتین کام کے دوران مناسب لباس زیب تن کریں تو فتویٰ کی ممانعت کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، جب کہ بہت سے مسلم خواتین نے اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ تسنیم نے برہمی کی حالت میں بتایا کہ اگر فتویٰ کا تعلق لباس سے ہے تب بھی وہ اس پر عمل کرنے کی پابند نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ علماء، مبلغین ہوتے ہیں اور حج نہیں ہوتے۔ ان کا کام تبلیغ کرنا ہے جب کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں گی کہ انہیں کس بات پر چلنا ہے اور کس پر نہیں چلنا ہے۔ دہلی کی ایک سماجی کارکن فقرہ صدیقی نے تسنیم کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ انہیں (علماء کو) بنیادی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔ کیا ہندوستان میں دفاتر جانے والی ہزاروں خواتین کو کام سے روکنا ممکن ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ اس قسم کے متنازعہ آراء کے اظہار سے کس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ایسے وقت جب کہ ہندوستانی مسلمان غربت، ناخواندگی اور پسماندگی جیسے ناسازگار حالات کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں ایسے میں مماثل فتوؤں سے ہم نے جو ترقی کی ہے وہ معکوس ہو جاتی ہے۔ اس بات کا اظہار صدیقی نے آئی اے این ایس سے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ حجاب کا استعمال ایک سطحی بات ہے اس بات کا انحصار آپ کے عزائم پر ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ بلاشبہ تمہارے اعمال کا دار و مدار تمہاری نیتوں پر ہے۔ صدیقی نے سوالیہ انداز میں کہا کہ برقعہ پہننے کے باوجود اگر آپ غیر اسلامی سرگرمیوں کا ارتکاب کرتے ہیں تو آپ ایک متقی مسلمان نہیں کہلا سکتے ہیں۔ (ردزنامہ منصف ۱۸ مئی ۲۰۱۰ء)

دارالعلوم فرنگی محل کا فتویٰ

لکھنؤ۔ 18 مئی (پی ٹی آئی) دارالعلوم دیوبند کی جانب سے یہ فتویٰ جاری کئے جانے کے بعد کہ خواتین کا دفاتر میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا اور ان کے خاندانوں کے لیے ان کی آمدنی قبول کرنا غیر اسلامی ہے۔ شہر کے ایک دینی مدرسہ نے کہا ہے کہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف اہم بلکہ لازمی بھی ہے۔ دارالعلوم فرنگی محل کے مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے قرآن وحدیث کے حوالے سے بتایا کہ ہر مسلمان کے لیے تعلیم حاصل کرنا فرض ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ فتویٰ ایک خاتون ہما خواجہ کے استفسار پر جاری کیا گیا جنہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں دصاحت طلب کی تھی۔ دارالعلوم

کے ناظم نعیم الرحمن نے یہ بات بتائی۔ اس فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ انسان سماج میں علم کا نور پھیلانے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔ شریعت میں حصول تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کوئی بھی شخص جو اپنی بیٹیوں یا بہنوں کو تعلیم دلاتا ہے اور انہیں زیور ادب سے آراستہ کرتا ہے، ان کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے اور ان کی شادی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، جنت میں جائے گا۔ اس فتویٰ میں کہا گیا کہ اسلام میں نہ صرف اپنے بچوں کو تعلیم دلانے بلکہ اپنے ملازمین کے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے۔ فتویٰ میں کہا گیا کہ ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی مناسب تعلیم کو یقینی بنانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ دارالعلوم نے کہا کہ ناخواندگی ہی مسلمانوں کی پستی و ذوال کی اہم وجہ ہے۔ دینی و دنیوی تعلیم میں تخصیص کرتے ہوئے عصری علوم کو ثانوی اہمیت دینے والے علماء کرام کی جانب سے مسلم لڑکیوں کی اہمیت پر زور دیا جانا انتہائی اہمیت کا حامل رجحان ہے، جبکہ بالعموم ان پر رجعت پسندی و قدامت پسندی اور بنیاد پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ (روزنامہ منصف ۱۹ مئی ۲۰۱۰ء)

دارالعلوم دیوبند جیسے دینی و اسلامی ادارہ نے جس کے قیام کا مقصد ہی ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے دین و ایمان کا تحفظ ہے، اور جس کے غیر متمند و جفاکش علماء و مشائخ نے ایک طرف اپنی سو سالہ جدوجہد، ایثار و قربانی کے بعد ملک کو آزادی کے شرف سے مشرف کیا، اور دوسری جانب دیرھ سو سال سے مسلسل ملت اسلامیہ ہندوستان کے دین و عقیدہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے تحقیق، تصنیف اور تبلیغ کے کام میں مشغول و مصروف ہیں۔ اگر مسلمانوں کو حرام خوری، بے پردگی، بے حیائی و برہنگی اور سرد وزن کے آزادانہ اختلاط (جس کی بدترین شکل کال سنٹرز ہیں) سے روکنے کے واسطے مسئلہ تلا کر اپنا شرعی فریضہ ادا کیا تو کیا بُرا کیا؟ سماج کے تمام انسانیت نواز طبقوں کو اس کی حمایت و تائید میں ہم آواز ہو جانا چاہیے تھا یا موضوع بحث بنا کر فتویٰ کی تنقیص اور جگ ہنسائی کا سامان فراہم کرنا؟

سلمان خورشید جیسے مذہب بیزار منسٹر، جاوید اختر جیسے بے دین نغمہ نگار، زلفی سید جیسی ماڈلسٹ، فرزانہ تسنیم اور فقرہ صدیقی جیسی فیشن ایبل مہیلائیں جن کی ساری زندگی دین سے دور اور آزاد ماحول میں گزری ہو وہ اسلامی احکام پر تبصرہ کا کیا حق رکھتے ہیں؟ یہ میڈیا کی

اپنی سوچ ہے کہ ایک خالص شرعی و اسلامی مسئلہ کو فلم اسٹاروں، سرکاری وزیروں اور خود اس غلطی میں مبتلا لوگوں سے رجوع کر کے ان کے رد عمل کو بمقابلہ مفتیان کرام اس طرح پیش کر رہے ہیں جیسے دونوں مساوی آراء ہوں۔ ع

بریں عقل و دانش بیاید گریست

ان نیوز میں خط کشیدہ عبارات دوبارہ ملاحظہ کیجئے اور سوچئے کہ کیا چند برس پہلے کسی کلمہ گو کو اسلامی احکامات کے بارے میں اس قدر رکیک تبصرے کرنے کی جرأت ہو سکتی تھی؟ اور اگر کوئی بد نصیب کرتا بھی تو کیا مسلمان انہیں گوارا کرنے کی ہمت کر سکتے تھے؟ ہر گز نہیں! لیکن ان خبروں میں اسلام کو ”عصری مذہب“ کہا گیا، علماء کو ”مذہب کے گہرے علم سے کورا“ قرار دیا گیا، شرعی راہنمائی کو ”پاگل پن اور غیر ضروری مداخلت“ سے تعبیر کیا گیا، حجاب کے استعمال کو ”سطحی بات“ بتلایا گیا نیز ”فتوؤں پر عمل کرنے نہ کرنے کے فیصلے کو جابلوں کا اپنا حق“ باور کرایا گیا۔ جب کہ قرآن مجید میں عوام الناس کو صاف طور پر پابند کیا گیا ہے کہ وہ علماء سے پوچھ پوچھ کر دین پر چلتے رہیں۔ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الدِّينِ كِرَانِ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ تمہیں اگر نہیں معلوم ہے تو اہل علم سے معلوم کر لو۔ (سورۃ الانبیاء: ۷) فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ اگر تمہیں کسی چیز میں اشتباہ و اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول (یعنی کتاب و سنت کے ماہرین) کی طرف رجوع کرو۔ (سورۃ النساء: ۵۹) چہ جائیکہ فلم اسٹاروں اور بے دینوں کی طرف!

انگلش میڈیا سے تو ہم کوئی اچھی توقع نہیں کر سکتے مگر افسوس اس پر ہوتا ہے کہ اردو اخبارات حتیٰ کہ مسلم اخبارات بھی اسی لئے میں نے ملا لیتے ہیں اور ایک اسلامی و تاریخی عظیم درس گاہ کی ساکھ متاثر ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کسی بھی ادارہ کے دارالافتاء کا کام مسائل کے سوال کا جواب دینا اور مبتلی بہ کی تشویش کو اسلامی نقطہ نظر اور شرعی قانون کی روشنی میں دور کر کے اس کو اپنے دین کی صحیح راہ دکھلانا ہے، تاکہ وہ

مذہبی احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب اور عند اللہ مجرم نہ ہو، سارے عالم میں مسلمان اسی ضرورت کے لئے دارالافتاء سے رجوع کرتے ہیں اور صدیوں سے مفتیانِ کرام اپنے اس فریضے کو بڑی ذمہ داری اور نہایت احتیاط سے ادا کرتے آ رہے ہیں، لیکن جب سے سیاست و صحافت پر عالمی قوتوں کا قبضہ ہو گیا ہے تب سے صحافت کی آزادی برائے نام رہ گئی ہے اور ایک مخصوص رنگ اس پر غالب آ گیا ہے، ادھر حکومتیں بھی۔۔۔ ناگفتہ بہ مصالح کے تحت۔۔۔ بہت حد تک عالمی قوتوں کے دباؤ میں آ چکی ہیں جو کسی صاحبِ نظر و خبر سے مخفی نہیں ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ہندوستان ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں ایک شاندار و تابناک تاریخ ہے، وہ ملتِ اسلامیہ کے دل کی دھڑکن اور متصل و پختگی پسند۔۔۔ یا متبعِ سنت۔۔۔ مسلمانوں کی آواز و آبرو ہے، ہم مسلمان اس کی اہمیت کو خواہ نہ سمجھیں عالمی قوتوں کو اس بات کا خوب اندازہ اور اچھی طرح احساس ہے کہ برصغیر کی تسخیر علماءِ دیوبند اور مدارسِ اسلامیہ کو بے اثر کئے بغیر ممکن نہیں ہے، اور انہیں بے اثر کرنے کے لیے اُن پر عوام کا جواٹوٹ اعتماد اور احترام تاہنوز باقی ہے اس کو ختم کرنا ضروری ہے، اس لیے یہ کام ان دشمنانِ اسلام۔۔۔ نام نہاد عالمی طاقتوں۔۔۔ کی اولین ترجیح ہے، جبکہ عالم اسلام میں ان کا یہ حربہ نہایت کارگر اور مفید مطلب ثابت ہو چکا ہے۔

میرے سامنے اس وقت پڑوسی ملک میں تین صدورِ مملکت کے پی اے اور اس ملک کے سیاسی آقاؤں کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والی معروف شخصیت جناب قدرت اللہ شہاب کی تصنیف ”شہاب نامہ“ موجود نہیں ہے، مگر حافظہ کی مدد سے اس میں مذکور ایک واقعہ نقل کرتا ہوں جس سے ہمارے دارالعلوم کی پیداوار یعنی علماء کرام سے حکومتی ایوانوں میں پائے جانے والی ہیبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس ملک کے کسی صدرِ مملکت نے حکومت کو ہدایت کی کہ مقرر اور ذمہ دار شخصیات پر مشتمل ایک وفد ان ممالک کو روانہ کیا جائے جہاں اسلامی

ذہنیت کا خاتمہ کر کے دہریت و لامذہبیت کو غالب کرنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہے، تاکہ وہ ان اسباب کو دریافت کر سکیں جو اس مقصد کے لئے استعمال کئے گئے، چنانچہ ایک وفد نے حکومت کی جانب سے دہریت زدہ عرب ملکوں کا دورہ کیا اور جائزہ لیا کہ ان ممالک کے باشندگان میں قدامت پسندی یعنی دینداری کا خاتمہ کر کے تجدید پسندی یعنی آزادی و بے دینی کا رجحان کس طرح پیدا کیا گیا؟ یہ لوگ دورہ کردہ ممالک میں ہر جگہ ایک ہی ”گُر“ پاسکے، وہ یہ کہ ”محراب و مسند کی آزادی اور علماء و مشائخ کی بے باکی پر کسی نہ کسی طرح کنٹرول کر کے ان کا اثر سماج پر سے ختم کر دیا جائے“، چنانچہ واپسی کے بعد انہوں نے صدر مملکت کو رپورٹ پیش کی تو صدر نے مملکتی انتظامیہ کو ملک میں اس کا تجربہ کرنے کی باقاعدہ ہدایت جاری کر دی، مگر سکرٹریٹ نے یہ حکمنامہ اس نوٹ کے ساتھ قمر صدارت کو واپس کر دیا کہ ”جب تک ملک میں یوسف بنوری — سلام ہو ان کی روح مبارک کو جیسے علماء موجود ہیں اس حکمنامہ کی تعمیل ممکن نہیں ہے۔“ سبحان اللہ! ایک عالم دیوبند کی غیرت ملی و مذہبی کا یہ عالم ہے کہ پوری مملکت اس کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ خواہ کل کی تاریخ ہو یا آج کا تجربہ! مسلمانوں پر سب سے زیادہ اثر و رسوخ اگر کسی کا ہو سکتا ہے تو وہ علماء و مشائخ کی جماعت ہے، یورپ نے گلوبلائزیشن کے جدید وحسین اور پُر فریب نام سے جہانگیری اور کشور کشائی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور اس میں ”تسخیر اسلام و مسلمین“ کے لیے انتہائی تدبیر اور غایت تحقیق سے جو حربے اپنائے ہیں ان میں علماء اور علمی اداروں کے اعتماد کو مجروح کر کے ان کے اور عوام کے درمیان فاصلے

۱۔ میں نے جس وقت یہ کتاب پڑھی تھی امام الحرمین فیثا پوری یاد آ رہے تھے کہ انہوں نے عید کا چاند نظر نہ آنے کا اعلان کیا تھا اور بادشاہ وقت نے چاند کی توثیق کر کے نماز عید کا اعلان کر دیا تھا، مگر جب بادشاہ صبح کو عید گاہ پہنچا تو سوائے اس کے اور اس کے چند درباریوں کے عید گاہ میں کوئی مسلمان موجود نہ تھا، سب امام الحرمین کے اعلان کے مطابق روزہ رکھے ہوئے گھروں میں مقیم تھے تب اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ میری کیا فاک حکومت ہے، حکومت تو اسی بورئیشن فقیر کی چل رہی ہے۔

پیدا کرنے کا حربہ سرفہرست ہے، اسی حربے کے ذریعہ یورپ نے پہلے عالم عرب کے مسلمانوں کی شبیہ بگاڑ دی اور اب برصغیر کے مسلمانوں کی لٹیا ڈبونے کے لیے میدان میں اُتر آیا ہے، خیر! وہ تو جو بھی کریں کم ہے کہ آخر ہمارے دشمن ہیں مگر انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ گذشتہ صدی میں برصغیر میں جتنی تحریکیں شخصی مطالعہ اور سیلف اسٹیڈی کے ذریعہ سلف صالحین کی روش سے ہٹ کر وجود میں آئیں اُن سب نے بھی۔۔۔ خواہ کسی غرض و نیت سے ہو۔۔۔ یورپ کے اس حربے کی بھرپور عملی تائید اور مدد کی ہے، دنیا جانتی ہے کہ جمہور علماء کرام بالخصوص علماء دیوبند مسلمانوں کے لیے سلف کی منکری و تحقیقی اتباع سے آزاد ہو جانے سے زیادہ خطرہ کسی اور گمراہی میں نہیں سمجھتے۔ اسی لیے کسی بھی تحریک اور دعوت کو اس شاہ راہ مستقیم سے ذرا منحرف پاتے ہیں تو فوراً اس کا تعاقب کر کے ملت اسلامیہ کو اس کجی کے انجام بد سے باخبر کر دیتے ہیں، اس لیے ان جدید تحریکوں، جدید تعلیماتوں، جدت پسندوں اور یورپ کے اعتراضات سے خواہ مخواہ مرعوب ہونے والوں نے اپنی عافیت اور اپنی بقا اسی میں سمجھی کہ ان علماء ہی کو سب سے پہلے نشانے پر لے کر عوام الناس کے سامنے ان کی ایسی شبیہ و تصویر پیش کی جائے جس سے وہ ناقبت اندیش، قوم کے بدخواہ، حالاتِ زمانہ سے بے خبر، ترقی کی راہ میں رکاوٹ، زمانہ کی رفتار سے پسماندہ، عہدِ قدیم کی بھول بھلیوں میں محبوس نظر آئیں۔ یا پھر قرآن و حدیث جیسے آسان دین پر شریعت کی ملمع سازی، فقہ کی زیادتی اور تہذیبی روایات کی پاسداری کے مجرم دکھائی دیں، اس طرح یعنی دانا دشمنوں کے ساتھ نادان دوستوں کی شرکت و نصرت نے یورپ کے اس حربے کو دو دھاری کر دیا ہے۔ **فَالِی اللّٰهُ الْمُشْتٰکِی وَهُوَ الْمُسْتَعٰنُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِالّٰہِ۔**

(ب)

تصویر کا دوسرا رخ!

آدم برسر مطلب! حکایتِ اغیار کے بعد اب شکایتِ احباب کے لیے بھی دل بے چین

اور قلم بے تاب ہے، یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف کرام دین حقیقی اور تہذیب محمدی کے تحفظ کے لیے اپنے آپ کو ہر دور کے وسائل سے آراستہ اور ہر مؤثر اسلحہ سے مسلح رکھتے تھے، بہت سے علوم، متعدد فنون اور مختلف زبانیں انہوں نے ذاتی اور داخلی معاملات میں قطعاً ضرورت نہ ہونے کے باوجود محض خارجی حملوں اور ارتدادی فتنوں سے نمٹنے کے واسطے سیکھیں، اور بڑی عرق ریزی و جانفشانی سے سیکھیں، ان علوم و فنون کے بغیر بھی ان کا عقیدہ مستحکم اور عمل مضبوط تھا، مگر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی نگرانی و سرکوبی ان کے حصول کے بغیر ممکن نہ تھی، بعض علماء کو اس پر اعتراض اور ان علوم سے اختلاف بھی تھا، مثلاً یونانی علوم کے عالم اسلام میں در آمد کرنے پر امام ابن تیمیہؒ اس قدر نالاں تھے کہ پورے وثوق کے ساتھ قیامت کے دن خلیفہ کی گرفت کا خطرہ ظاہر فرماتے تھے، مگر تاریخ گواہ ہے کہ ضمنی نقصانات سے صرف نظر راسخین فی العلم نے ان علوم کو یونانیوں کے عالم اسلام میں برآمد کردہ اعتراضات و اشکالات کو رفع کرنے اور انہی کے ہتھیار ان کی جانب پھینک کر انہیں دفع کرنے کے لیے استعمال فرمائے اور اسلام کی حقانیت پر سے شکوک و شبہات کے گھنے بادل ختم کر دیے۔

آج کے دور میں مسلمانوں کی معلومات کا ذریعہ بھی دیگر اقوام کی طرح ”میڈیا“ اور ”انٹرنیٹ“ ہو گیا ہے، جب کہ انہی آلات کو یورپ فکری الحاد، ذہنی ارتداد اور عملی و احسن لاتی فساد برپا کرنے کا مضبوط ہتھیار بنایا ہوا ہے۔ اس میں اس قدر ابتلائے عام ہو گیا ہے کہ اب عوام الناس کو ان سے باز رہنے کی تلقین بے سود و بے اثر نہ سہی کم اثر ضرور ہو گئی ہے، کیونکہ عوام تو عوام خواص کی دلچسپیاں بھی۔۔۔ الا ماشاء اللہ۔۔۔ ان آلات جدیدہ و عجیبہ ہی میں کھوئی ہوئی ہیں، فضلاء مدارس تک ان میں الجھے ہوئے ہیں اور بعض دعاۃ باطل سے دبے ہوئے بھی ہیں، جو لوگ ان سے بچے ہوئے ہیں وہ یا تو اعلیٰ درجہ کے متقی حضرات ہیں جن کو واقعی شرح صدر نہیں ہے، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کا انہیں برا قرار دینے کا مدار ان کے

مستفید نہ ہو سکنے کی مجبوری پر ہے نہ کہ تحقیق و تقویٰ پر اور کچھ ان کے مابین ہیں جو ایک طرف تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں اور ان کے منفی اثرات کو دیکھ رہے ہیں دوسری طرف اکابر کی جانب ٹکٹکی باندھے متوجہ ہیں کہ وہ اس مسئلہ کا کیا حل نکال کے دیتے ہیں اور کب دیتے ہیں؟

ایسے حالات میں ہمارے اکابر علماء اپنے رسوخ علمی اور نور باطنی سے تبلیغ اسلام اور دعوتِ دین کی خاطر ان ذرائع کے استعمال پر کافی غور و خوض اور مسلسل تحقیق کے بعد کوئی اجماعی فیصلہ فرمائیں کہ آیا احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ان ذرائع کا استعمال بڑا نقصان ہے یا ان سے علاحدہ رہ کر قوم کو اہل باطل کے حوالے ہو جانے دینا بڑا نقصان ہے؟ کیونکہ اگر خطرہ سے کوئی راستہ محفوظ نہ ہو تو اہل البلیتین کی تعیین کی صورت ہی رہ جاتی ہے۔ اس وقت ادھیڑ اور نو جوان دو نسلیں ایسی ہیں جن کی اکثریت نہ علماء کے پاس جاتی ہے اور نہ ہی کتابیں پڑھتی ہے، ان کا ذریعہ معلومات گھر بیٹھے کے یہی اسباب ہیں، اگرچہ ماضی میں اس سلسلہ میں بیٹھک ہو چکی ہے اس کے بعد پھر کوئی اجلاس نہیں ہوا، ہواؤں کی رفتار سے بدلتے ہوئے حالات اور بگڑتے ہوئے افکار و اعتقادات کے تناظر میں ہماری یہ سست رفتار غور و فکر کہیں ہم کو خرابیِ بسیار کے بعد بیدار ہونے کا مجرم نہ بنا دے۔ اس جگہ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ راقم عاجزان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں اپنے اکابر کے حزم و احتیاط میں یقین نہیں ہے، الحمد للہ تعالیٰ اکابر علماء دیوبند کے مسلک معتدل، ان کے تفقہ، تدین اور بلا خوفِ ملامت احقاقِ حق کا معترف بلکہ اس پر مفتخر ہے، یہ گزارش امت کے ناگفتہ بہ احوال اور دن بہ دن باطل کے حوالہ ہوتے جانے کی صورت حال کو سامنے رکھ کر اپنے اکابر کی خدمت میں بصد عز و احترام پیش ہے، اور پھر جو بھی اجماعی فیصلہ ہو عمل تو اسی پر کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات ان حالات کے مقابلے کے لئے جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ علماء کرام کو انگریزی زبان سیکھنے کی طرف توجہ دینی چاہیے، کسی زمانہ میں غاصبانِ ملک اور

دشمنانِ دین کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اسلافِ کرام کو اس سے بُعدِ واجنبیت بلکہ نفرت بھی تھی تو یہ نفرت بے شک وقت کا تقاضہ تھی لیکن آج انگریزی ایک عالمی رابطہ کی اور تمام عصری علوم و فنون کی زبان ہو جانے کی وجہ سے مستحقِ توجہ ہو گئی ہے، بالخصوص ہمارے ملک میں شہروں سے لے کر دیہاتوں تک انگلش میڈیم اسکولوں کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے، جس کی وجہ سے موجودہ نسل یا تو مادری زبانوں میں کمزور ہو گئی ہے، یا پھر انگریزی آمیز زبان استعمال کرنے لگی ہے، اردو تو اب مدارسِ دینیہ کی چہار دیواری میں محصور و محدود ہو کر رہ گئی ہے، خود ملک کا تعلیماتِ مسلم طبقہ بھی اردو ندانی انگریزی دانی کی وجہ سے علماء کے مواضع اور تصنیفات کے استفادہ سے یکسر محروم ہو چکا ہے، جب کہ اسلامی علوم کا بیشتر حصہ اردو زبان میں ہے، جس کا پانچ فی صد بھی ابھی انگریزی میں منتقل نہیں ہوا ہے اور جو ہوا اس میں بھی اہل حق کا حصہ اقلِ قلیل ہے۔ ادھر اسلامی علوم کے انگریزی مصنفین بھی نادر ہیں و النادر کالمعدوم!

گذشتہ سالوں میں جب انگریزی میڈیا کی مہربانی سے آندھرا پردیش پولیس مدارسِ دینیہ میں خواہ مخواہ اور بے جا طور پر مداخلت کر رہی اور اہل مدرسہ کو پریشان کر رہی تھی تو اکابرِ علماءِ ریاست نے ایک متحدہ قوت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ”ریاستی دینی مدارس بورڈ“ کا قیام عمل میں لایا تھا، اس کے بعد مدارس کے داخلی و خارجی سلامتی کے سلسلہ میں بورڈ نے بہت سی مشاورتی نشستیں مختلف لائنوں — پولیس افسروں، قانون دانوں، انکم ٹیکس کے ماہروں اور میڈیا کے ذمہ داروں — کے ہمدرد آفیسرس کے ساتھ منعقد کی تھیں، مجھے یاد ہے کہ ایک نشست انگریزی اخبارات کے مسلم رپورٹرس کے ساتھ بھی ہوئی تھی، ان رپورٹرس سے ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ باوجود دینی ماحول سے علاحدہ نظر آنے کے بھی دل میں غیرتِ قومی و حمیتِ مذہبی کے جذبات رکھتے ہیں، انہوں نے دورانِ گفتگو بتلایا کہ مسلمان انگریزی میڈیا میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں، اس لیے وہ ہر طرح

مغلوب و بے بس ہوتے ہیں، جس مسئلہ کے لیے آپ لوگ اب فکر مند ہوئے ہیں ہم لوگوں نے اس کی فکر اسی وقت کی تھی جب انگلش پریس مدارس کے خلاف مخصوص رنگ اختیار کر رہا تھا، یہ بھی کہا کہ جب ہم لوگوں نے دیکھا کہ انگلش پریس میں ہر دن کوئی نہ کوئی نیوز یا کسی نہ کسی کا مراسلہ مدارس مخالف ضرور چھپ رہا ہے تو اگرچہ ہم مدارس سے بالکل واقف نہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ہمیں اچھا نہ لگا، اس لیے ہم تین چار رپورٹس نے آپس میں مشورہ کر کے ایک آفس بنایا اور ایک آدمی کو تنخواہ دے کر مستقل اس کام پر رکھا کہ وہ اخبارات کا مطالعہ کرے اور مدرسہ مخالف خبروں اور مراسلوں کو جمع کرے، ایک سال میں ایک سو سے زائد مراسلے مدارس مخالف جمع ہوئے، گویا ہر تیسرے دن ایک مرتبہ مدارس کی غلط شبیہ پیش کی گئی، ہم لوگ خود تو جواب نہیں دے سکتے تھے، اس لیے ہم نے فرضی ناموں اور پتوں سے ایسے ہر مراسلے کا جواب جس طرح بھی ہم سے بن پڑا اسلامی ہمدردی کے جذبے سے ان اخبارات کو بھیجا، اُن میں سے تین یا چند (بہر حال دس سے بھی کم) جوابات چھاپے گئے، اور باقی رڈی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے۔ جب ہم نے ان رپورٹس سے معلوم کیا کہ کیا ان اخبارات سے آزادی صحافت اور آزادی اظہار کے حوالہ سے مواخذہ نہیں کیا جاسکتا؟ تو انہوں نے بتلایا کہ بس یہی جواب ملتا ہے کہ اخبار اپنی پالیسی کے خطوط پر چلتا ہے، اسے کسی شخص مراسلے کی اشاعت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کا تجربہ تو خود مسلم اخبارات سے بھی ہمیں خوب ہے کہ فضول و بے ضرورت مضامین چھاپتے رہتے ہیں لیکن بہت مرتبہ ضروری اور اہم مضامین بھی صرف اس لیے نہیں چھاپتے کہ ان کی اپنی پالیسی کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے راقم صرف اس قدر بتلانا چاہتا ہے کہ ہم جو میڈیا پریگٹھ رہے ہیں تو وہ صرف اردو اخبارات سے حاصل شدہ مواد کی بنیاد پر ہے، باقی انگریزی میڈیا کیا کچھ کر رہا ہے وہ علماء امت کے سامنے اکثر نہیں ہوتا۔

ایسے حالات میں پڑھ لکھے مسلمانوں کی اکثریت کے لیے انگریزی لٹریچر اور

انگریزی اخبارات یا نٹ پر موجود نام نہاد اسلامی سائنس کے علاوہ کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ نتیجتاً عوام اور علماء ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں، بلکہ بہت حد تک ہو چکے ہیں، ادھر انگریزی پریس مدارس دینیہ اور علماء کرام کے خلاف جو طوفان بدگمانی برپا کر رہا ہے وہ زخموں پر نمک کا کام کر رہا ہے۔ مزید برآں تمام باطل تحریکیں — قادیانیت، عیسائیت، فتنہ انکار حدیث، جماعت المسلمین اور جانے کیا کیا؟ — اپنی اپنی دعوتوں کی زبان و بیان انگریزی بنا کر عوام مسلمین کو صراطِ مستقیم سے منحرف کر رہی ہیں، یہ لوگ الحاد و الحاد ارتداد کے شکار بھی ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جو ابھی تک ہمارے مدارس کے معاون اور ہمارے اکابر علماء کے خیر خواہ تھے۔ یہ اچھا سلوک ہے کہ وہ تو بے چارے اپنی محنت کی کمائی ہماری محنتوں کی کامیابی پر دل کھول کر لٹاتے رہے اور ہم ان کی زبان و فہم کے مطابق دین نہ پہنچا سکنے کی وجہ سے ان کے دین بلکہ ایمان کے خطرات کی نشاندہی بھی نہ کر سکے، بے شک ہم قوم کے لاکھوں بچوں کو حافظِ قرآن اور عالمِ دین بنانے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں، مگر عالم اگر قوم کی زبان ہی سے بے خبر ہو تو قوم کے حق میں کس کام کا ثابت ہو سکے گا؟ آخر لَیْلَیْنِ لَہُمَہِی کی خاطر تو بندوں کا مالک اپنے رسولوں کو بِلِسَانِ قَوْمِہِ بھیجتا رہا، اور اسی احسان و اہتمام کو ان پر اتمامِ حجت قرار دیا، آج مدارس دینیہ میں نہ علاقائی زبانوں پر توجہ ہے اور نہ ہی عالمی زبان کی جانب کوئی اعتناء ہے، نتیجتاً ہمارے فضلاء اچھے مدرس، اچھے مقرر اور اچھے عالم ہونے کے باوجود مسجد و مدرسہ کے باہر کی دنیا میں اپنا پیغام حق اور اکابر کے مسلک معتدل کو مکما حقہ پہنچا نہیں پارہے ہیں، آج بڑے بڑے علماء اور شیوخ کے بیان میں مجمع تو نظر آتا ہے مگر یہ مجمع ان کے تلامذہ کا اور پہلے ہی سے دین پسند طبقے کا ہوتا ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اب اچھا خاصہ ہے وہ علماء کی بھاری اصطلاحات اور کتابی اردو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اُن نام نہاد اسلامک اسکالرز کے حلقوں اور جلسوں میں بہ صد ذوق و شوق نظر آتا ہے جو کل تک ضرور یا ستِ دین سے بھی نابلد تھے

مگر اب میڈیا کی کرم فرمائی کی بدولت مجتہدِ مطلق اور بڑے بڑے علماء کے ناقد بنے بیٹھے ہیں۔ یہ بے چارے دین کے پیارے محض زبان و بیان کے بھروسے ان جاہلوں کی خود ساختہ تشریحات دین سے متاثر اور ملحد ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار شخصیت کا اعتراف ہے کہ ”میں دنیا بھر کی کانفرنسوں اور طرح طرح کے سمیناروں میں شرکت کیا ہوں، ہر طبقہ کے علماء کو دیکھا سنا ہوں، علم کی جو گہرائی و پختگی علماء دیوبند میں پائی وہ کہیں نہیں دکھائی دی، بس ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ قوم کی زبان میں بات نہیں پہنچا سکتے“ اور جو نام نہاد علماء پہنچا رہے ہیں ان کا علم مستند و معتبر نہیں ہے۔

اس لیے ضرورت ہے کہ تمام مدارسِ دینیہ میں ابتداء ہی سے علاقائی زبان اور انگریزی کو شاملِ نصاب کیا جائے، اور ایسے ادارے بھی ہر ریاست میں قائم کئے جائیں جن میں علماء کی ایک منتخب تعداد کو داخل کر کے ان کے اندران زبانوں میں مہارت اور تقریری و تحریری صلاحیت پیدا کی جاسکے، اس ادارہ کی نوعیت غیر سرکاری اور خالص مذہبی ہو، تاکہ ان خدشات و خطرات سے بھی حفاظت ہو جائے جو سرکاری اداروں میں پڑھنے اور قابلِ ملازمت ڈگریوں کے حاصل کر لینے والوں کے دینی میدانوں سے انحراف، دعوت و تبلیغ سے گریز اور غیر اسلامی فکر و تہذیب کے شکار ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہو کر ہمارے لیے وجہ تشویش و موجب تاسف ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر اکابر کا یہی تلخ تجربہ طلبہ کرام کو اس طرف راغب کرنے سے بچنے کا سبب ہوتا ہے، یعنی غیور و حمیت مند اکابر اپنی محنت اور قوم کے سرمایہ سے تیار اس دینی کھیتی کو غرض مند دنیا کے ہاتھ لگ جانے اور اپنے اور پرائیوٹ کے بگاڑ کا سبب بن جانے کو قطعاً گوارا نہیں فرماتے، لیکن غالب امید ہے کہ اگر اس قسم کے انسٹیٹیوٹ خود اکابر علماء کرام کی نگرانی و سرپرستی میں زبانِ برائے زبان کے منصوبے کے تحت چلائے جائیں اور ساتھ ہی ان کی دینی و فکری تربیت بھی کی جاتی رہے تو انشاء اللہ یہاں کے فارغین خدمتِ دین و مسلمین ہی کا کام سرانجام دیں گے اور حطامِ دنیا ان کی نظر میں خدمتِ

دین و مسلمین کے مقابلہ میں چنداں وقعت کی چیز نہ ہوں گے۔

تیسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ ہر ریاست کے کسی اہم مدرسہ سے اس ریاست کی مقامی زبان میں ایک کم از کم پندرہ روزہ مجلہ نکلنا چاہیے جو منتخب ملکی و عالمی خبروں کے علاوہ اہل حق کی نمائندگی کرنے والے دینی ضروری مسائل پر مشتمل ہو، اس میں اہل حق کے مراکز و مدارس اور علماء کرام کے سلسلہ میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا بھی سخت نوٹ لیا جائے۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند سے جہاں اردو اور عربی کے مجلات صادر ہوتے ہیں وہیں انگریزی کا ایک پندرہ روزہ جریدہ نکالا جائے، جس کا ادبی معیار بھی عمدہ ہو، ہمارے ایک بزرگ پروفیسر ڈاکٹر عبدالجید نظامی صاحب بتلا رہے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تقریباً ہر پروفیسر کے نام لندن سے قادیانیوں کا انگریزی مجلہ پہونچتا ہے، اور وہ لوگ اس کو اہتمام سے پڑھتے ہیں، بعض مسلمانوں کو توجہ دلانے پر انہوں نے جواب دیا کہ ”ان کے مذہب سے ہمیں کوئی تعلق نہیں صرف زبان کے معیار سے استفادہ کرنے کے لیے پڑھتے ہیں“ اس سے معلوم ہوا کہ مضامین اور زبان کا معیار بھی قبولیت میں مؤثر ہوتا ہے۔ ان ہر دور سالوں کے لیے تمام اہل مدارس متفقہ طور پر حلقہ اشاعت کو وسیع تر بنانے اور ہر طبقہ تک پہونچانے کی مخلصانہ سعی کریں۔ اگر دارالعلوم یہ اقدام کرتا ہے تو انشاء اللہ ریاست آندھرا پردیش میں اس کی ممبر سازی اور استفادہ کنندگان کے حلقہ کو وسیع کرنے کی اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر میں ذمہ داری لیتا ہوں، بشرطیکہ یہ کام بہتر معیار پر سرانجام پائے۔

یہ چند تجاویز ہیں جو امت مسلمہ بالخصوص جدید تعلیماتہ طبقے کی فکری الحاد اور ملکی میڈیا کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر ذہن میں آئیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو ہمارے اکابر کی تائید اور اہل خیر کا تعاون ان حضرات کو نصیب ہو جائے جو ان کاموں کی اہلیت رکھتے ہوں اور اگر اس میں خیر نہ ہو تو ان سطور کے راقم کو معاف فرمائے، قارئین کو متاثر ہونے سے بچائے۔ آمین

(اداریہ جون ۲۰۱۰ء)

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یورپ کے لوگ انسانوں کو ڈارون کے عقیدہ کے مطابق ”بندر“ کی نسل سمجھتے ہیں، اتفاق سے ان کے کیلنڈر کی ابتداء بھی اردو تلفظ اور انگریزی لہجے کے مطابق ”جانوری“ ہی سے ہوتی ہے، وہ اگر اپنی تہذیب و ثقافت اور کلچر میں اوّل تا آخر حیوانیت کا مظاہرہ کریں اور اسی کونمایاں مقام دیں، عورتوں مردوں کے محل و عمل میں تفریق نہ کریں، تنگ لباسی، نیم لباسی بلکہ بے لباسی پر فخر کریں، بے حیائی و بے حجابی کو باعثِ افتخار سمجھیں، ہم جنسی وہوس پرستی کو حقِ انسانی و آزادی شمار کریں، سڑکوں بازاروں اور پارکوں میں بے محابا بوس و کنار بلکہ شہوت رانی کرتے پھریں، عریاں تصاویر، عریاں مناظر اور عریاں مجسموں کو اپنے کلچر کا جز بنالیں بلکہ ازراہِ خیر خواہی یا بدخواہی دیگر اقوام کو بھی اسی کلچر اور اسی بہیمانہ تہذیب کا خوگر دیکھنا چاہیں اور ذرائعِ ابلاغ کا بے جا استعمال کر کے اس کی طرف مائل کرنے لگیں اور اس کے نتیجے میں بعض مشرقی اقوام بھی اس جانور پن پر رال ٹپکانے اور ان کا تھوکا ہوا چاٹنے لگیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟

تعجب تو جب ہوتا ہے اور حیرت و غیرت سے زمین میں گڑھ جانے کو جی تب چاہتا ہے جب کہ اپنے کو خلاقِ اکبر کے مبارک ہاتھوں سے پیدا کئے جانے والے ”آدم (عَلَيْهِ السَّلَام)“ کی نسل اور اولوالعزم پیغمبرِ آدم ثانی سیدنا نوح (عَلَيْهِ السَّلَام) کی اولاد تسلیم کرنے والے ہم مسلمان بھی اسی حیوانیت کے رسیا اور اسی جانور پن کے دلدادہ بن کر جینے کی ہوس کرنے لگتے ہیں، آج اکثر مسلم نوجوان جنس بینٹوں میں اگلے پچھلے قابلِ شرم اعضاء کو مٹکاتے اور جانوروں کی

طرح سب کو دکھاتے پھر رہے ہیں، تنگ اتنے کہ جیسے ٹانگوں پر کور چڑھا دیا گیا ہو، سرینوں پر پھول بوٹے گاڑھے جارہے ہیں اور اب تو ایسے جینس آگئے ہیں کہ کمر تک بھی نہیں جاتے آدھی سرین پر ختم ہو جاتے ہیں، جرکنوں پر فلمی ڈیلاگس یا یہودی کمپنیوں کے ایڈورٹائز ہوتے ہیں، یا پھر خوفناک جانوروں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں، لوگ اسی لباس میں کالجوں تھیٹروں میں جارہے ہیں اسی میں بارگاہِ خداوندی میں حاضری دے رہے ہیں، سر سے لے کر پیر تک یورپین کلچر میں ڈوبے ہوئے اور صبح سے شام تک اداکاروں کے ادا و انداز کی نقلوں میں لگے ہوئے ہیں، کسی پہلو اور کسی ادا سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے، نہ تعلیم کا شوق نہ کسی کمال و ہنر کے حاصل کرنے کی فکر، بس موبائیل فون، ہیر و ہونڈ اور کسی سڑک چھاپ لیلیٰ کی محبت کو سرمایہ زندگی بنائے ہوئے ہیں۔ سوائے ان کے جو کسی نہ کسی درجہ میں دین اور دین والوں سے وابستگی رکھے ہوئے ہیں۔ یہی حال مسلم لڑکیوں کا ہے، بلکہ ان کا حال تو دن بہ دن مردوں سے ناگفتہ بہ ہوتا جا رہا ہے، ان کے سر سے ڈوپٹہ تو کبھی کے اتر گیا تھا، اب آستینیں بھی چھوٹی ہوتی ہوتی بالکل ختم ہو گئی ہیں، گریباں بڑے ہوتے ہوتے آدھے سینے اور آدھی پیٹھ تک پہنچ گئے ہیں، کپڑے نفیس و رقیق ہوتے ہوتے جسم کو جھلکانے لگے ہیں، یہ غریب و متوسطین کا حال ہے، متمول طبقے کی بہو بیٹیاں تو جینس اور ٹاپس اور اس کے علاوہ بھی ناقابلِ بیان قسم کے ملبوسات میں کچھ ملبوس کچھ برہنہ بازارِ عشق میں دعوتِ نظارہ دیتے اور دادِ حسن و جمال وصول کرتی پھر رہی ہیں، غیروں کی طرف بلا تکلف مائل ہوتی اور انہیں پوری بے حیائی سے اپنی طرف مائل کرتی ہوئی حدیث کے مطابق جنت کی خوشبو سے محروم اور جہنم کے گڑھوں میں ذلت و رسوائی سے پڑے رہنے کی تیاریاں کر رہی ہیں، یہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے نام پر گھروں سے نکالی گئی ہیں اور ستم یہ ہے کہ ماں باپ کی خوشی و مرضی سے نکالی گئی ہیں، حد یہ ہے کہ غیر لڑکوں کے ساتھ بلا تکلف موٹر سیکلوں پر بیٹھی پارکوں اور ہوٹلوں کی تفریح کا لطف لے رہی ہیں، اور اب تو جگہ جگہ سے یہ اطلاعات ہیں کہ غیر مسلم لڑکوں کا فرش بن کر ان کی نارِ شہوت بچھانے کا سامان

فراہم کر رہی ہیں، ہندوستان تو ہندوستان ہے تقریباً تمام مسلم ملکوں کا یہی حال ہوتا جا رہا ہے کہ اسلامک کلچر اور دینی تہذیب کا جنازہ تو پہلے ہی نکل چکا تھا قومی امتیاز اور وطنی پہچان کی بندشیں بھی ڈھیلی پڑتی جا رہی ہیں، گویا تہذیبی وحدت کا اسرائیلی خواب پورا اور گلوبلائزیشن کی صہیونی تمنا پایہ تکمیل کو پہنچانے میں مسلمان جانے یا انجانے شریک ہیں بلکہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ایسے حالات میں دردمند دلوں اور غیر تمند سینوں کی نگاہ امید مشرقی تہذیب کے احیاء اور مغربی کلچر کے انسداد کے لیے اگر کسی پر اٹھ سکتی تھیں تو وہ مذہب کے متوالوں اور قانون کے رکھ والوں پر اٹھ سکتی تھیں، مگر افسوس! کہ ”جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہو ادینے لگے“ کے مصداق اس وقت دینی رہنماؤں کی صورتحال یہ ہے کہ جو مخلص اور سچی و سانشی راہ اسلام دکھلانے والے علماء ہیں وہ اگرچہ بد تہذیبوں کی اس یلغار پر فریضہ امر و نہی برابر ادا کر رہے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کا مغرب زدہ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے پر کوئی خاص اثر نہیں ہے اور جو ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے، ان کے برخلاف جن نام نہاد اسلامک اسکالروں اور خود ساختہ علماؤں کا اس طبقے پر اثر چلتا بلکہ میڈیائی قوت سے چلایا جاتا ہے وہ قوم کو خالص اسلامی ماحول سے وابستہ کرنے اور مذہبی قدروں کے ساتھ سختی سے جوڑے رکھنے میں سنجیدہ نہیں ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مذہب اسلام میں کسی خاص تہذیب کی پابندی یا ثقافتی امتیاز کے ضروری ہونے ہی کے منکر و مخالف ہیں۔ چنانچہ اپنے سے متاثر طبقہ مسلمین کو متواتر کلچر کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتے، الٹا اپنے قول و عمل سے تہذیبی رعایتوں اور ثقافتی امتیازوں کے مسئلہ کو خاطر میں نہ لانے، اسے گزرے ہوئے زمانہ کی عصبیت جاہلہ سمجھنے اور دقیانوس علماء کی مجذوبانہ بڑ قرار دینے کی ترغیب دیتے اور وقتاً فوقتاً تحریروں و تقریر کے دوران بڑے خوبصورت انداز میں ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

۱۔ ایسا ہوجانے میں کچھ داخلی غامیوں اور بہت کچھ خارجی سازشوں کا دخل ہے جس کی تفصیل مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔

مثال کے طور پر ملک میں جدید تعلیم یافتہ طبقے بالخصوص نوجوانوں میں مقبول اور کثیر الاشاعت ماہنامہ YMD بنگلور کا سوال و جواب والا حصہ پیش کیا جاسکتا ہے، یہ کالم جن صاحب کے ذمہ ہے ان کے تفقہ، اجتہاد اور استنباط احکام کی نظیر ملنی مشکل ہے، ان کے جوابات سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب اسلامی کی اہمیت کو ختم کرنے اور سلف صالحین کے محتاط طرز عمل کو مٹانے اور ایک آزاد اسلامی معاشرہ (لبرل اسلام) بنانے کی گویا مہم لے کر کھڑے ہوئے ہیں، فقہاء اسلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ازلی بیر ہے، اس کے برخلاف قرآن وحدیث کے مطالعہ سے جو ان کے ذہن میں بات آ جائے ان کے نزدیک وہی حجت شرعیہ ہے۔ چند فتاویٰ ملاحظہ ہوں:

☆ عورت کے جینس اور ٹاپس استعمال کرنے کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

”برقعہ کے اندر، گھر کے اندر اور محرموں کے درمیان استعمال کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔“ (ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ)

موصوف نے اس لباس — جس کو ”لباس بے لباسی“ یا ”لباس کے نام پر داغ“ کہنا زیادہ مناسب ہے — کے مذکورہ بالا مواقع میں استعمال کے ممنوع اور بُرائہ ہونے بلکہ بالکل جائز ہونے کی مفصل وکالت کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے:

”زیادہ سے زیادہ اس کے استعمال کو ناپسندیدہ کہا جاسکتا ہے“

جواز کی حمایت و وکالت کے بعد اس نصیحت صوفیانہ کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ موصوف دنیا کے حالات سے ناواقف تو نہیں ہونگے، سائل کے ماحول سے بھی بے خبر نہیں ہونگے، اس وقت جینس اور ٹاپس جو عورتیں پہن رہی ہیں، چاہے برقعے کے اندر چھپا کر ہو یا محرموں کے سامنے دکھا کر وہ عورتیں کس قدر فحش اور شہوت انگیز ماحول بنائی ہوتی ہیں، لباس کے لیے ”شرٹ شلوار“ کی تخصیص نہ کی جائے تب بھی اسلامی تہذیب اور مطالبہ ستر پوشی کی کوئی خصوصیت تو ہونی چاہیے، یہ اسکا لرحصاحب جنس اور ٹاپس جیسے بے ہودہ لباس

کی جس سے لڑکیاں مختلف رنگوں کی جانور نظر آ رہی ہیں — حمایت کرنے کے بجائے شرعی مطالبات کے مطابق ڈھیلے ڈھالے اور شہوت ہوس کو نہ بھڑکانے والے لباس کی طرف کوئی اشارہ تو کرتے! کیا انہیں نہیں معلوم کہ جس لباس کی سائل بات کر رہا ہے اس میں عورتیں سرینیں مٹکاتی، چھاتیاں اور پیٹ اور نیچے تک کا جسم نمایاں کرتی ہوئی ہر طرف گھوم پھر رہی ہیں، اس لباس کی غیر ضروری تحدیدات و تشریحات کے ساتھ حمایت اسلام تو کجا شرافت انسانی بھی نہیں کر سکتی۔ مگر آہ! کیا کیا جائے اس خود سری کو کہ علماء و مفتیوں کو بے وقوف سمجھنے والے یہ اسلامک اسکالرز نہ اسلام کے مزاج سے واقف ہیں نہ تہذیب کی حسد بندیوں سے آشنا اور نہ ہی سلف صالحین کی حزم و احتیاط کے قدرداں! اس لباس کی جو جھلک میں نے دکھائی ہے موصوف بھی غالباً اس کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ اخیر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے صرف اس قدر تنبیہ کی ہے کہ

”ایسے لباس کے ساتھ نامحرموں کے سامنے نہ آنا چاہیے۔“

☆ ٹوپی پہننے اور پتلون ٹخنوں سے اونچا رکھنے کے سلسلہ میں کسی سائل کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

”پتلون کو ٹخنے سے اوپر رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ تکبر کی وجہ سے (پتلون کو) نیچے کرنا یا

اوپر کرنا ممنوع ہے“

اسی سلسلہ میں تکبر کی مذمت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

”کتنے لوگ ایسے ہیں جو شلو اور نصف پنڈلی تک رکھتے ہیں مگر ان کی چال متکبرانہ ہوتی

ہے“ (مئی ۲۰۰۸ء ص: ۸)

غور کیجئے کہ سوال نبی کریم ﷺ کے ایک دائمی عمل کی اہمیت اور گناہِ کبیرہ — جس کے بلا تکبر بھی گناہ ہونے پر محقق علماء کا اتفاق ہے — کی بابت ہے، اور جواب تکبر اور اس سنت پر عمل کرنے والے بعض متکبرین کی مذمت کا دیا جا رہا ہے۔ آخر ان کو پابندِ سنت طبقہ سے کیا عداوت ہے؟ اور انہیں کیسے پتہ چلا کہ اس سنت پر عمل کرنے والے متکبر ہوتے

ہیں، اور فرض کرو کچھ لوگ ایسے ہوں گے بھی تو ان کی وجہ سے سنت کی سنیت و عظمت ختم تو نہیں ہو جائے گی؟

☆ گانے گانے، موسیقی سننے، ڈیانس کرنے، تیرنے، مخلوط طور پر تعلیم حاصل کرنے اور ڈیننگ (متعہ یعنی موقتی نکاح جیسا ایک بہبودہ فیشن) کے بارے میں سائل کے استفسار پر موصوف نے پہلے یہ مختصر جواب دیا ہے:

”سوال میں مذکورہ اعمال میں سے ایک کے علاوہ سب جائز ہیں“

پھر اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

”● گانا انسانی ضرورت اور اظہارِ خوشی کا ایک ذریعہ ہے، ہر شخص صبح کے وقت کچھ نہ کچھ گانا ہی لیتا ہے، صحابہ بھی جنگ کے موقع پر سفر کے دوران گانے گاتے تھے، ● گانے چونکہ میوزک کے ساتھ ہوتے ہیں، اس لیے میوزک بھی جائز ہے، میوزک کی دو قسمیں ہیں، ایک میں لذت ہے دوسری میں نشہ کی سی کیفیت ہوتی ہے، پہلی جائز دوسری ناجائز ہے۔ ● تیرنا اسلام میں پسندیدہ ہے، ہمارے نبی ﷺ نے کسی ہی میں سیکھ لیا تھا۔ عورتیں بھی عورتوں کے ہمراہ تیر سکتی ہیں۔ ● جہاں عورتوں کے لیے علاحدہ کالج کا انتظام نہ ہو وہاں مخلوط تعلیم کی اجازت ہونی چاہیے، البتہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے پارٹیشن کا انتظام ہونا چاہیے، ایسی مخلوط کلاس کو معمر مرد و خواتین مخاطب بھی کر سکتے ہیں۔ ● ڈیننگ کبیرہ گناہ ہے۔ ● ناچنا جو مخلوط طور پر ہو اور جو دائر یا پائپ والے آلات کی دھن پر ہو ممنوع ہے، اس کے بغیر درست ہے، جیسا کہ صوفیاء کے ہاں ہوتا ہے۔“ (اکتوبر ۲۰۰۸ء ص: ۷، ۸)

اس سوال و جواب میں بھی ذرا غور کیجئے کہ سائل نے اپنی اور اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرف سے اپنے ماحول میں رائج ان برائیوں کا شرعی حکم معلوم کیا ہے، موصوف اس کے جواب میں کوشش کر رہے ہیں کہ ان تمام سماجی برائیوں کے لیے گنجائش فراہم کریں۔ جواب دینے والے ”اسلامک اسکالر“ کسی صحرا میں یا آسمانوں میں تو نہیں رہتے ہونگے، انہیں نوجوانوں اور کالج میں زیر تعلیم بچوں کے سوال میں گانوں، میوزک، ڈیانس، سوئمنگ اور کوا بچو کیشن سے کیا مراد ہے خوب معلوم ہوگا۔ مگر وہ کس چالاکی سے غازیانہ نظموں،

سپاہیانہ ترانوں اور فلمی گانوں کو ایک بنا رہے ہیں، موسیقی کے آلات و اثرات کی تفصیل میں بہک رہے ہیں، ڈیانس کو صوفیاء کے وجد پر قیاس کر کے اس کی ہمت افزائی کر رہے ہیں، صحت اور ورزش کے لیے تیراکی خیر اچھی چیز ہے لیکن پوچھنے والے جس قسم کی سوئمنگ کرتے ہیں جواب میں اس کے منکرات سے خبردار کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، ہاں! شارٹ پہن کر تیرنے کے بارے میں اتنا ذکر ضرور کیا ہے کہ ”اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی“۔ مختصر یہ کہ یہ ساری حرکتیں جو سوال میں درج ہیں نو جوانوں میں انتہائی بے ہودگی اور بد اخلاقی کے اسباب بنے ہوئے ہیں لیکن موصوف کے جواب میں کچھ زیادہ قباحت کی بات نہیں ہے، ان کے نزدیک عرفی اور لغوی مصداقوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ سائل کوئی محقق نہیں ہے جو آپ سے تحقیقی کلام کر رہا ہے، وہ سماج کے آزادی پسند نو جوان ہیں جو ان خرافات کا اسلامی و اخلاقی موقف معلوم کر رہے ہیں، یہ اسلامک اسکالر جب فتویٰ نویسی کے احکام و آداب سے تک واقف نہیں ہیں، مزید برآں علماء کو کوتاہ اندیش سمجھتے ہیں تو ان سے ایسے لغو و عامیانہ جواب کے علاوہ توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے؟

☆ ایک انجینئرنگ کا طالب علم کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جانے کے بعد پشیمانی محسوس کرتے ہوئے — کہ ایک مسلمان کو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے — موصوف سے رجوع کر کے پوچھتا ہے کہ کیا ایسی محبت کی گنجائش ہے؟ جواب میں ایک لمبی لن ترانی کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

”(۱) اگر آپ نے اس سے باقاعدہ ملاقات نہیں کی، اتفاقاً نظر آگئی اور آپ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تو اسلامی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے (۲) اور اگر آپ نے کسی لڑکی کو نشانہ بنا کر باقاعدہ ارادہ کر کے اس سے تعلقات و مراسم بڑھانے شروع کئے، اس سے تنہائی میں ملاقات کی پھر اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تو یہ اسلام کے خلاف ہے، (کیونکہ) یہ ناجائز تعلق آگے چل کر آپ کے لیے مصیبت بن سکتا ہے (۳) اگر کسی لڑکی سے آپ کی ملاقات ہوئی، اور وہ متعدد پہلوؤں سے آپ کو بھلی لگی اور آپ نے اسی سے شادی کر لینے کا

ارادہ کر لیا تو ایسے تعلق کو محبت میں مبتلا ہونا ہی نہیں کہتے۔“ (ڈسمبر ۲۰۰۸ء ص: ۸)

تصور کیجئے! آج کے دور کا ماحول ہے، کالج لائف میں ایک ۲۰ سالہ نوجوان کو ایک ۱۸ سالہ لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تو یہ کس قسم کی محبت ہوگی؟ پھر اس کا ضمیر کہہ رہا ہے کہ تو مسلمان ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، اس لیے یہ حرکت تیرے لیے مناسب نہیں ہے، اُدھر نفس کہہ رہا ہے کہ نہیں اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ پاکیزہ محبت ہے، بے حیا رہ طالب علم دین کے علم اور حدودِ شرع سے ناواقف آپ سے اپنے اس عمل کے بارے میں شرعی راہنمائی کا متمنی ہے۔ آپ جواب میں محبت کا فلسفہ بیان کر رہے ہیں اور اس بد اخلاقی کو اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ کم ہمتوں کو بھی ان حرکتوں کی ہمت ہو جائے۔

☆ عمامہ سے متعلق سوال پر کہ آیا نماز میں اس کا اہتمام باعثِ ثواب ہے؟ جواب دیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں:

”بہت سی روایات سے عبادت کے وقت عمامہ کے استعمال کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ تمام روایات ناقدین کے نزدیک درجہِ صحت سے فروتر ہیں“

اس کے بعد حسبِ معمول اپنا عقلی فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”جس زمانہ میں سب مسلمان جھبہ اور شلوار پہنا کرتے تھے اس زمانہ میں علماء عمامہ کو بہ طور امتیاز کے زیب سر کیا کرتے تھے، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ عمامے ختم ہو گئے اور جو عماموں کے نیچے تھا وہی باقی رہ گیا (یعنی سر) اس لیے نہ ٹوپی کو کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی عمامے کو“ (ستمبر ۲۰۰۶ء ص: ۸)

عمامہ باندھنے کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت ہے، اس کا سنت ہونا اہل کو چھوڑیئے عوام الناس میں بھی معروف ہے، بے شک علماء کرام نے اس کا اہتمام کیا مگر موصوف کی یہ تحقیق کہ عوام سے اپنے کو ممتاز رکھنے کے لئے کیا بالکل واقع کے خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ علماء کا یہ اہتمام سنت کی اتباع میں تھا، موصوف نے بڑی چالاکی سے اس سنت کو علماء کی طرف منسوب کر کے وہ بھی کسی عارضی مصلحت کا من گھڑت حوالہ دے کے اس کی سنیت کا تصور ختم

کرنے کی کوشش کی ہے، اس طرح یورپ سے درآمد برہنہ سری کی حوصلہ افزائی کا راستہ ہموار کر لیا۔

☆ داڑھی اور اس کی مقدار کے متعلق متعدد سوالوں کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے:

”ایک طرف یہودی فلسطینیوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں، انہیں فاقوں پر مجبور کر رہے ہیں، افغانیوں پر بے رحمانہ اقتدار جما رہے ہیں، دوسری طرف داڑھی کی مقدار پر بحث ہو رہی ہے“ (مارچ ۲۰۰۸ء ص: ۱۱)

دوسری جگہ:

”داڑھی کے حکم سے متعلق اضطراب پایا جاتا ہے کہ آیا داڑھی کا منڈانا حرام ہے یا مطلقاً حلال ہے“ (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص: ۱۰)

تیسری جگہ ہے:

”داڑھی کی یہ مقدار (کہ ایک مشت ہو) واجب نہیں ہے، البتہ اس قدر رکھنی چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ہو جائے“ (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص: ۱۰)

چوتھی جگہ:

”آپ ﷺ نے مجوسیوں کی مخالفت کے لیے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے، جب کہ نہ بڑھانے پر کوئی وعید بھی نہیں سنائی، اس لیے (یہ حکم آپ کا عارضی تھا یا دائمی؟ اس سلسلہ میں) کوئی دائمی حکم موجود نہیں ہے، آئندہ بھی اس کے حل کی کوئی سبیل نہیں“ (مارچ ۲۰۰۸ء ص: ۱۱)

ایک اور جگہ:

”ہمیشہ درمیانی راہ اچھی راہ ہوا کرتی ہے، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے مٹھی سے داڑھی کو پکڑ کر زائد کو نکال دیا تھا، اس لیے اگر کوئی شخص پوری ہی نکال دے حتیٰ کہ نظر بھی نہ آئے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہونی چاہیے اور نہ اس پر ہونی چاہیے جو ناف تک لمبی کرے۔“ (ایضاً)

ان جوابات میں غور کریں کہ موصوف اسلامی اسکا لرنے داڑھی رکھنے کی کسی بھی طرح

ترغیب نہیں دی بلکہ مکمل صاف کر دینے والے کی تعلیط سے بھی منع کر دیا، جبکہ بیسیوں احادیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں گھٹانے کی بار بار تاکید فرمائی ہے، اور اسی وجہ سے اس کے سنت یا واجب ہونے پر علماء کے اتفاق ہے، لیکن جب وہ علماء کو اپنی تحقیقات کے مقابلے میں کچھ سمجھیں تب ناان کی تحقیق پر غور کریں گے، مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کی بات خدا جانے انہوں نے کہاں سے نکالی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مثلاً پنجاب کے سکھوں کے درمیان رہنے والے مسلمان لازمًا مونڈھ دیا کریں تاکہ مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ہو جائے۔ والعیاذ باللہ من الجہل

☆ ایک خاتون نے معلوم کیا کہ مجھے دور کے رشتہ کے ماموں زاد بھائی سے محبت ہے، ان کا بھی اعتراف ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت ہے، یہ محبت شادی کرنے کے لیے نہیں ہے، ہم بس ایسے ہی دوست بن کر رہنا چاہتے ہیں، ہم لوگ ایک دوسرے سے دور ہیں، تو چیائنگ کے ذریعہ دوستی نبھائے رکھنا شرعاً مناسب ہے یا نہیں؟ جواب ارقام ہے:

”مرد و عورت کا چیائنگ کے ذریعہ رابطہ ناپسندیدہ ہے، اگرچہ نہ ناجائز بھی نہیں، فون یا چیائنگ (صوت و تحریر) کے ذریعہ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ ناپسندیدہ روابط نہیں کہلاتے، بشرطیکہ یہ صرف سائنسی، تکنیکی یا دینی و دعوتی گفتگو پر مشتمل ہو، اور اگر فضول باتوں یا پرسل مسائل سے متعلق ہو تو مطلقاً اجازت دینا مشکل ہے۔“ (اکتوبر ۲۰۰۸ء ص: ۷)

یعنی پہلی صورت میں تو کوئی قباحت ہی نہیں، دوسری میں قدرے تردد ہے، جب کہ نامحرم سے اس قسم کے رابطہ کا مخرب اخلاق اور گناہ کبیرہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ ایک غیر مسلم شریف آدمی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ بالخصوص پوچھنے والی خود وضاحت کر رہی ہے کہ اس تعلق کی بنیاد طرفین سے ایک دوسرے کی محبت پر ہے، کوئی دینی دعوتی تحریک نہیں۔

☆ ایک فیشن ایبل ماحول کے نوجوان نے اپنے ماحول سے متعلق — یہ بتلا کر کہ ہاتھوں میں ”کڑے“ کانوں میں ”رنگس“ پہننے کا اور سر میں ہیروں کی طرح ”لمبے بال“ اور ٹانگوں میں پیٹ پاجامے کے بجائے ”شارٹ“ استعمال کرنے کا عام رواج ہے — شرعی

صورتحال دریافت کی۔ جواب میں موصوف نے لکھا:

”نوجوانوں کا پچھلے لوگوں (یعنی اپنے بڑوں) سے الگ راستہ اختیار کرنا فطری امر ہے، لیکن رنگس اور براس لیٹ کا استعمال فطری نہیں ہے، کیونکہ وہ عورتوں کے لیے ہیں، اس سلسلہ میں معیار نبی کریم ﷺ کے زمانہ کا کلچر ہے جو تکلفات و مصنوعات سے پاک کلچر تھا، شارٹ کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور ممنوع نہیں ہے، البتہ وہ اتنی لمبی ہو کہ گھٹنوں تک پہنچ سکے تاکہ تشہد میں وہ کھلے نہ رہیں، البتہ اندر کے کپڑے ضرور پہنے ہوئے ہونا چاہیے، لمبے بالوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگر داڑھی کے ساتھ ہوں تو ممنوع نہیں ہے، داڑھی منڈانے والے لمبے بال بھی نہ رکھیں۔“ (اکتوبر ۲۰۰۶ء ص: ۷)

بات وہی ہے کہ موصوف کے نزدیک ”دین“ اور ”اسلام“ کی تعریف میں تہذیب کا کوئی دخل نہیں ہے، وہ صرف حلال و حرام کی بات کرتے ہیں کہ یہ کام قطعاً حلال ہے، یہ کام قطعاً حرام نہیں ہے، حالانکہ حضور ﷺ نے وَبَيْنَهُمَا مَنَاشِئَتَانِ فرما کر حلال و حرام کے درمیانی اعمال اور ان کا حکم بھی بتلادیا کہ ”ان کا ترک کر دینا ہی حرام میں گرنے سے بچنے کا ضامن ہے“، مگر ان کی فہم تہذیب اسلامی، غیرت قومی اور امتیاز ملی کے پہلو سے غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے، اس لیے کہ صحت فہم کی نعمت آدمی کو معتبر اساتذہ سے ملتی ہے شخصی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ سائل خود بتلا رہا ہے کہ میں فیشن ایبل محلہ میں رہتا ہوں، اور میرے ماحول کا یہ کلچر ہے، پھر بھی وہ حرام اور ممنوع نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں، شارٹ کے بارے میں کیا اتنا کافی ہے کہ وہ گھٹنے سے نیچا ہوا اور اندر نیکر پہنا ہوا ہو؟ کیا یہ اتنے ڈھیلے نہیں ہوتے کہ موٹر سائیکلوں پر بیٹھے جا رہے ہوتے ہیں تو آدھی ران تک ہوا سے جسم کھلا رہتا ہے؟ کیا آج بھی یہ صرف غیر مسلموں اور فیشن زدہ مسلمانوں ہی کا لباس نہیں ہے؟ پھر بھی موصوف کو تشبہ بالفساق میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ آہ! ایسے ہی اسلام ملک اسکالر کی بدولت یورپ کے ”لبرل اسلام“ کا خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے، سلف صالحین کی روش اور تہذیب اسلامی مٹتی جا رہی ہے، فیاللاسف۔ کاش کہ وہ اپنے ہی قول ”ان امور کے سلسلہ

میں آپ ﷺ کے زمانہ کا کلچر جو تکلف و تصنع سے پاک کلچر تھا معیار ہے، اور اپنے جاری کردہ فتاویٰ کے تضاد و تناقض پر غور کر لیتے۔

یہ چند مثالیں ہیں اور وہ بھی ایک اسلامک میگزین کی ہیں، اس میگزین کی سابقہ بہت سی اشاعتوں میں ایسی بہت سی باتیں ہمارے سامنے آئیں، جن میں غور کرنے سے کسی کی نیت پر حملہ کئے بغیر کہ وہ علیم و خبیر کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ مہم ہے جس کا مقصد اس اسلامی تہذیب کا جس کا علماء امت صدیوں سے تحفظ کرتے آرہے ہیں قلع قمع کر کے ایک ایسا آزادانہ تصور اسلام پیش کیا جائے جو جدید نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی پسند کے موافق ہو اور جو اسلام کے امتیازی تشخص سے گھبرانے والوں کی گھبراہٹ کو کم کر سکے۔ بے شک اس سلسلہ جوابات میں بعض جوابات صحیح بھی ہوتے ہیں، لیکن اکثر مبہم اور مذکورہ بالا انداز کے ہی ہوتے ہیں، اور سب کے سب ”مستند ہے میرا فرمایا ہوا“ کی بدترین مثال ہیں۔

بہر حال یہ ایک مثال اس زمانے کی ناقص دینی راہنمائی کی ہے، ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ میڈیا نے انہیں عوام الناس میں اسلامک اسکالر کی حیثیت سے متعارف کرادیا ہے، یہ لوگ کتاب و سنت کا نام تو لیتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں مگر ان کو سمجھنے کے لئے سلف صالحین اور علماء امت کی ضرورت قطعاً تسلیم نہیں کرتے، اس لئے کہ ایسا کریں تو جدیدیہ کا ان کا منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب عوام الناس کے مقبول راہنما خائن اور تجدد پسند ہوں، اور وہ باقاعدہ طور پر تہذیب اسلامی کو مٹانے کیلئے کمر بستہ ہوں تو معاشرہ کو بے تہذیبی و لادینی کے سیلاب سے کیوں کر بچایا جاسکتا ہے؟

جہاں تک حکمرانوں اور قانون کے رکھ والوں کا تعلق ہے تو اولاً تو وہ عصری تسلیم اور مغربی تہذیب ہی کے پروردہ ہونے کی وجہ سے مذہب کو اقوام عالم کے درمیان صرف تفریق و شناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور تہذیب کو محض علاقائی و جغرافیائی حالات و اثرات کا

نتیجہ قرار دیتے ہیں۔۔۔ جب کہ مذہب اسلام کے حق میں یہ خیال صحیح نہیں ہے، دیگر مذاہب میں ایسا ہو تو ہو، اسلام میں تہذیب مذہب کا جزو لا ینفک ہے جسے کسی قیمت پر مذہب سے جدا کر کے دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔۔۔ ثانیاً امریکہ اسرائیل گٹھ جوڑ کا مشترکہ دباؤ بعض مجبوریوں اور کمزریوں کی وجہ سے دیگر ممالک کی طرح ہمارے ملک پر بھی اس قدر بڑھ گیا اور بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ وہ اپنے داخلی نظام میں بھی ان خود ساختہ آقاؤں کے مطالبات و مقتضیات سے انحراف کی جرأت نہیں کر سکتے، چنانچہ رہ رہ کر مقتنہ اور عدلیہ میں ایسے مسائل اٹھتے رہتے یا اٹھائے جاتے رہتے ہیں جن کی غرض غور کرنے سے بس یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ملک میں نہ مذہب کی اہمیت باقی رہے نہ تہذیب کی خصوصیت قائم رہے۔ مثال کے طور پر:

☆ گذشتہ سال ملک کے وزیر تعلیم نے ”ایڈز“ کے مضر اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے پرائمری اسکول ہی سے جنسیات کی تعلیم کو شامل نصاب کرنے کی سفارش کی تھی۔

☆ ابھی چند دن ہوئے دارالحکومت دہلی کی ہائی کورٹ نے پارلیمنٹ سے سفارش کی تھی کہ ”ہم جنس پرستی“ کو قابلِ تعزیر جرائم سے خارج کر دیا جانا چاہئے، جس کے بعد ملک میں دوڑکوں کے باقاعدہ نکاح کا واقعہ بھی اخبارات کی سرخی بنا۔

☆ ابھی ابھی ملک کی سپریم کورٹ نے رادھا کرشنا باہمی تعلقات سے استنہاد کرتے ہوئے شادی سے قبل مرد و زن کے باہمی تعلقات میں کوئی قباحت نہ ہونے کا اعلان کیا تھا، جس کے بعد چیف منسٹر تامل ناڈو نے بھی اس اعلان کا اعلیٰ الاعلان خیر مقدم کیا، وغیرہ۔

اب جب کہ اسلامی دعوت اور ایمانی انقلاب کے نام نہاد ٹھیکہ داروں کا حال یہ ہے اور ملک اور ملک کی روایات و اقدار کے محافظین کا عالم یہ! تو ہم کس سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ

مشرقی تہذیب و ثقافت پر ہونے والے مغربی کلچر کے ان تابڑ توڑ حملوں کو روکنے میں قدامت پسند روایت پرست — یعنی حقیقت پسند و دیانت پرست — علماء و عوام کی مدد کر کے تہذیب کی کشتی کو بد تہذیبی کے اس بھنور سے نجات دلانے لگے؟

اس موقع پر شیخ سعدی رحمہ اللہ کی بیان فرمودہ ایک حکایت یاد آتی ہے کہ کسی بادشاہ کی صحت خراب ہوئی اور اس قدر بگڑ گئی کہ شفاء کی امید ختم ہو گئی، اطباء اور معالجین نے ہاتھ اٹھائے، کسی نجومی یا عامل نے یہ واحد شکل اس کے سامنے رکھی کہ بادشاہ کی طرف سے ایک صحت مند، خوبصورت اور نوجوان آدمی کی قربانی دی جائے، اس قربانی سے شفا مل سکتی ہے۔ ایک ایسی صفات کے نوجوان کو تلاش کر کے لڑکا ڈھونڈا گیا اور اس کے ماں باپ کو اس کے عوض خطیر رقم کی پیشکش کی گئی، ان غریب لوگوں نے مال کی حرص سے مغلوب اور حکومت کے خوف سے مرعوب ہو کر اپنے بچہ کو فروخت کر دیا۔ جب یہ بچہ دربار میں پیش کیا گیا تو بچے نے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا، بادشاہ نے خلاف توقع اس کیفیت کو دیکھا تو وجہ دریافت کی، لڑکے نے کہا: آدمی کو کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے ماں باپ سے رجوع کرتا ہے کہ وہی اپنے بچے کے لئے سب کچھ قربان کر کے اس کو دکھ درد سے بچایا کرتے ہیں، اگر ماں باپ اس کی مصیبت دور نہ کر سکیں تو وہ عدلیہ کی کنڈی کھٹکھٹاتا اور انصاف کی توقع کرتا ہے، یہاں سے بھی مایوس ہو جاتا ہے تو بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے امیدوار رہتا ہے کہ بادشاہ اپنے اثر و رسوخ اور اختیارِ کامل سے اس کی مصیبت کو دور کر دے گا، مگر میری صورت حال یہ ہے کہ ماں باپ نے مال و دولت کی ہوس میں اپنے لخت جگر کو فروخت کر دیا ہے، ادھر قاضی نے بادشاہ کی خوشنودی کے لئے میرے خون کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے، رہ گیا بادشاہ تو وہ اپنی جان کے تحفظ کے لئے کسی کی بھی جان لینے خود تیار بیٹھا ہے، اب میرے لیے زمین پر کوئی مرکزِ امید نہیں ہے اس لئے آسمان والے سے کہہ رہا ہوں کہ بجز تیرے میرا سہارا کوئی نہیں، بس اب تو ہی رحم فرما! ے

وہ مایوس تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے

جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

ٹھیک یہی صورتحال آج مسلم معاشرہ کی زبوں حالی و بے سہارگی کی ہو گئی ہے۔

اس موقع پر مجھے — اپنے بشمول — تمام خدامِ دین اور امت کے مصلحین سے یہ کہنے دیجئے کہ ہمارے اسلافِ کرام دینِ اسلام کی حفاظت اور امتِ مسلمہ کی صلاح و ہدایت کے واسطے ایسے بے نیاز اور اس قدر صلح شعار و عافیت پسند نہیں واقع ہوئے تھے جیسے ہم لوگ ہو گئے ہیں، نہایت ادب کے ساتھ کشتیِ ملت کے ناخداؤں سے عرض ہے کہ آپ اپنے علاقے کے اطراف و اکناف پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے، ارتداد و الحاد کی تحریکیں کس قدر سرگرم عمل ہیں اور ہم ان کے مقابلے کے لئے کتنے سرگرم ہیں؟ کارکنانِ باطل کی جفاکشی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی، تحریری، تقریری اور تفہیمی مساعی، اپنی دعوت کے فروغ کے لئے ایثار و قربانی بلکہ جانثاری، اپنے امیر و رہبر کی اطاعت و فرمانبرداری، دلائل کی تحقیق و جستجو، مطالعہ و معلومات کا ذوق، بحث و مباحثہ کی جرأت اور سلیقہ، اور ہر دوست، رشتہ دار، ساتھی، پڑوسی کو ہم فکر بنانے کے لیے دن رات جدوجہد، اس کے لئے زبانی طور پر ذہن سازی، لٹریچر کی فراہمی، پروگراموں میں شرکت کی دعوت و اصرار، اپنے اکابر سے ملانے اور متاثر کرنے کی کوشش، اسی طرح محبت و سخاوت اور خلوص و دوستی کا پریشر، اور خدا جانے کتنے جتن ہیں جو الحاد سے لے کر ارتداد تک کے تمام دعاۃ اور ان کے کہول و شباب بلکہ اطفال میں تک دیکھے جا رہے ہیں، ان کی تعریف یا شکوہ تو سب کی زبان پر ہے مگر خود ان صفات سے متصف ہونے کے لئے کوئی آمادہ نہیں، یہ صفات کبھی داعیانِ حق کا امتیاز و نشان تھے مگر اب نہ معلوم ہمیں کیا ہو گیا کہ تن کوئی، نعمت پرستی، آرام پسندی، مطالعہ و تحقیق سے محرومی، جہد و عمل سے دوری، کاہلی و سستی غرض ہر وہ کمزوری و بیماری جو کسی دعوت کے داعی اور میدان کے سپاہی کو زیب نہیں دیتیں بلکہ اس کو مسترد کر دئے جانے کے قابل بنا دیتی ہیں

وہ ہمارے اندر پیدا ہو گئیں اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہیں۔

یہ میں ایک عام صورتحال بالخصوص نوجوان حفاظ علماء وائمہ اور عام دعاۃ اسلام کی بات کر رہا ہوں، — یہ مانتے ہوئے کہ مامن عام الا وخص عنہ البعض — اور اس کی وجہ بظاہر یہ فکری گمراہی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے طبقہ میں طریق کو مقصود بنا لیا گیا ہے اور مقصود کو فراموش کر دیا گیا ہے، مدرسوں کی یہ شکل طریق ہے مقصود علم ہے، نظام و نصاب طریق ہے مقصود تحقیق و استنباط کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، صرف و نحو بلاغت طریق ہیں مقصود کتاب و سنت تک پہنچ سکتا ہے، منطق و فلسفہ طریق ہیں مقصود عقل پرستوں کے ذہنوں سے فکری آلودگی کو ختم کرنا ہے، فقہ طریق ہے مقصود عمل میں مقبولیت کی شان پیدا کرنا ہے، اسی طرح خروج فی سبیل اللہ یعنی جماعتوں میں وقت لگانا طریق ہے مقصود بنیادی دین سیکھ لینا اور مکمل دین سیکھنے کی فکر پیدا کر لینا ہے، گشتیں طریق ہیں مقصود اللہ کے بندوں کی محبت میں ان کی ہدایت و کامیابی کی جدوجہد کرنا ہے، بیعت اور پیری مریدی طریق ہیں مقصود حضوری قلب اور انابت و رجوع الی اللہ کی کیفیت کا حاصل کرنا ہے، ذکر کا مخصوص انداز طریق ہے اور مقصود تعلق مع اللہ اور معیت کی شان پیدا کرنا ہے وغیرہ، مگر آج ان اعمال و اشغال میں مشغول طبقہ کی اکثریت انہی کو مقصود سمجھنے اور ان کے مقصود حقیقی سے چشم پوشی کر لینے کی فکری گمراہی میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص طریق کو مقصود سمجھتا ہے تو طریق باقی رہ جاتا ہے مگر مقصود ہاتھ نہیں لگتا۔

چاہے کوئی کتنا ہی بُرا مانے آج ہم اہل حق کہلائے جانے والوں کی اکثریت کا دین کے تینوں شعبوں — تعلیم، تبلیغ اور سلوک — میں یہی حال ہو گیا ہے کہ بس ہر جگہ ضابطہ کی کاروائی اور خانہ پُری کی فکر ہے، شخصی مفادات و مصالح پر آئینہ نہ آنا چاہیے، قوم کا کچھ بھی بنے۔ یہ صحیح ہے کہ طاقت سے زیادہ کے ہم مکلف نہیں لیکن کیا یہ بھی صحیح ہے کہ ہماری طاقت و استطاعت مکمل لگ رہی ہے اور اس میں کوئی چوری یا کوتاہی نہیں ہو رہی ہے؟ — کسی بندے

کے سامنے نہیں کہ اس کو چکمہ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اللہ علیم وخبیر کے سامنے ہم اپنے ضمیروں سے اس سوال کا جواب طلب کر لیں۔ کاش! کوئی ایسی صورت ہو جاتی کہ ہمارے اندر امت کے فکر و غم اور ذمہ داریوں کے احساس کی ایسی روح پھونک دی جاتی جس سے غفلت و بے حسی کا یہ جمود ٹوٹتا اور اس کی جگہ جہد و عمل کا بازار گرم ہو جاتا، اگر ایسا ہو جائے تو باطل پھر ایک دفعہ اپنی بلوں میں گھس جانے پر مجبور ہوگا اور حق کے مقت بلکہ سے عاجز ہو کر پناہ گاہیں ڈھونڈتا پھرے گا۔ آج جہاں جاؤ ہر خادم دین اور ہر دیندار کو باطل کی سرگرمیوں کا شکوہ کرتے ہوئے سنا جاتا ہے مگر ہم یہ کیوں نہیں سوچ رہے ہیں کہ باطل کا زہوق حق کے اتیان پر موقوف ہے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ارشادِ ربانی ہے اور سر اسر حق ہے۔ اگر باطل جم رہا ہے پل رہا ہے بڑھ رہا ہے سرچڑھ کے بول رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کو اس کے مقابلہ میں جس طرح لانا چاہیے اس طرح لایا نہیں جا رہا ہے، اور یہ صرف اور صرف ہمارا قصور ہے، اس قصور کی تلافی کیے بغیر کامیابی کا خواب دیکھنا یا ناکامی کی شکایتیں کرتے رہنا دونوں عبث ہیں۔ آئیے! ہم سب اہل حق کہلائے جانے والے ارادہ کریں کہ (۱) سب سے پہلے باہمی و نفسانی رنجشوں کا خاتمہ کر کے اتحادِ مسلک و مشرب کی بنیاد پر مضبوط قوت بن جائیں گے۔ (۲) جمود و تعطل یا رسمی حرکت و جہد کو حقیقی محنتوں اور قوم سے واقعی ہمدردیوں میں تبدیل کر دیں گے (۳) قوم کی زبان اور ان کی فہم کے مطابق بات کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے ان کے قلوب تک حق کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کریں گے اور سب سے بڑھ کر (۴) رجوع الی اللہ والی اہل اللہ کے ذریعہ درونِ سینہ کو مجالی اور اخلاق کو اعلیٰ کر کے وہ روحانی قوت پیدا کریں گے جو طاغوت کی ہر قوت اور باطل کے ہر طلسم کو نابود کر کے رکھ دے۔

ہمارے حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ علماء کرام کے سامنے بڑے درد سے حضرت خواجہ صاحبؒ کے یہ اشعار سنایا کرتے تھے:

دل میں لگا کے ان کی لو، کر دے جہاں میں نشروضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو، بزمِ مگر میں روشنی نہیں

اور

رستمِ خفتہ ہے تو، کس بل نہیں کچھ کم ترا
جاگنے کی دیر ہے، پھر وہی ہے دمِ خم ترا
یہ اگر ہو جائے زائل نیند کا عالم ترا
چار سو دنیا میں لہرانے لگے پرچم ترا
اللہ پاک اپنے کرم سے ہمیں احساسِ زیاں اور فکرِ تلافی نصیب فرمائے۔ آمین
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ الْکَرِیْم۔

(اداریہ جولائی ۲۰۱۰ء)

مسلم بھائی بہنوں سے ایک اہم گزارش

قرآن کریم کی تعظیم

برادرانِ اسلام! ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب اور اس کا عظیم الشان کلام ہے۔ کلام کی عظمت متکلم کی عظمت کے مطابق ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ، ارفع اور اکبر ہے اس کا کلام اور اس کی کتاب بھی دنیا کی تمام کتابوں سے زیادہ عظمت و احترام کی مستحق ہے۔ اسی وجہ سے علماء امت نے کلام اللہ شریف کے بہت سے حقوق بتلائے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کے انجام بد سے ڈرایا ہے۔ امام بیہقیؒ نے ”شعب الایمان“ میں قرآن مجید کے پچاس حقوق بیان کئے ہیں، اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ میں اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہونے کا انکار نہیں کرتا جو حقوق سرسری طور پر میرے ذہن میں آگئے وہ لکھ دیا، پھر اس کے بعد ہر حق کے سلسلہ میں اپنی سند سے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہؓ نقل فرمائے ہیں، اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنی عظیم کتاب ہے اور اس کا کس قدر احترام ہم پر لازم ہے۔

انہی حقوق میں ایک اہم حق اس کے ظاہر کا احترام ہے، یعنی کلام اللہ شریف۔ جن اوراق پر لکھا جائے یا چھاپا جائے اُن اوراق اور اس کتاب کی تعظیم اور تنظیف، اسی طرح ہر اس چیز کا احترام جس کی کوئی نسبت اس کتاب مقدس کے ساتھ ہو۔ مثلاً اس کے رکھنے کے لیے صاف ستھرے کپڑے، باکس یا جزدان کا ہونا، اونچی اور قابلِ عزت جگہ پر رکھنا، گرد

وغبار سے محفوظ رکھنا، بنا طہارت اسے نہ چھونا، بے شعور اور نادان بچوں کے ہاتھوں میں نہ دینا، استعمال کرتے وقت خود پاک صاف ہونا اور جس جگہ پڑھا جائے اس کا بھی پاک صاف ہونا، اس کے پڑھنے سے قبل خوشبو کا استعمال کرنا، اس کے مستعملہ اور پھٹے ہوئے پرزوں کو بھی باعزت اور محفوظ جگہ پر رکھنا، اس کو ایسی جگہوں اور تحریروں میں نہ لکھنا جس کی حفاظت نہ ہونے یا ضائع ہو جانے کا قوی امکان ہو وغیرہ۔

ذیل میں اس سلسلہ کی چند ہدایات نقل کی جا رہی ہیں جن کو پڑھ کر مسترآن کریم کی عظمت و احترام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

✽ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ”قرآن مجید محفوظ کتاب میں ہے اسے پاک لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں چھوتا“ جب قرآن مجید آسمانوں کے اوپر بھی محفوظ کتاب میں رکھا گیا ہے اور پاک لوگوں یعنی فرشتوں کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا جب کہ وہاں رہتے ہی سب فرشتے ہیں، تو پھر اس دنیا میں بھی اس کو پاکیزہ مقام پر رکھنے اور پاکیزہ طریقے پر استعمال کرنے کی بدرجہ اولیٰ ضرورت ہے، اس لیے کہ یہاں کے حالات اور یہاں کے افراد پاک بھی ہوتے ہیں اور ناپاک بھی۔ یہ آیت شریفہ تبارہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب اپنے کلام کی حفاظت اور استعمال کرنے والوں کی طہارت کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے تو اس کے بندوں کو بھی اپنے رب کے کلام کی عظمت و احترام کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔

✽ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”دشمنوں کے علاقہ میں قرآن لے کر مت جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے ہاتھ لگ جائے“، یعنی کہیں وہ اس کی بے ادبی نہ کر بیٹھیں اور تم اس کا سبب بن جاؤ۔ سو چنا چاہئے کہ جب بے ایمانوں کی توہین سے کلام اللہ شریف کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو خود مسلمانوں کو اس کے احترام کرنے اور ہر طرح کی توہین و استخفاف سے بچنے کی کس قدر تاکید ہوگی، اور اس کی خلاف ورزی کتنا بڑا جرم ہوگا؟

✽ نبی کریم ﷺ کو ایک شخص نے پیشاب کرتے وقت سلام کیا، آپ نے جواب نہیں

دیا۔ بعد میں اس شخص سے فرمایا ”ایسی حالت میں سلام مت کیا کرو، اور اگر تم کرو گے تو میں جواب نہیں دوں گا“ غور کرنا چاہئے کہ سلام میں اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ہونے کی وجہ سے اس کا اس قدر احترام کر کے دکھلایا گیا ہے تو قرآن مجید جو مکمل کلام الہی ہے نبی کریم ﷺ کے نزدیک اس کی عزت و توقیر کس قدر ضروری چیز ہوگی؟

ﷺ نبی کریم ﷺ جب تہجد کا ارادہ فرماتے تو مسواک رگڑ کر دانت صاف فرماتے تھے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل نماز اور تلاوت قرآن کے احترام ہی میں تھا۔ حضرت علیؓ نے ایک کاتب قرآن سے فرمایا ”جلی اور واضح خط میں لکھو، اس کی تحریر روشن رکھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو روشن کتاب بنایا ہے“ یعنی اس کی معنوی و حقیقی مرتبے کا تقاضہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہونا چاہئے۔

ﷺ بشر بن حارثؓ ایک بزرگ گذرے ہیں، وہ پہلے بدقت اشش آدمی تھے، ان کی ہدایت کا سبب قرآن کریم کے احترام ہی کا ایک واقعہ بنا۔ انہیں ایک مرتبہ کاغذ کا ایک پرزہ زمین پر پڑا ہوا ملا جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا، انہیں کلام اللہ کی یہ توہین بہت گراں گذری، انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر حیرت سے کہا: میرے آقا! آپ اتنے بلند ہیں اور آپ کا نام نامی یہاں زمین پر پڑا ہوا ہے؟ پھر اس پرزے کو اٹھا کر صاف کیا، عطار کے پاس جا کر سب سے قیمتی عطر خریدا، اس پرزے کو اس عطر میں بسایا اور اپنے گھر کی دیوار کے دراڑ میں اونچی جگہ محفوظ کر دیا۔ کلام اللہ کے اس احترام کی برکت سے ان کے دل کی دنیا بدل دی گئی، وہاں سے سیدھے اس وقت کے ایک اللہ والے بزرگ کی مجلس میں پہنچے، ان بزرگ نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا: تم نے ان دنوں کیا خاص عمل کیا ہے مجھے بتلاؤ؟، اور اپنا خواب سنایا کہ رات میں نے خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے ”بشر سے کہہ دو کہ اس نے ہمارے نام کا احترام کیا ہے ہم اس کو ذلیل ہونے نہیں دیں گے، نہ دنیا میں نہ آخرت میں“

✽ حضرت تمیم داریؓ جب تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو احترام قرآن میں نہایت قیمتی چادر اوڑھتے تھے۔

✽ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں جب سے میں نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا ہے لہسن نہیں کھایا۔

✽ حضرت عطاءؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم قرآن پڑھ رہے ہو اس وقت کسی کی ریح خارج ہوگئی یا کہیں سے بدبو آنے لگے تو بدبو ختم ہونے تک تلاوت موقوف کر دو۔

✽ جنبی اور حائضہ کو غسل کرنے تک قرآن مجید پڑھنے کی بھی اجازت نہیں حالانکہ اس کی وجہ سے منہ میں کوئی ظاہری گندگی اور بدبو نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب معنوی وحکمی ناپاکی کے ہوتے ہوئے یہ حکم ہے تو ظاہری گندگی کیسے برداشت ہو سکتی ہے؟ (تمام روایات ”شعب الایمان“ جلد اول کی فصل آداب القرآن سے لی گئی ہیں)

یہ چند باتیں اس مختصر مضمون میں بطور نمونہ لکھی گئی ہیں، اگر سلف صالحین کے قرآن مجید کے ساتھ طرز عمل کے واقعات اور اس کی ظاہری و معنوی تعظیم کی مثالیں نقل کی جائیں تو ایک مستقل مضمون ہو جائے گا، جو اس وقت مقصود نہیں۔ ہمارے اسلاف کرام کا حال تو یہ تھا کہ قرآن شریف تو بہت بڑی کتاب ہے دین کے علم کی نسبت سے ہر آلہ علم کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

کیا یہ ظلم عظیم نہیں؟

اس کے برخلاف آج کل بہت افسوس اور دکھ کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ہم مسلمانوں میں قرآن کریم کا جیسا ادب ہونا چاہئے ویسا نہ رہا، دن بدن اس اہم مسئلہ کی طرف سے غفلت ہوتی جا رہی ہے۔ جیسا ہونا چاہئے ویسا ادب تو ہم کیا کرتے ضروری اور عقل کے نزدیک مسلم احترام بھی ہم نہیں کر پارہے ہیں، آج ہمارے گھروں میں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے گھروں (مسجدوں) میں بھی اکثر قرآن مجید کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کا اتنا

خیال بھی نہیں رکھا جاتا جتنا۔۔۔ اللہ پاک معاف فرمائے۔۔۔ اپنے جوتوں چپلوں کی صفائی اور پالش کا خیال رکھا جاتا ہے، کم از کم دو چار دن میں ایک مرتبہ تو ضرور جوتے کی پالش کر لی جاتی ہے، فرش جھاڑا جاتا ہے، پونچا لگایا جاتا ہے، گھر میں رکھے ہوئے پودے صاف کئے جاتے ہیں، دروازوں کھڑکیوں صوفوں کے کور بدلے جاتے ہیں، شوکیسوں اور ان میں رکھی ہوئی اشیاء زینت کی صفائی کی جاتی ہے، گھر میں کوئی چیز ایسی ہے جس کو وقفہ وقفہ سے صاف نہیں کیا جاتا سو اے کلام اللہ شریف کے؟ کہ وہ جہاں رکھ دی جاتی ہے مہینوں بلکہ بسا اوقات برسوں پڑی رہتی ہے، گرد و غبار جم جاتی ہے، جلدیں سوکھ کر ٹوٹ جاتی ہیں، مگر ہمیں اس کی طرف کوئی دھیان اور توجہ بھی نہیں ہوتی۔ یہی حال ہماری اکثر مساجد کا ہے جن میں آج کل مصلیوں کے لیے ہر سہولت فراہم ہے، ان کی ایک سے ایک شاندار عمارت بن رہی ہیں، لیکن اکثر مساجد میں قرآن مجید کی خدمت کا انتظام نہیں ہے، طہارت خانوں سے لے کر جماعت خانے تک، جوتوں کے اسٹانڈ سے لے کر نماز کی صفوں تک۔۔۔ شاندار اور صاف ستھرا انتظام ہو رہا ہے، ان کی صفائی اور جھاڑو جھٹکے کے لیے افراد مقرر ہیں، بجلی، پانی، فنانیل، آئیسڈ اور اگر بیٹوں کے اخراجات منظور ہو رہے ہیں، مچلی قالین بچھ رہی ہیں، قیمتی پائیدان ہیں، بیماروں کے لیے کرسیاں ہیں۔ یہ سب بندوں کی راحت اور سہولت کے لئے ہے، لیکن اللہ کے کلام کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں، ان کے سیلفوں میں گرد جمی رہتی ہے، پاروں کے سیٹ رکھے رکھے خراب ہوتے رہتے ہیں، پرانی کلام پاک کھلی رکھی رہتی ہیں، ان کے صفحات ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر ادھر ہوتے جاتے ہیں، نئی کلام پاکوں کو بھی جز دان نہیں، ان کے رکھنے کے لئے رحل کا انتظام نہیں، ان کے صاف ستھرا رکھنے پر کوئی مامور نہیں۔ آپ ہی سوچئے کہ کلام اللہ شریف کے ساتھ ہمارا یہ طرز عمل کس قدر افسوسناک ہے۔ اب تو یہاں تک دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کلام الہی کی آیات شادی کے رقعوں، نام رکھائی کے کارڈوں اور دیواری پوسٹروں پر تک چھاپے جا رہے ہیں، جن کی حفاظت اور

احترام کی کوئی صورت ہی نہیں، رقعے پڑھنے کے بعد ادھر ادھر ڈال دئے جاتے ہیں اور پوسٹرز جھڑکراور پھٹ کر ہواؤں کے حوالے ہو جاتے ہیں، کیا یہ معمولی گناہ ہے؟ کیا یہ قرآن عظیم پر ظلم نہیں؟

آئیے! آج عہد کریں کہ اپنا فریضہ اور کلام الہی کے احترام کا حق سمجھ کر اپنے گھروں اور مسجدوں میں اس منکر کی اصلاح کی ابھی سے فکر شروع کر دیں گے، اور ایک دوسرے کو حکمت سے توجہ دلاتے رہیں گے۔ اللہ پاک ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے، آمین

(اداریہ ستمبر ۲۰۱۰ء)

بابری مسجد قضیہ کا فیصلہ

بابری مسجد سن ۱۵۲۸ء میں عہدِ بابری میں تعمیر ہوئی، چار سو اکیس سال کے بعد سن ۱۹۴۹ء کے دوران ایک سازش کے تحت مسجد کے اندرونی حصے سے مورتیاں برآمد ہوئیں، جس پر دونوں فریق ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی، ہندوؤں کا کہنا تھا کہ یہ قدرتی طور پر رام کا اس جگہ اپنی موجودگی کا اظہار ہے، مسلمانوں کا ماننا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مسجد کے اندر مورتیوں کو رکھ کر قصدِ ایہ معمرہ بنایا گیا ہے۔ بہر حال دونوں فریق عدالت سے رجوع ہوئے اور اپنے اپنے حق کے لئے دعوے دائر کر دئے، ادھر صورتحال کو مزید کشیدگی سے بچانے کے لئے حکومتِ وقت نے اس مسجد کو متنازعہ جگہ قرار دے کر اس کو تالا لگا دیا، ایک سال بعد ان برآمد شدہ مورتیوں کی جو مسجد ہی میں رکھ چھوڑی گئی تھیں وہیں رکھتے ہوئے ہندوؤں کو پوجا کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سن ۱۹۸۶ء میں ایک مقامی عدالت نے پوجا کرنے والوں کے لیے باب الداخلہ کھول دینے کے باقاعدہ احکامات جاری کئے، اس کے بعد سے مسلمانوں پر پابندیاں سخت سے سخت اور ہندوؤں کے لئے کم اور نرم ہوتی چلی گئیں، دریں اثنا وشنو ہندو پریشداس پر قبضہ اور ہندو مراسم کی ادائیگی کے لیے کچھ نہ کچھ اقدامات کرتی رہی، سیاسی طور پر اقتدار سے مایوس بی جے پی نے بھی اس مندر کی تعمیر کے مسئلہ کو اپنے ایجنڈہ میں شامل کر کے اس کو سیاسی قوت بہم پہنچانا اور اس اشو کے ذریعے اپنا وجود مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو شیلانیاس کے بہانے جمع

ہونے والے لاکھوں ہندوؤں کے ساتھ وی ایچ پی کے کارسیو کوں نے پولیس اور نیم فوجی فورسیس کی موجودگی بلکہ تحفظ کے درمیان اس عظیم الشان تاریخی مسجد کی عمارت کو گھنٹوں کی کوششوں کے بعد شہید کر دیا، اس طرح شدہ شدہ اس مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ مکمل کر لیا۔ رات دیر گئے اس وقت کی مرکزی سرکار کے وزیراعظم نرسمہا راؤ نے ایک تعزیتی بیان بڑی اداکاری کے ساتھ اپنے کو معصوم و بے قصور اور قوم کے دکھ میں شریک قرار دیتے ہوئے جاری کیا، اور مسلمانوں سے صبر و تحمل سے اس غم کو گوارا کر لینے کی اپیل کی۔

اس واقعہ کو جس طرح میڈیا نے اچھالا اور ٹی وی پر وقفہ وقفہ سے دُہرا کر پیش کیا گیا، اُس سے مسلمانوں کے جذبات بجا اور فطری طور پر مشتعل ہوتے رہے اور ردِ عمل میں ملک گیر فسادات کا سلسلہ چل پڑا۔ ہر چند بزرگ قیادتوں نے مسلمانوں کے جذبات قابو میں رکھنے کی کوشش کی مگر ایک طرف اس دلخراش و دل آزار مناظر کے غضبناک اثرات دوسری طرف جذباتی اور وقتی قیادتوں کی غیر معتدل و نامناسب تقاریر نے اس سلسلہ کو اور زیادہ مہلک و خطرناک بنا دیا، اس موقع پر پولیس اور انتظامیہ نے بھی کوئی بہتر کردار ادا نہیں کیا، اگر وہ چاہتے تو حالات بد سے بدتر نہ ہوتے۔ بہر حال دن دھاڑے کسی عبادت خانہ کو شہید کرنے والے مجرموں اور ظالموں کا معاملہ تو عدالت کے حوالے کر کے سرد خانے میں ڈال دیا گیا مگر مظلوم اور اپنی حق تلفی پر احتجاج کرنے والے مسلم نوجوانوں کو ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کر کے اُس وقت کے سیاہ قانون ٹاڈا کے تحت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا، جو برہما برس سے اسی میں سڑ مر رہے ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے اس حادثے کو ۱۸ سال گزر گئے، ہر سال ۶ دسمبر کو جذباتی مسلمان یوم سیاہ مناتے ہیں اور متعصب ہندو یوم فتح! حقیقت میں دیکھا جائے تو عام مسلمانوں کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی رہی نہ ہندوؤں کو، قانون کی لڑائی عدالت میں لڑی جا رہی تھی اور فریقین کی نام نہاد قیادتوں میں جس کے پاس اپنی قیادت کی بقا کے لئے کوئی

بنیادی اشوز نہیں تھے وہ اسے اپنا اشوبنا رہے تھے۔ اب اٹھارہ سال بعد دو تین مہینے قبل ہی سے یہ اطلاعات منظر عام پر آئے لگیں کہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۰ء کو الہ آباد ہائی کورٹ اس مقدمے میں ملکیت کا فیصلہ — جو بہت پہلے ہی کر کے محفوظ کر لیا گیا تھا — جاری کرنے والی ہے، درمیان میں اسے مؤخر کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کی گئی۔ بالآخر سپریم کورٹ نے ۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو دو پہر تین بج کر تیس منٹ پر اس فیصلے کو جاری کر دینے کی ہدایت دی۔ پورے ملک میں درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے بڑی تعداد میں پولیس فورس اور نیم فوجی دستے تعینات کر دئے گئے، فریقین کی قیادتوں اور تنظیموں سے عدالت کے فیصلہ کو قبول کر لینے اور امن و امان قائم رکھنے کے بار بار اعلانات کروائے گئے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گھڑی آئی اور عدالت نے تین ججوں پر مشتمل خصوصی بنچ کا — ایک کے مقابلے میں دو کی اکثریت سے کیا گیا — فیصلہ جاری کر دیا۔ تفصیل تو فوراً سامنے نہیں آ سکتی تھی جو خلاصہ سامنے آیا وہ بہر حال مسلمانوں کے اور شاید ہندوؤں کے بھی توقع کے برخلاف اور مایوس کن رہا۔ متنازع فیہ جگہ جو اصل مدعا ہے اس کا حقدار غیر مسلموں کو مقرر دے دیا گیا۔ بقیہ جگہ کے حصے بخرے کر کے دونوں کے درمیان تقسیم کر دئے گئے، ساتھ ہی سپریم کورٹ سے رجوع ہونے کے لئے تین ماہ کا وقت دیا گیا ہے، ذمہ دار حضرات تمام پہلوؤں سے غور کر رہے ہیں کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ ان کے قلوب میں بہتر شکل الہام فرمائے۔ آمین

گذشتہ ساٹھ سالوں سے چلتے ہوئے اس مقدمہ میں بالخصوص مسجد کی شہادت کے بعد جو تیزی اور سرگرمی آئی اس میں ہونے والے مباحث اور داخل کی جانے والی شہادتوں کی روشنی میں یہ بات تو طے ہے کہ ہندو فریق کمزور اور مسلمان فریق مضبوط نظر آتا رہا، اسی وجہ سے فیصلے کے بارے میں دونوں فریق اسی کی روشنی میں امید یا اندیشہ رکھے ہوئے تھے، تاہم جو فیصلہ آیا وہ دونوں فریق کے تصور کے خلاف تھا، اس لیے ایک فریق کا مسرور

دوسرے کامایوس ہونا فطری امر ہے، لیکن الحمد للہ مسلمانوں نے اس صبر آزمائگی میں بہت ہی صبر و تحمل اور وقار سے کام لیا، تاہنوز امن و امان ہی کی اطلاع ہے، خدا کرے کہ آئندہ بھی رہے۔

مجھے یاد ہے کہ کافی عرصہ قبل میں حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری رحمہ اللہ کی ملاقات کے لئے راندر گیا ہوا تھا، اتفاق سے وہ ۶ دسمبر کا دن تھا، مغرب کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی، بہت نحیف ہو چکے تھے، ایک جھولے نما چارپائی میں لٹائے کے اندر پڑے ہوئے تھے، عمر سو سے متجاوز ہو چکی تھی، ایک مفتی صاحب کو کسی فتویٰ کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دینے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے، خیر خیریت دریافت کی اور وطن معلوم کیا، جب میں نے حیدر آباد کا نام لیا تو فوراً کہا کہ آپ کے حیدر آباد میں آج ”بابری مسجد“ کی گئی ہے، اس میں گڑ بڑ ہوئی اور پولیس کی گولی سے ایک نوجوان کی جان بھی چلی گئی، یہ کون لوگ ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ فائدہ کیا ہے؟ ایک مسلمان کی جان کا اللہ تعالیٰ کے پاس کون جواب دہ ہے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ وہ تنظیم جو اس بے اثر و بے فائدہ جلوس کا اہتمام کرتی ہے عند اللہ اس جان کی وہی ذمہ دار ہے!

خیر! یہ بات تو مجھے ابھی اچانک یاد آگئی تو نقل کر دی کہ قارئین کے علم میں رہے اور سمجھ میں آئے کہ آج کل بعض قیادتیں قرآن و حدیث کے حوالے سے نوجوانوں کے جو جذبات بنا رہی ہیں اس میں بڑوں کے تجربات، علماء کی تحقیقات اور عالمی و ملکی حالات کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ بے موقع و بے مصرف جانوں، مالوں اور کاروبار کا ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے، دین کا ہو یا دنیا کا کوئی کاروبار امن کے بغیر ممکن نہیں ہے، حالات بگڑتے ہیں تو جانوں کا اتلاف اور کاروبار کا ضیاع تو ہوتا ہی ہے، مسجدوں کی آبادی، مدرسوں کی سرگرمی، دعوت و تبلیغ کی جدوجہد اور سماجی و امدادی خدمات سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں اور نتیجہ صفر!۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بزدل و عشرت پسند

ہونا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ بہادری اور بے وقوفی کے فرق کو سمجھ کر کام کرنا چاہیے، وقت پر جان و مال کا ایثار عزیمت و بہادری ہے اور بے وقت ان کا ضیاع حماقت و بے وقوفی ہے، اللہ پاک — ناعاقبت اندیش قیادت سے ملتِ اسلامیہ بالخصوص نوجوانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

آخری بات جو اس وقت عرض کرنے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ ملت کو نمازی بنانے کی جدوجہد کی جائے، کوئی مسجد ویران نہ ہو، رمضان اور ہفتہ واری نمازیوں کو پنجوقتہ نمازی بنانے کی جدوجہد اور بے نمازیوں کو نماز کی طرف لانے کی فکر ہر مسلمان اپنی ذمہ داری سمجھے، اگر ہر مسجد اذان و نماز سے آباد رہے تو یہ نوبت ہی نہ آئے۔ مثل مشہور ہے ”خانہ حسالی را دیوان می گیرند“۔ اگر اذان و نماز کا سلسلہ جاری رہے تو نہ مسجدیں ویران ہوں گی نہ ان میں مورتی بٹھانے کی کسی کو جرأت ہو سکے گی۔ ہر نمازی اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کو نمازی بنالینے کی کوشش کر لے تو دیکھتے دیکھتے نمازیوں کی تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی، حق تعالیٰ سے تعلق بھی مضبوط ہوگا، ایمان بھی پختہ ہوگا، نصرتوں کے دروازے کھلیں گے اور انشاء اللہ نماز باجماعت کا یہ نظام معجزہ اسلام بن کر ایک طرف باہمی اعتماد و اتحاد میں اضافہ کرے گا تو دوسری جانب دشمنان اسلام کی نیند خراب اور ان کے منصوبے خاک میں ملادے گا۔ نصرت الہی ایمان والوں کے لئے موعود ہے اور ایمان بغیر نماز کے ناقص و کمزور ہے، اس لیے سب مسلمان اس کوتاہی کی تلافی کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ اکابر علماء کرام، مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند جیسی مؤثر قیادتیں قومی ملی و ملکی مسائل میں ہماری جو راہنمائی کریں تو اس کی تعمیل کے لئے قوت متحدہ بن کر آگے آئیں اور ایثار و قربانی کی مثال بن جائیں۔

اللہ تعالیٰ تمام عالم بالخصوص مسلمانان ہند کی بھرپور حفاظت فرمائے اور ہم سب کو بہ حیثیت مسلمان اپنے فرائض کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (اداریہ، اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اگر ایسا نہ کرو گے تو.....

آج کل مسلم معاشرہ کا حال ناگفتہ بہ ہو گیا ہے، نوجوانوں میں اخلاقی بے اعتدالی روز افزوں ہے، کالج کلچر کے بہانے سے لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط فیشن بن گیا ہے، نوجوان لڑکیوں کا غیر محرم لڑکوں کے ہمراہ ہنسی مذاق کرنا، بے تکلفی برتنا، ان کے ساتھ پکنک کے لیے جانا اور موٹر سائیکلوں پر گھومنا جیسی فحش حرکتیں عام ہوتی جا رہی ہیں، ستم یہ کہ ان حرکتوں کو نہ ماں باپ بڑی بات سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی کالج کے اساتذہ و منتظمین معیوب قرار دے رہے ہیں، حد یہ ہے کہ اب مرد و زن کے اس اختلاط میں دین و مذہب کی رعایت بھی حسم ہوتی جا رہی ہے، بلا لحاظ مذہب معاشرے جاتی ہیں۔

ستم یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ملنے والی اطلاعات کے مطابق مسلم لڑکیاں زیادہ فراخ دل اور کشادہ ذہن ثابت ہو رہی ہیں، بلا جھجک غیر مسلم نوجوانوں کے بہکاوے میں آ کر ان کے ہمراہ راہ فرار اختیار کرنے کے واقعات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، شہر تو شہر قصبوں اور دیہاتوں میں یہی صورتحال دکھائی دے رہی ہے۔ ایک قصبے کے نوجوانوں نے مجھے بتلایا کہ ہم لوگ ہر دوسرے تیسرے روز کسی مسلم لڑکی کو کسی غیر مسلم کے ساتھ تعلقات میں پکڑ لیتے ہیں، ایک دیہات میں خاندان کے افراد نے باقاعدہ مندر میں لے جا کر مسلم بچی کو غیر مسلم سے بیاہ دیا اور بخوشی رخصتی کرادی، ایک علاقہ میں اطلاع ملی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلم لڑکی نے ایک چرواہے کے ساتھ مبینہ ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں، ماں باپ کے پولیس میں شکایت کرانے پر لڑکی نے خود پہونچ کر بیان دیا کہ میں اس شخص کے ساتھ اپنی

خوشی سے ہوں۔ ایک اچھے گھرانے کی طالبہ کے متعلق معلوم ہوا کہ جس آٹو سے وہ دینی مدرسہ جایا کرتی تھی اس کے غیر مسلم ڈرائیور کے ساتھ باقاعدہ جنسی تعلقات قائم ہیں، جب کہ وہ ڈرائیور ہندوؤں کی بھی نجلی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلم لڑکیوں کو جھانسنہ دے کر نواحی علاقوں میں لے جا کر اجتماعی بدکاری کے بعد وہیں قتل کر کے پھینک دینے کے واقعات بھی اس مہینے کے دوران دو مرتبہ اخبار میں نظر سے گذرے، اور یہ تو اگا دگا واقعات ہیں جو اس وقت ذہن میں آگئے، ورنہ خدا جانے ایسے کتنے واقعات ہوں گے جو منظر عام پر نہیں آتے۔ ایک ضلع میں وہاں کے ثقہ عالم دین نے بتلایا کہ صرف مستقر کے پولیس اسٹیشن میں تقریباً ۶۰ شکایات اس سال کے دوران ایسی درج ہوئی ہیں جن پر کیس بک ہو سکا، ورنہ جو شکایات خارج ہو گئیں یا رفع دفع کر دی گئیں ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتحال کی محرکات کیا ہیں؟ اور کیوں اس تیزی سے اسلامی معاشرہ روبہ زوال ہوتا جا رہا ہے؟ غور کرنے سے آپ کو درج ذیل وجوہات کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔

۱) مسلم گھرانوں میں اسلامی تعلیم و تربیت کا فقدان

ایسا نہیں ہے کہ مسلمان اپنی اولاد کی اسلامی تعلیم و تربیت میں صرف کوتاہی کے مجرم ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب مسلم گھرانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جہاں اسلام اور اس کی تہذیب و تعلیم کا کبھی ذکر مذاکرہ تک نہیں ہوتا، اس کے برخلاف ان کے ہاں ہر وقت کا من کلچر اور مشترک تہذیب کے گن گائے جاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بچے اسلام، اسلامی تعلیمات اور اسلامی شخصیات سے بالکل بے خبر اور نابلد ہوں گے تو انہیں اپنی کسی حرکت سے عقیدہ و عمل کی شناخت کے متاثر ہونے کا کیا غم ہوگا؟

۲) آلات جدیدہ کا آزادانہ استعمال

مسلم گھرانوں میں اب تک ٹی وی کے مضر اثرات ہی کارونما تھا، اب موبائیل فونس،

سی ڈیز اور انٹرنیٹ کا بے باکانہ اور آزادانہ استعمال عام ہو گیا ہے، موبائیل فون میں ہر طرح کے فحش مناظر دیکھنے، ہر قسم کی موسیقی سننے اور ہر کسی سے روابط بنالینے کی جو سہولت ہو گئی ہے اس نے اچھے اچھے شریف اور دین پسند گھرانوں کے ماحول میں مغربی تہذیب کے جراثیم پھیلا دئے اور غیر شریفانہ زندگی کی ہوس پیدا کر دی ہے۔

۳) گھروں میں لباس کے اسلامی آداب کا ختم ہو جانا

جب تک مسلمان مذہبی وقوی شناخت کو اہمیت دیتے رہے اس وقت تک مسلمانوں کا لباس بھی سائر اور مہذب تھا لیکن جب سے تیار ملبوسات کے استعمال کا رواج ہو گیا ہے، ہم مسلمان بھی دوسروں کے مسلط کردہ طرز کے پابند ہو گئے ہیں، اس شہوت انگیز اور حیا سوز لباس کا ایک طرف یہ نقصان ہوا کہ تہذیبی شناخت سے ہم محروم ہو گئے تو دوسری جانب خاندان کے باہمی تعلقات کے حدود اور رشتوں کا تقدس بھی پامال ہو گیا، گویا مغربی تہذیب کی ہوس نے ”عزت سادات گئی“ کا ہمیں مصداق بنا دیا۔

۴) تعلیم گاہوں کا مخلوط ماحول

پہلے زمانہ میں اسکولوں اور کالجس کا قیام جہل و ناخواندگی کا مقابلہ اور علم و ہنر کے تحفظ کے واسطے ہوتا تھا، اسی واسطے تعلیم گاہوں کا ماحول ہر قسم کے انتشار سے محفوظ ماحول ہوا کرتا تھا، تدریس کو ایک مقدس پیشہ کہا جاتا تھا، اساتذہ میں خود داری، وقار اور شفقت و احسان نظر آتا تھا تو تلامذہ میں انکسار و احتیاج دکھائی دیتا تھا، لیکن جب سے تعلیم گاہیں تجارت محض بن کر رہ گئی ہیں ان کا ماحول کلبوں اور تھیٹروں سے بدتر ہوتا جا رہا ہے، لڑکیاں اس قدر سچ دھج کر کالج کے لئے نکلتی ہیں گویا وہ پڑھنے لکھنے کے لیے نہیں رقص کرنے کے لئے جا رہی ہوں اور لڑکوں کے بناؤ سنگھار نے تو عورتوں کو بھی شرمادیا ہے، ہر سال ایک بڑی تعداد روحانی و اخلاقی موت مرتی رہتی ہے مگر کالج انتظامیہ کو اس کا کوئی غم نہیں، اس لئے کہ انہوں نے یہ مارکیٹ کھولی ہے محض آمدنی کی خاطر! قوم کے بچے خواہ کسی گڑھے میں جا کے

گریں مگر وقت پر انہیں فیس دے دیا کریں۔

(۵) شادیوں میں تاخیر کرنا

اس صورتحال کی ایک اہم بلکہ اہم ترین وجہ نکاحوں میں تاخیر ہے، نکاح کھانے پینے کی طرح انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے، آدمی کو اگر بھوک ستا رہی ہو اور کھانے کی کوئی حلال چیز اس کو نہیں مل رہی ہے تو وہ حرام کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے، پیاس کی شدت ہو اور پینے کے لئے کوئی حلال شے دستیاب نہ ہو تو وہ حرام سے اپنی پیاس بجھانے لگتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس وقت حرام کاری پر مجبور ہو جاتا ہے جب کہ اس کی شہوت بھڑک رہی ہو اور کوئی حلال راستہ اس بھڑاس کی تسکین کا موجود نہ ہو۔ آج والدین کی جس اور حیا کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ صنفِ مخالف کی ضرورت اور شہوت کے ہیجان و بحران کی کیفیت کا عملی تجربہ رکھنے کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارے مقابلے میں ہمارے بچوں کا دور اخلاقی قدروں کے اعتبار سے بہت زیادہ اتر رہا ہے وقت پر بچوں کے نکاح کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور خود سے رحم و محبت کا ثبوت تو کیا دیتے بسا اوقات اولاد کی جانب سے ضرورت کے اظہار کے باوجود نہایت سختی و درشتی سے ان کے مطالبہ کو مسترد کر دیتے ہیں، جب کہ شریعت کی تعلیم اس کے بالکل برخلاف ہے اور شریعت تو خیر بلاشبہ سراپا رحمت ہے، انسانی حمیت اور ابوئی شفقت کا تقاضہ بھی اس طرزِ عمل کی مخالفت کرتا ہے، ماں باپ کی جانب سے ہونے والے اس ظلم کا سبب ظالمانہ مطالبات، جاہلانہ معیارات اور ہندوانہ تصورات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

میں نے اس مسئلہ پر کتاب و سنت اور اقوالِ سلف کی روشنی میں اپنے رسالہ ”شادی کا اسلامی تصور اور ہمارا طرزِ عمل“ میں تفصیلی گفتگو کی ہے، تفصیل اس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، یہاں سرورِ عالم نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کے ایک ارشادِ گرامی کو — جو ایک ہدایت اور اس ہدایت کی خلاف ورزی کی صورت میں زبردست نقصان کی اطلاع پر مبنی ہے —

پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”جب تمہاری لڑکیوں کے لئے کوئی ایسا رشتہ آئے جس کا دین اور اخلاق پسندیدہ اور معتبر ہوں تو تم اس کو فوراً قبول کر لو اور لڑکیوں کو اُن سے بیاہ دو، اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین پر فتنے بھڑک جائیں گے اور عالم گیر فساد پھوٹ پڑے گا۔“ (ترمذی ۲/۲۰۲)

ملا علی قاریؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

”رشتوں کے سلسلہ میں اگر ہر کوئی مال اور جاہ والوں ہی کو ڈھونڈتا رہے گا تو پھر لازماً بہت سی لڑکیاں بے شوہر اور بہت سے جوان بے زوج رہ جائیں گے اور اگر ایسا ہوگا تو وہ سب فساد اُبل پڑیں گے جو معاشرہ کے سر کو شرم سے جھکا دینے والے ہوں گے۔ اسی کو اللہ کے نبی ﷺ نے ”فساد عریض“ سے تعبیر فرمایا ہے۔“ (مرقاۃ المفاتیح: ۶/۱۹۲)

اللہ پاک ہمیں اپنے نبی رحمت سیدنا محمد ﷺ کے احسانات کا اعتراف کرنے اور ان کی انتہائی معقول و معتبر تعلیمات کو سینے سے لگا کر زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ ڈسمبر ۲۰۱۰ء)

علاقائی زبانوں میں کام کی ضرورت

ریاستِ آندھرا پردیش کی علاقائی زبان ”تیلگو“ ہے۔ غیر مسلم تو عام طور سے یہی زبان بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں، خود مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ اسی زبان میں پڑھنے لکھنے کا عادی ہے، بالخصوص آندھرا و سیما علاقوں میں عام مسلمانوں کی یہی زبان ہے، تلنگانہ کے علاقہ میں اگرچہ طویل مسلم اقتدار کی وجہ سے اردو زبان کا زیادہ رواج ہے، پھر بھی دیہی علاقوں میں رہنے والے مسلمان چونکہ زیادہ تر تیلگو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو پڑھنے لکھنے کی حد تک اردو سے نااہل ہی ہوتے ہیں، اس لیے اردو کتب و رسائل سے استفادہ ان کے لیے بھی مشکل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح انسانی برادری کے درمیان باہمی تعلقات کا استحکام اور آپسی رابطہ کی مضبوطی زبان و بیان ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اسی طرح دعوتِ الی اللہ کے لیے بھی مدعو قوم کی زبان سے واقفیت اور اس پر عبور داعی کے لیے ایک لازمی ضرورت ہوتی ہے، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُذَكِّرَ أَهْلَهُمْ ط۔ (سورہ ابراہیم: ۴) ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث کیا ہے، تاکہ وہ اپنی قوم کو اچھی طرح دعوت دے سکیں۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَمْ يَنْبَغِ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ نَبِيًّا إِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِهِ۔ (مسند احمد: ۲۱۴۱۰) اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو ان کی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا ہے۔ اُرْسِلَ كُلُّ نَبِيٍّ إِلَى أُمَّتِهِ بِلِسَانِهَا۔ (مسند الحارث: ۹۴۲) ہر نبی اپنی امت کی

طرف اسی کی زبان میں بھیجا گیا ہے۔

مفسرین اور شراح حدیث نے مذکورہ بالا آیت اور روایت کے سلسلہ میں وضاحت کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر عظیم احسان اور اس کی بندہ نوازی ہے کہ اس نے اپنے دین کی دعوت کے لئے کسی خاص زبان کا انتخاب کرنے کے بجائے اپنے بندوں کی علاقائی و قومی زبان ہی کا استعمال فرمایا تاکہ بندے پیغمبروں کی دعوت کو بہ آسانی سمجھ سکیں اور پیغمبر خود ان کو ان کی فہم کے مطابق دعوت دے سکے۔ اس طرح بندوں پر حجت دعوت پوری ہو کر وہ اپنی ہدایت و گمراہی کے خود ذمہ دار ٹھہر جاتے ہیں۔^۱

پس معلوم ہوا کہ مادری و علاقائی زبان کے رابطہ کے بغیر کسی قوم کو دین کی دعوت بھی صحیح طریقہ پر نہیں دی جاسکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو پسند فرمانے کے باوجود اپنی کتابوں اور رسولوں کے لئے اس کو لازم نہیں کیا، بلکہ ہر نبی اور اس پر نازل کئے جانے والے احکام کے واسطے اسی قوم اور اسی علاقے کی زبان کی رعایت فرمائی۔ حاصل یہ کہ ہر علاقہ کے خدام دین کی بڑی اہم ضرورت اس علاقہ کی زبان کا سیکھنا اور اس میں کمال پیدا کرنا ہے، تاکہ اپنے علاقہ دعوت میں وہ مؤثر اور مشرک در ادا کر سکیں۔

ایک بات تو یہ ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ دین کی دعوت و تبلیغ کا ایک اہم وسیلہ صحافت ہے، اسی لئے دینی مدارس اور دینی تنظیموں اور جماعتوں کی جانب سے ماہناموں کی اشاعت کا سلسلہ بھی رکھا جاتا ہے، آج کل اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمارے علاقہ آندھرا پردیش میں بھی شمالی ہندوستان کی طرح مدارس دینیہ اور علماء کرام کی تعداد دن بہ

۱۔ ہو سکتا ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تو صرف عربی ہے جب کہ آپ تمام اقوام عالم کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں، تو مفسرین کرام نے اس کے دو جواب دئے ہیں، ایک یہ کہ آپ کو زبانیں تو تمام اقوام کی کھانی تھیں مگر آپ کو ان کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی، اگر آتی تو آپ ﷺ اس کے استعمال سے مجبور نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی امت میں آپ کے اصحاب اور بعد کے علماء ایسے پیدا فرمائے گئے جنہوں نے آپ کی دعوت کو مکمل طریقہ پر دنیا کی ہر زبان میں منتقل کر دیا، اس طرح حجت دعوت کامل ہو گئی اور دعوائے آیت بھی صادق!

اس عاجز کو ایک عرصے سے شدید تمنا اور بہت فکر تھی کہ علاقائی زبان میں اہل حق کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا جائے، مگر پیدائش سے لے کر اب تک نصف صدی کا عرصہ پورا کا پورا خالص دینی مدرسوں کے ماحول میں گزر گیا، تیلگو زبان نہ کبھی پڑھی اور نہ مخصوص ماحول کی وجہ سے اس کی کچھ شدید ہی آسکی، اس لئے اس تمنا کی تکمیل اور اس خواب کی تعبیر کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، اور غیر ذمہ دار وغیر معتمد لوگوں کے ذریعہ یہ کام لیا نہیں جاسکتا تھا، اس لئے جن لوگوں سے یہ کام ہو سکنے کی امید تھی ان کو توجہ دلاتا رہا، اللہ تعالیٰ سے اس کی صورتیں وجود میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن کوئی اطمینان بخش صورت بنتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔

دین کی نسبت سے اطراف و اکناف کے اسفار اور چھوٹی بڑی بستیوں میں آنے جانے کے مواقع اللہ تعالیٰ نے بہت عطا فرمائے، ادھر چند برس سے دیہی علاقوں کے مسلمانوں پر دینی، تعلیمی و تبلیغی محنتوں کی توفیق بھی بفضل خدا مقسوم میں آئی ہوئی ہے تو اپنے اندر علاقائی زبان سے ناواقفیت کا احساس بہت شدت اختیار کر گیا، دوران سفر راستوں اور آبادیوں میں دعوتِ دین کے بڑے زرخیز مواقع ملتے رہتے ہیں، غریب مزاج، ملنسار اور

محبت بھرے مسلمانوں اسی طرح اخلاق مند غیر مسلموں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، وہ عقیدت و محبت سے گرے جاتے ہیں مگر میری بے بسی یہ کہ جی کے ترسنے اور دل کے تڑپ جانے کے باوجود دبول احقاقِ حق اور دعوتِ دین و ایمان کے ان کو نہیں سنا سکتا، وہ محبت سے مل کر، خوشی سے جھوم کر، کھلا پلا کر اور ہاتھ جوڑ کر زیر بار ہی نہیں ممنون و مسحور کرتے ہیں اور میں اس کے جواب میں زبان ہلا کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کوئی پیغام بھی اُن تک ان کی سمجھ کے مطابق نہیں پہنچا سکتا! یقیناً مانئے ایسے وقت اس قدر شرمندگی و ندامت ہوتی ہے کہ چلو بھریانی میں ڈوب مرنے یا دو گز زمین میں گڑھ جانے کو جی چاہتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ یا اللہ! میں علاقہ کا خادمِ دین ہو کر بھی علاقہ والوں کی زبان نہیں جانتا، اجنبی اور عجمی بنابندگانِ خدا کے سامنے سے گزر جاتا ہوں، اگر میں کچھ کہہ سکتا تو کتنے بے ایمان ایمان کی دولت سے مشرف ہو جاتے اور کتنے ایمان والے اعمالِ ایمان کے پابند ہو جاتے۔ ہم اہل حق کے برخلاف عیسائی، قادیانی، منکرینِ حدیث، جماعتِ المسلمین اور ان جیسے کتنے ہی گمراہ و بے دین فرقے ہیں جو زبان و بیان کا سہارا لے کر انہی بستیوں میں اہل ایمان کو مرتد بنانے اور اسلام سے ہٹا کر گرجا و صلیب سے وابستہ کر لینے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس کڑھن گٹھن اور جلن کا عمر کے اس حصے میں فائدہ کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ ممکن ہے کہ جو نسل ہمارے سامنے تیار ہو رہی ہے اس کو صورتِ حال بتلا کر اس بات پر راغب کیا جائے کہ وہ اپنے علاقے کی زبان کو سیکھنے میں دلچسپی لے اور اس میں کمال پیدا کر کے قوم و ملت کی صحیح خدمت کے قابل بنے۔ چنانچہ بفضلِ تعالیٰ اس کی بساط بھر سہی کی جاری ہے۔

پھر چونکہ زیرِ تعلیم و تربیت علماء کرام کے تیار ہونے اور میدانِ عمل میں اترنے کے لئے ابھی کافی وقت ہے، اتنا لمبا عرصہ انتظار نہیں کیا جاسکتا، اگر کیا جائے تو نا فائدہ بل تلافی نقصانات کا سامنا ہو سکتا ہے، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ علی الفور جس قدر ممکن ہو عملی

اقدامات شروع کر دئے جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ادارہ اشرف العلوم سے ایک تینگو ماہنامہ ”پیغام ہدایت“ کے نام سے آغاز کیا جا رہا ہے، الحمد للہ تعالیٰ اردو ماہنامہ ”اشرف الجرائد“ کامیاب طریقے پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، اس رسالہ کا آغاز اس آرزو کی پہلی اور عملی کڑی ہے، اگر یہ اقدام مقبول ہوگا اور قارئین کرام کی طرف سے مثبت و ہمت افزا رد عمل سامنے آئے گا تو انشاء اللہ ادارہ اس کام کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے تینگو زبان میں اپنے اکابر کے مسلک و مشرب کے مطابق ضروری اسلامی لٹریچر منتقل کرنے^۱ اور بہترین دعا و مبلغین کو تیار کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اس اقدام کو اپنی رضا کا سبب اور امت کے نفع و زیادتی ہدایت کا ذریعہ بنائے اور اگلے مرحلوں کو آسان فرمائے۔ آمین

(اداریہ: جنوری ۲۰۱۱ء)

۱۔ الحمد للہ تعالیٰ تینگو ماہنامہ ”پیغام ہدایت“ کا حلقہ بھی اردو ماہنامہ ”اشرف الجرائد“ کی طرح وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ یہ دوسرا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب تک بارہ کتابوں کا ترجمہ مقامی زبان میں ہو چکا ہے۔

شراب سے معاشرہ کو بچائیے

درج ذیل مضمون دراصل حضرت والا کا بیان ہے، مستقل تحریر نہیں، عزیز گرامی مولانا محمد سمیع الدین صاحب قاسمی زید فضلہ نے سی ڈی کی مدد سے قلمبند کر کے ”اشرف الجرائد“ میں شائع کیا تھا۔ از مرتب غفرلہ

اسلام سے پہلے عربوں کا ذوق شراب نوشی

امام الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نظام ہدایت لے کر تشریف لائے تو یوں تو ساری دنیا لیکن خصوصیت کے ساتھ سرزمین مکہ جسے بَلَدُ اللہِ الْاَمِینِ ہونے کا شرف حاصل ہے۔۔۔ مختلف قسم کی اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا تھی، مشرکین مکہ میں بہت سی اخلاقی اور سماجی خرابیاں زمانہ فترت کے طویل ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں، انہی برائیوں میں ایک بہت مہلک اور خطرناک بیماری شراب نوشی کی تھی۔

عرب نہ صرف یہ کہ شراب نوشی کے عادی تھے بلکہ انہوں نے اسے مایہ افتخار اور عزت و شرافت کا مسئلہ بنالیا تھا، ان کی تقریبات ان کی محفلیں، ان کی آپس کی بیٹھکیں اور مجالس، ان کے دن ان کی راتیں، ان کی خوشیاں اور ان کی غمیاں سب شراب کے مشغلہ سے معمور رہا کرتی تھیں، اور وہ لوگ ہر موقع پر اسی کا سہارا لیا کرتے تھے، کوئی حادثہ پیش آتا تو غم غلط اے زمانہ فترت اس زمانہ کو کہتے ہیں جو دونوں کے درمیان میں بغیر کسی ہادی و رہنما کے ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں نبوی تعلیمات کی برکات اور اس کے اثرات معاشرہ سے اٹھ جاتے ہیں۔

کرنے کے لئے شراب میں مشغول ہو جاتے، کوئی خوشی کی بات پیش آتی تو مستی کے اظہار کے واسطے شراب سے شغل کرتے، جنگ ہوتی تو دیوانگی اور جنون پیدا کرنے کے لئے شراب سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہ پاتے، امن کا زمانہ ہوتا تو بے فکری کے اظہار کے واسطے شراب کا دور چلتا، دوست ملنے آتے تو دوستوں کا استقبال شراب سے کرتے، اور محفلیں جمیتیں تو ان محفلوں کی زینت بھی شراب کو بناتے، اگر کسی نے شراب پیش کر دی تو گویا اس نے بہت عزت دی اور اگر کسی نے شراب کو نہیں پوچھا تو گویا اس نے آنے والے کی تذلیل میں کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی، یعنی شراب ان کے لئے محض ایک عادت کی چیز نہیں تھی بلکہ وہ ان کی تہذیب، ان کے کلچر اور ان کی ثقافت کا حصہ بن گئی تھی، جس پر انہیں فخر تھا، ان لوگوں کو اس گندی چیز سے اتنی دلچسپی تھی کہ عربی زبان کے ماہرین بتلاتے ہیں کہ عربوں نے شراب کے ایک ہزار نام رکھے تھے۔ صرف ناموں کی تعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قوم کو اس لعنت سے کیسی دلچسپی اور کس قدر تعلق تھا؟

شراب کی حرمت میں اللہ تعالیٰ کا تدریجی و حکیمانہ طریقہ

اسلام آیا تو اس نے سب سے پہلے عقیدہ اور ایمان پر محنت کی، کیونکہ آدمی جب تک ایمان میں کامل نہیں ہوتا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا کہ پہلے ایمان اور عقیدہ کی درستگی پر محنت کی جائے، یعنی بندے پہلے اپنے نبی کی سچائی اور اس کی عظمت کے قائل ہو جائیں، نبی جس عظیم ذات کی طرف سے تشریف لائے ہیں اس ذات کی بڑائی، کبریائی، مالکیت اور معبودیت ان کی سمجھ میں آ جائے، جس سے ان میں اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ اس قدر پیدا ہو جائے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ یہ چیز حلال ہے تو وہ کہیں یہ حلال ہے، یہ چیز حرام ہے تو وہ کہیں یہ حرام ہے۔ اس لئے اسلام نے یہ ترتیب بنائی کہ پہلے ایمان پر محنت ہو۔ چنانچہ جب ایمان کی محنت ان پر ہو گئی اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مقام و مرتبہ کو اچھی طرح جان گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ فرمائی۔

دنیا میں جتنی اخلاقی اور سماجی گندگیاں ہو سکتی ہیں ان میں سب سے بدترین چیز شراب ہے، ہر برائی شراب سے جنم لیتی ہے، جیسے معدہ کی خرابی سے جسم کے سارے امراض پیدا ہوتے ہیں ایسے ہی شراب سے دنیا کی ہر اخلاقی بیماری وجود میں آتی ہے، اس لیے اس کو ’ام الخبائث‘، یعنی تمام گندگیوں کے پیدا ہونے کا سبب کہا گیا ہے۔ شراب چونکہ عربوں کی بہت پرانی عادت بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت کا ایک اٹوٹ حصہ تھا، عرب معاشرہ میں ان لوگوں کا بڑا نام تھا جن کے پاس پرانی پرانی شرابیں الگ الگ ناموں سے رکھی ہوتی تھیں۔ حال یہ تھا کہ چاہے کسی کے پاس رہنے کو صحیح جھونپڑا، پہننے کو ڈھنگ کا لباس اور کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ ہو لیکن اس کے پاس اگر شراب ہے تو سب کچھ ہے، اس کے بعد ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی، اب ایسے لوگوں سے اچانک کہہ دیا جاتا کہ یہ حرام ہے تو وہ اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور نافرمانی کے مجرم بن جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تدریجی ممانعت کا حکیمانہ طریقہ اختیار فرمایا۔

قرآن کریم میں شراب کی حرمت کا نزول

شراب پینے کی عادت مسلمان ہونے کے بعد بھی بعض لوگوں کو تھی، چنانچہ بعض حضرات نے اسی حالت نشہ میں نماز پڑھی اور اس میں سورۃ الکافرون کی تلاوت کی تو، لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، جس سے ایمان کے دعوے کے بجائے کفر و شرک کا دعویٰ ثابت ہوا، بعض لوگوں نے نشہ کی حالت میں اپنے لئے دعا مانگی اور زبان سے بددعا نکل گئی۔

اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم یہ نازل فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو، کیونکہ جب آدمی نشہ کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کون ہے کیا ہے اور اس کی زبان سے یا حرکات و سکنات سے کیا صادر ہو رہا ہے؟ عزت کا سارا بھرم جو ہوش کی حالت

میں اپنے ہزار عیوب کے ہوتے ہوئے بھی باقی رکھا جاسکتا ہے وہ سب بے ہوشی میں ختم ہو جاتا ہے اور انسان کے اندر چھپے ہوئے سارے عیب اسی کی حرکتوں سے باہر آ جاتے ہیں، اس لئے اللہ پاک نے مسلمانوں کو ہدایت دی اور فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ** اے ایمان والو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب بھی مت آؤ، (النساء: ۴۳) نماز تو اللہ کی بارگاہ میں باریابی کا نام ہے اور ایسی گندی حالت میں اپنے مولیٰ کے دربار میں تمہیں حاضری زیب نہیں دیتی؟ یہ اپنے مولیٰ کی بہت بڑی گستاخی اور بے ادبی ہے، **حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ** یہاں تک کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ تمہیں سمجھ میں آنے لگے، یعنی نشہ اترنے کے بعد نماز پڑھ سکتے ہو۔۔۔ شراب کے سلسلہ میں یہ قرآن کی پہلی ہدایت تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس سے ہونے والے بنیادی نقصان اور اس پر مرتب ہونے والے حکم کو بیان فرمایا کہ شراب سے عقل میں فتور آ جاتا ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے رب کے حضور حاضری کے قابل نہیں رہتا۔

اس آیت کے نزول کے بعد جن صحابہ کے ایمان بہت مضبوط تھے انہوں نے سوچا کہ وہ چیز ہی کیوں اختیار کی جائے جس کی وجہ سے اللہ اپنے حضور میں آنے سے منع فرماتے ہیں، انہوں نے اسی وقت شراب چھوڑ دی، بعض حضرات نے اس خیال سے کہ ابھی حرمت نازل نہیں ہوئی محض نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اوقات نماز کی رعایت کرتے ہوئے اپنے اس شغل کو بدستور جاری رکھا، لیکن اسلام کی مبارک اور پاکیزہ تعلیمات کی برکت سے اور نبی کریم ﷺ اور بعض اجلہ صحابہؓ کے گریز اور احتیاط کو دیکھ کر شراب کے بارے میں ان کے دلوں میں کھٹک پیدا ہونے لگی، اور انہوں نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا؛ آپ نے وحی کے انتظار میں خاموشی اختیار فرمائی، چنانچہ وحی آئی اور آپ سے کہا گیا: **قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ** (البقرہ: ۲۱۹) آپ فرمادیجئے کہ ان دونوں چیزوں۔۔۔ یعنی قمار اور شراب۔۔۔ میں بڑا نقصان ہے اور

لوگوں کا کچھ فائدہ بھی ہے، لیکن ان کے نقصانات ان کے نفع سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔
 — یہاں نہ حلال فرمایا نہ حرام، پہلے کہا تھا کہ نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو، اور اب
 فرمایا کہ اس کا نقصان نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً فائدہ اگر دس فیصد ہے تو نقصان نوے
 فیصد ہے، یہ کہہ کر گویا مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تھوڑے سے فائدہ کے لئے بڑے بڑے
 نقصانات کو برداشت کر لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے بہر حال! لوگوں کے پوچھنے پر
 اتنا بتلادیا گیا کہ شراب اور جوئے میں نفع کم نقصان زیادہ ہے، یہ بتلا کر قرآن نے سکوت
 اختیار فرمالیا، اس کے حلال و حرام ہونے کا اب بھی کوئی حکم نہیں دیا۔ اس آیت کے نزول
 کے بعد صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت نے اللہ کی مراد کو سمجھ لیا اور شراب چھوڑ دی۔

اب ایک تیسری جماعت تھی جس کو ایک طرف شراب سے غیر معمولی عشق و محبت اور
 دوسری طرف یہ گنجائش کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی حرام تو نہیں کی ہے اس لئے بالکلہ اجتناب نہیں
 کرتی تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس سلسلہ میں تیسری وحی آئی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا
 الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ
 فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (سورۃ المائدہ: ۹۰) اے ایمان والو! شراب جو اور سٹے
 بازی دونوں گندی چیزیں ہیں جو شیطان کی کارستانی ہے تم اس سے اپنے کو دور کر لو، فلاح
 پا جاؤ گے۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ
 وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَبِهُونَ ﴿۹۱﴾
 (سورۃ المائدہ: ۹۱) اور یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ شیطان ان کے ذریعہ سے تمہارے درمیان
 بغض و عداوت پیدا کرنا اور یاد الہی اور نماز سے محروم کرنا چاہتا ہے، ان نقصانات کو جت کر
 بڑے پیارے انداز میں پوچھا گیا فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَبِهُونَ؟ کیا میرے منع کرنے کے بعد
 تم لوگ اس کام سے رُک جاؤ گے؟ — جب یہ قطعی حکم نازل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے لوگوں کو اللہ کا یہ حکم سنایا، اور ایک گماشتہ کو حکم دیا کہ مدینہ کی گلی کو چوں میں گشت لگا کر

اعلان کر دو کہ یَاٰیْهَا النَّاسُ قَدْ خَرَمْتُ عَلَیْكُمْ الْخَمْرَ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ! اللہ کی طرف سے شراب اب تم پر حرام کر دی گئی ہے۔

اس اعلان پر حضرات صحابہؓ کا جذبہ اطاعت

جب اعلان کرنے والے نے مدینہ کی گلی کو چوں میں شراب نوشی کی حرمت کا اعلان کیا تو کچھ زیادہ لمحات نہیں گزرے تھے کہ دیکھنے والی آنکھوں نے اور ایک دو کی نہیں سینکڑوں لوگوں کی آنکھوں نے دیکھا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب کے ریلے بہہ رہے ہیں، صحابہ نے سو سو برس سے جو شرابیں اٹھا کر رکھی تھیں وہ باہر پھینک دی، حتیٰ کہ وہ برتن بھی توڑ دئے جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی یا استعمال کی جاتی تھی، کہ نہ یہ ہمیں نظر آئیں اور نہ کبھی اس کا خیال پیدا ہو۔ ذرا غور کیجئے! یہی وہ شراب تھی جس سے ان کے گہرے جذبات وابستہ تھے، جس کے بغیر وہ زندگی ادھوری سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ شراب نہ ہو تو زندگی میں لطف ہی کیا رکھا ہے؟ لیکن بس نبی کی طرف سے ایک اعلان ہوا اور سب کے گھروں سے پانی کی طرح شراب بہنے لگی اور پھر انہوں نے کبھی اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

ایک محفل میں ایک آقا اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کر رہے تھے، انہوں نے کسی اعلان کی آواز سن کر غلام کو حکم دیا کہ بھائی! ذرا معلوم کرو کہ یہ کیا اعلان ہو رہا ہے؟ غلام گیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ آقا! ایک صحابیؓ اعلان فرما رہے ہیں کہ اللہ نے شراب حرام کر دی ہے، یہ سنا تو وہ اپنے ہاتھ میں شراب کا جو پیالہ لئے ہوئے تھے اس پیالہ کو منہ تک نہیں اٹھایا اس کو زمین پر رکھ دیا اور یہ کہا کہ جب یہ چیز حرام ہو گئی تو اس سے ہمارا کیا رشتہ اور کیا تعلق؟ ہمارا رشتہ تو ہمارے اللہ اور ہمارے نبی سے ہے، ان کو جو چیز پسند وہ ہماری پسند اور جو چیز ان کو ناپسند وہ ہمارے لئے ناپسند۔ حضرت عمرؓ اگرچہ پہلے ہی سے شراب سے دور تھے اور ہمیشہ حضور ﷺ کے دربار میں رہا کرتے تھے مگر جب یہ آیت نازل ہوئی فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ تَوَانِ کی زبان سے بے ساختہ نکلا تَهَيَّيْنَا رَبُّ پروردگار ہم باز آگئے

شراب نوشی کے اخروی نقصانات

اسلام میں چند سزائیں ایسی ہیں جن کو حد کہا جاتا ہے، انہیں میں ایک شراب کی حد ہے، جسے اسلامی حکومت میں — یہ جرم ثابت ہونے پر — امیر المومنین جاری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرات صحابہؓ کے سماج میں اس عمل کی اتنی برائی بیان کی کہ شاید ہی کسی عمل کی بیان فرمائی ہو۔ خصوصاً ﷺ نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے اور مجھے خبر دی کہ جو شخص شراب پئے گا اور بغیر توبہ کئے اسی حال میں مر جائے گا تو اس کا حشر بتوں کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ ہوگا۔ مَدَمِنِ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوُثْنِ کہ بتوں کا پوجنے والا اور شراب کا پینے والا اللہ کی نظر میں برابر ہے۔ (ابن ماجہ: ۳۳۷۵)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ والی آیت کے ذریعہ سے اللہ نے تم پر شراب حرام کر دی ہے اور شراب پینے کو شرک کے متوازی اور مساوی قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص شراب پئے گا اور بغیر توبہ کے مر جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔ (نسائی: ۵۶۷۸)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی عبادتیں نامقبول فرماتے ہیں۔ اگر وہ توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول کر لیتے ہیں، اور اگر پھر شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن کی عبادتیں پھر مردود کر دیتے ہیں، پھر توبہ کرتا ہے تو توبہ قبول فرما لیتے ہیں، پھر شراب پیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی عبادتیں مسترد فرما دیتے ہیں، پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور اگر چوتھی دفعہ شراب پیتا ہے اور اللہ سے توبہ کرتا ہے تو لم یقبل اللہ توبتہ اللہ اس کی توبہ بھی قبول نہیں کرتے و مات کافرًا اور وہ کفر کی موت مرتا ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیوی شراب پئے گا اللہ تعالیٰ اسے

جنت کی شراب سے محروم کر دے گا۔ (متفق علیہ)

اس کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان اس گندی چیز سے نفرت کرتے رہے، اگر کوئی جہالت و حماقت سے شراب کے قریب بھی چلا جاتا تو اس سے اس کی بدبو سے، اس کی قربت سے ایسے ہی بچتے تھے جیسے کسی نجاست و غلاظت سے بچتے ہیں۔ مگر افسوس اور صد افسوس کہ آج یورپین کلچر کے ہر جگہ عام ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی شراب یہ لعنت پھر پیدا ہو گئی ہے، جہلاء و غرباء جہالت و غربت کی وجہ سے اور اُمراء و طلبہ دولت کی بہتات کی وجہ سے شراب نوشی کی طرف مائل ہو رہے ہیں، آج کل نو جوانوں میں یہ عادت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے، معروف شراب سے ہٹ کر نئے قسم کے ڈرگس وجود میں آ گئے ہیں جن سے غیر محسوس انداز میں نشہ حاصل کیا جاتا ہے، جگہ جگہ پارلر کھل گئے ہیں، جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ بظاہر فلاورٹسٹ کے نام پر چلاتے ہیں مگر گاہکوں کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے مخفی طور پر ان فلاورز میں نشہ شامل کیا جا رہا ہے، ان پر لروں سے کُتے کرائے پر بھی دستیاب ہو رہے ہیں، جنہیں گھروں پر لا کر نو جوان لڑکے اور لڑکیاں مخلوط کُتہ نوشی کر رہے ہیں، براؤن شوگر دولت مندوں میں عام ہو رہی ہے، اور خدا جانے کیا کیا؟ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: کل مسکر حرام (بخاری: ۶۱۲۴) ہر نشہ آور شئی حرام ہے۔

مسلمانو! اللہ کے واسطے اس اُم الخبائث سے اسی طرح دور ہو جاؤ جس طرح اصحابِ کرامؓ دور ہو گئے تھے، اپنے معاشرہ پر محنت کرو، غرباء کو بھی اس سے نکالو اور اُمراء کو بھی نجات دلاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے کی توفیق دے۔ آمین

(مضمون دسمبر ۲۰۱۰ء)

منشیات و مخدرات اور مسلم نوجوان!

اسلام نے نشہ آور چیزوں کے استعمال پر سخت پابندی لگائی ہے، اس کی خلاف ورزی پر شدید وعیدیں سنائی ہیں، جرم ثابت ہونے پر دنیوی سزا بھی مقرر فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے:

”اے ایمان والو! بے شک شراب اور جو اگندی چیزیں اور شیطانی عمل ہیں، تم اس سے دور ہی رہو تا کہ فلاح پاسکو، دراصل شیطان شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان میں بغض و عداوت اور دشمنی و منافرت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ تمہیں یادِ الہی اور پابندی نماز سے روک دے، (ان برائیوں کے معلوم ہو جانے کے بعد) کیا تم (ان حرکتوں سے) باز آ جاؤ گے؟“ (مائدہ: ۹۰، ۹۱)

ایک زبردست حکیم و مربی نے اپنے نادان و ناعاقبت اندیش بندوں کو شراب کے مہلک نتائج و عواقب سے خبردار کر کے اس سے بچنے کی حکیمانہ تلقین فرمائی ہے۔ کسی حرکت یا کسی چیز کے نقصان سے بچانے کے لیے اس سے عمدہ پیرائے اور اس سے بہتر تعبیر کا تصور بھی مشکل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریفہ میں اختیار فرمایا ہے۔ جب یہ آیت فہلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ عظمتِ خداوندی سے مرعوب ہو کر پکارا اٹھے: اَنْتَھِیْنَا یَا رَبِّ! اے اللہ! ہم باز آ گئے اور اس عمل سے رک گئے!

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

”اے نبی! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم معلوم کر رہے ہیں، آپ جواباً فرما دیجئے کہ اس میں بہت بڑا گناہ (اور بہت بڑا نقصان ہے) اور لوگوں کا کچھ فائدہ

(بھی) ہے، لیکن اس کا گناہ اس کے فائدہ سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔“ (بقرہ: ۲۱۹)

جب ایسا ہے تو پھر لوگوں کو کیا کرنا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ کسی عقلمند کو اس کے جواب کی ضرورت نہیں وہ خود جانتا ہے کہ کسی موہوم نفع کے لئے یقینی نقصان کو گوارا نہیں کیا جاتا، یا چھوٹے فائدہ کے لئے بڑے خسارہ کا سامنا نہیں کیا جاتا۔ اور جب شراب میں گوعادی آدمی کے لیے وقتی سکون جیسی کوئی کیفیت حاصل ہونا ناممکن نہیں لیکن اس کی وجہ سے ظاہر ہونے والے عقلی فتور اور پھر اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جسمانی و اخلاقی امراض اس قدر زیادہ اور اتنے شدید ہیں کہ عقل مندوں کے نزدیک ان مضرات کے مقابلہ میں اس نفع کی کوئی وقعت اور اہمیت نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں کیسے اس کو جائز اور درست قرار دیا جاسکتا ہے؟ شراب نوشی کی مذمت میں احادیث بھی بکثرت وارد ہوئی ہیں، ارشادِ نبوی ہے:

”اللہ تعالیٰ نے شراب کے پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، بنانے اور بنوانے والے پر، اٹھانے والے پر اور اٹھا کر جس کو پہنچایا گیا ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔“ (ابن ماجہ: ۳۳۸)

ایک حدیث میں ہے:

”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ ایسے دسترخوان (یا میز) پر بھی نہ بیٹھے جس پر شراب پی جاتی ہو۔“ (حاکم: ۲۴۸/۵)

حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے خلیل ﷺ نے تاکید فرمائی تھی کہ:

”کبھی شراب نہ پینا، کیونکہ وہ تمام برائیوں کی کنجی ہے۔“ (ابن ماجہ: ۳۳۷۱)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دل میں اس چیز کی سخت نفرت بیٹھ گئی، اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت نازل فرمائی اور نبی کریم ﷺ نے ایک منادی کے ذریعہ مدینہ میں اعلان کروادیا کہ ”شراب حرام کر دی گئی ہے“ تو صحابہ کرامؓ نے برسوں سے جو شرابیں اٹھا رکھی تھیں وہ بلا کسی تامل و تردد کے سڑکوں پر پھینکوا دیں اور ذرا غم نہ کیا۔ حرمت کے اعلان کے بعد اور ناپاکی کا علم رکھنے کے باوجود عہدِ صحابہ میں اللہ کے کسی بندے نے عادت سے

مجبور ہو کر ایک دفعہ شراب پی لی تھی تو نبی کریم ﷺ نے اس جرم کی پاداش میں اس کی پٹائی کرنے کا حکم دیا، اسی وقت:

”صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے ہاتھ سے، کسی نے کپڑے سے، اور کسی نے جوتے سے اس کی پٹائی کی۔“ (بخاری)

پھر شراب کی یہ حرمت صرف کسی متعین اور مخصوص شراب کے سلسلہ میں ہی نہیں ہے بلکہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ

”ہر وہ چیز جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔“ (مسلم: ۲۰۰۱)

اس ضابطہ کے تحت تمام منشیات و مخدرات کو —۔ خواہ زمانہ رسالت میں وہ متعارف ہوں یا نہ ہوں —۔ حرام قرار دے کر امت کو اس سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنے کا پابند کیا گیا۔

مسلمانوں کے سماج میں جب تک اسلامی تعلیمات کی تعلیم و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کی ترویج رہی، لوگ شراب کے نام سے نفرت کرتے اور اس کے تصور سے بھی تکدر محسوس کرتے رہے، اور جب سے شامت اعمال نے مسلمانوں کو مخرماتِ قطعیہ پر نکیر اور معروفاتِ لازمہ کی ترویج سے زیادہ شخصی نظریات اور اختلافی مسائل کی بحثوں میں الجھا دیا ہے، تب سے امت کے نوجوان غیر ضروری مسائل میں تو پھر بھی کچھ دلچسپی لے لیتے ہیں —۔ بلکہ آج کل تو کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں —۔ مگر قطعیاتِ اسلام اور ضروریاتِ دین سے دن بہ دن لاپرواہ و بے بہرا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

چنانچہ شراب نوشی اور دیگر نشہ آور اشیاء کا استعمال اس وقت مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں عام ہوتا جا رہا ہے، گھٹکے سے لے کر حقے تک اور براؤن شوگر سے لے کر شراب تک کوئی شے ایسی نہیں ہے جس میں امت کے نوجوان مبتلا نہ ہو رہے ہوں، کالج کلچر کے نام پر تو ہر حرام کو حلال کر لیا گیا ہے، اور ماں باپ اور اساتذہ جانتے بوجھتے سب کچھ گورا کر رہے ہیں۔ آج کل بڑے شہروں میں باقاعدہ حقے کے دربار سبجے سجائے قائم ہوتے جا رہے

ہیں، ان کے مالکین پاک و معطر اشیاء کا دھوکہ دے کر لوگوں کو دعوتِ ذائقہ دے رہے ہیں، مگر گاہکوں کو عادی بنانے اور اپنا کاروبار جمانے کے لیے اس میں افیون کی آمیزش بھی کر رہے ہیں۔ اسی طرح خطرناک قسم کے گھٹکے عام ہو گئے ہیں، خصوصاً مصروف و مشغول لوگ حتیٰ کہ مدارس دینیہ کے طلبہ و اساتذہ اور مساجد کے مؤذنین و ائمہ بھی آج کل اس کے بہت عادی ہو گئے ہیں، جب کہ ان چیزوں کے استعمال کرنے والے اپنے حال و انداز سے صاف طور پر مست و مخمور نظر آتے ہیں۔ والعیاذ باللہ

متعدد نو جوانوں اور کالج اسٹوڈنٹس کے ذریعہ معتبر خبریں مل رہی ہیں کہ متمول مسلم نو جوانوں سے لے کر غریب پیشہ ور بچوں تک سب ہی کسی نہ کسی قسم کے نشہ کی عادت میں مبتلا ہیں، اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ایسی محافل و مواقع میں معمر لوگ کم اور چودہ پندرہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں بڑی تعداد میں نظر آ رہی ہیں۔

سماج کی اس شرمناک صورتحال کا مقابلہ کرنے اور ملت کی نو جوان نسل کو راہِ راست پر لانے کے لیے علماء کرام، زعمائے اسلام، سماجی خدمت گزار اور ہر طبقہ سے وابستہ دردمندان قوم کو اس طرف متوجہ اور کمر بستہ ہونے کی ضرورت ہے، ورنہ بعد میں پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو اس مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ: فروری ۲۰۱۱ء)

عالم عرب میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا؟

بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ کسی بستی میں ایک جابر و ظالم پہلوان رہا کرتا تھا، ایک سائل نے اس سے اپنا دکھ درد سنا کر کچھ مدد چاہی، اس نے جھڑک دیا، سائل نے اصرار کیا تو ایک پتھراٹھا کر اسے مار دیا، غریب بھکاری کو تکلیف تو بہت ہوئی مگر اتنے بڑے آدمی سے نہ وہ بدلہ لے سکتا تھا نہ پوچھ سکتا تھا، صبر کر لیا، پتھراٹھا کر اپنے جھولے میں ڈال لیا اور چلتا بسنا، کہتے ہیں کہ وہ بھکاری اس پتھر کو بڑی حفاظت سے سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا، لوگ وجہ دریافت کرتے تو جواب دیتا کہ ”کبھی کام آئے گا“۔ ایک دن وہ کہیں جا رہا تھا اسے پتہ چلا کہ بستی کا وہ ظالم پہلوان کسی کنویں میں گر پڑا ہے، نکلنے کی صورت نہیں بن رہی ہے، بھکاری کنوے پر پہونچا اور اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جھولے سے پتھر نکال کر اس کے اوپر دے مارا، وہ کہنے لگا ہائے! یہ تو مدد کا موقع ہے، بھکاری نے کہا جب تو نے مجھ پر ظلم کیا تھا تب میں کمزور تھا، وہ بھی مدد کا موقع تھا مگر اس وقت تجھے قوت و دولت کا نشہ تھا، میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا جب تو کمزور ہو جائے، تب میں اس ظلم کا بدلہ لے سکوں۔

دنیا میں قدرت کا قانون مکافات جاری ہے، ہر ظالم کو ظلم کا مزہ چکھنا پڑتا ہے، ہر فرعون کو موسیٰ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کمزور کبھی طاقتور ہو جاتے ہیں اور طاقتور کمزور بن جاتے ہیں، غریب کے جو دوسخا کامرکز بن جاتے ہیں اور مال و دولت کے مالک کا سہ گدائی لئے درد کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، تاریخ انسانیت اس کی گواہ ہے کہ صبح کا وزیر اعظم شام ہوتے ہوتے اسیر اعظم کہلانے لگا، جس ڈکٹیٹر کے مجسمے کے آگے سر جھکا کر جانا پڑتا تھا اسی مجسمے کو لوگوں نے جوتوں سے روندنا اور لاتوں سے مارا۔ قدرت کے پاس دیر ہے پر اندھیر نہیں ہے۔

عالم عرب کی صورت حال اس وقت یہی ہے، تیونس، مصر اور لیبیا کے بعد بحرین، الجزائر، یمن اور اومان کی عوام نے بھی جبر و استبداد کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار اور عوامی حکومت کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا ہے، ہر طرف افراتفری کا ماحول ہے، کبھی ان ملکوں کی عوام اپنے حکمرانوں اور مطلق العنان شہزادوں کے ظلم و بربریت سے کرا رہی تھی اور اب موت کو سروں پر منڈلاتا ہوا دیکھ کر حکمرانوں کی نینداڑ گئی اور شہزادوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں، عیش و عشرت کے سب نقشے خاک میں مل گئے ہیں، حاکمیت و آمریت کے نشے کا فور اور ماہ رویوں اور دوشیزاؤں کی صحبتیں دور ہو گئی ہیں، کمزوروں نے طاقتوروں کو آنکھیں دکھانی شروع کر دی ہے اور محکوموں نے حاکموں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ان ممالک میں — جہاں اب بڑے بڑے جابر و سفاک حکمران بے بس و عاجز نظر آ رہے ہیں، — اب تک کیا صورتحال تھی وہ لمبی داستان اور دنیائے انسانیت کی شرمناک تاریخ ہے، اسلام تو خیر ان ملکوں میں عرصے سے مظلوم تھا ہی، رعایا بھی مملوکیّت و عنلامی کا شکار تھی، مالداروں اور حکمرانوں کے علاوہ کوئی خوش نہ تھا، زبان سے چاہے کچھ بھی کہتے رہے ہوں عمل سے تو ہر حکمران اَنَّا اَرْبُکُمْ اَلَا عَلٰی کَا مدعی نظر آ رہا تھا، حدیہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اللہ کا دین اسلام اور اس کی کتاب قرآن مجید بھی نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کی محتاج سمجھی جا رہی تھی، کیونکہ اس کے احکام اُن کی ہوسوں کو پورا کرنے میں حائل تھے۔

جب ضرورت ہوتی یہ حکمران بڑے فخر سے اسلام کا نام لیتے اور جب جی چاہتا اسلام کو مولویوں کے ذہنوں کی اختراع اور علماء کے دماغوں کی پیداوار قرار دیتے۔ علماء پر پابندیاں، خطباء کی زبان بندیاں، مجاہدین اسلام اور داعیان حق کی گرفتاریاں اور علمبرداران حق پر ظلم و زیادتیاں ان وحشی درندوں کا روزمرہ کا معمول بلکہ دل پسند شوق ہو گیا تھا، کیسے کیسے علماء کرام اور کیسی کیسی عظیم انقلابی شخصیتیں ان حکمرانوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ اور مغربی آقاؤں کی مدد سے اسلام کی ہر طاقت کو دبایا

اور مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کا نعرہ لگایا تھا، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کب تک ان کی دال گلنے والی تھی؟ آج یہی لوگ ”نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن“ کی عبرت ناک تصویر بنے نظر آ رہے ہیں۔ فَأَعْتَبُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ...

ان ممالک کی مجبور و مظلوم عوام نے جب ان کا بیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو ”مرتا کیا نہ کرتا“ کے مصداق وقت کی حکمراں طاقتوں اور مغرب کے پروردہ جانوروں سے ٹکرا کر اور انہیں آنکھیں دکھا کر ساری دنیا بالخصوص عرب دنیا میں اٹھا پٹک کے اصل ٹھیکے دار ”اسرائیل و امریکہ“ کی آنکھیں کھول دیں کہ ۔

ظلم پھر ظلم ہے حد سے بڑھے گا تو تھم جائے گا

یہ بھی جتلا دیا کہ عوام کی طاقت کتنی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ فلسطینی، عراقی اور افغانی عوام دنیا کی سوپر پاورز کو واپس جانے پر مجبور کر رہے تھے تو تیونس، لیبیا، مصر اور دیگر عرب ممالک کی عوام حکمرانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ کر رہی ہیں۔

بہر حال عوام نے تو اپنی قوت دکھادی اور لوہا منوالیا، مگر اب ان ملکوں کے اقتدار کی جانب بڑھنے والوں کی آزمائش ہے، مغرب بالخصوص اس کے نیت۔ امریکہ و اسرائیل — صورتحال پر قریبی و گہری نظر رکھے ہوئے ہیں، وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ عوامی انقلاب کے بعد رو بہ عمل آنے والی تبدیلیاں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوں، ان خود غرض نیتوں اور نام نہاد خیر خواہوں کو اپنے مفادات اور یہودی مقاصد سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ بے چارے عوام نے تو جانوں پر کھیل کر اور خطروں کو مول کر اپنا فریضہ ادا کر دیا اور غلبہ اسلام کی راہیں ہموار کر دیں مگر..... آگے قلم کو یا رائے تحریر نہیں! قلم رکھ کر ہاتھ اٹھانے کو جی چاہتا ہے کہ بارالہ! نہتے، بے قصور، مظلوم و مقہور بچے بوڑھے اور جوانوں نے مل کر بڑی قربانیوں اور بڑی امیدوں سے جو ماحول بنایا ہے اپنے کرم سے اس کا فائدہ اسلام اور مسلمانوں ہی کو پہونچا دے، دشمنان اسلام کے حریص و خونیں ہاتھوں کو ان ممالک کی طرف بڑھنے سے بچالے، تیرے سوا کوئی مظلوموں کا مددگار نہیں۔ آمین یا رب العالمین۔

گرما کی چھٹیاں اور ان کا استعمال

گرما کی تعطیلات سامنے ہیں، قدرے تفاوت سے تمام اسکولوں میں چھٹیاں شروع ہو جائیں گی، کالجس میں بھی تعلیم بند ہو جائیگی، کھیل کود، تفریح، اور ملاقاتوں دعوتوں کے پروگرام بن رہے ہوں گے، مالدار اپنے ذوق کے مطابق اور عسرباء اپنی حسب استطاعت چھٹیوں کے استعمال کی ترتیب ہر سال بنا لیتے ہیں، ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے، گذشتہ سال خلیج کے مدارس میں تعطیلات تھیں تو یہ راقم سطور حرمین شریفین میں تھا، دن بہ دن مختلف خاندان مختلف ذرائع سفر سے پہونچتے جا رہے تھے، مگر دو چیزیں دیکھ کر بڑا افسوس ہوا، ایک تو یہ کہ یہ آنا ذوق عبادت کے بجائے ذوق تفریح کے طور پر تھا، نماز پڑھ لی اور صحن میں بنی چھتریوں کے نیچے گروہ درگروہ کھانے پینے، ہنسی مذاق کرنے، ایک دوسرے کے فوٹوز لینے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے میں ایسے مشغول جیسے نبی ﷺ کی مسجد میں نہیں کسی پارک میں آئے ہوئے ہوں۔ دوسرے بچوں اور بچیوں کے لباس کہ جس میں کسی قسم کی اسلامیت نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان فیملیوں کو — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ — نہ تلاوت کا اہتمام نہ ذکر نہ دعا و رود بلکہ تفریح اور صرف تفریح سے مطلب! اسی اثناء میں جمعہ آیا تو امام صاحب نے خطبہ میں جو کچھ فرمایا وہ میرے اس احساس کی توثیق تھی، انہوں نے بہت مؤثر انداز میں توجہ دلائی کہ گرمی سخت پڑ رہی ہے گویا سورج آگ اگل رہا ہے، ایسے مواقع پر پہلے زمانے کے لوگ رجوع الی اللہ ہوتے تھے، متعدد بزرگوں کے حالات و ملفوظات سنا کر انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ آج کل گرمی کا حل یا تو یورپ کے فحش ماحولوں میں ڈھونڈا جا رہا ہے یا فارم ہاؤس اور سوئمنگ پولس کے سردخانوں میں دریافت کیا جا رہا ہے!

حرمین شریفین آ رہے ہیں تو بھی تفریح کے طور پر آ رہے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو لاکھوں مسلمان بچوں کی تعطیلات کا زمانہ ان کے سرپرستوں اور علماء دین کے لئے ایک چیلنج ہے، مدارس دینیہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے والے بھی دو تین فیصد سے زائد نہیں، سچر رپورٹ میں چار فیصد غالباً بتلایا گیا تھا، اسے بھی مان لیا جائے تو چھیا نوے فیصد مسلم بچے دین اور علم دین سے دور ہیں، نہ صرف علم دین سے دور ہیں بلکہ بے دینی کے اسباب سے قریب تر ہیں، جن اسکولوں اور کالجس میں یہ بچے پڑھتے ہیں وہ اگر غیر مسلمین کے ہیں تو پھر پوچھنا ہی کیا ہے، اگر مسلمانوں کے ہیں تو بھی مشنری انداز ہی کے ہیں، اکثر اسکولوں کے ذمہ دار مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مشرقی تہذیب سے نالاں قسم کے لوگ ہیں، ان سے بچوں کی دینی تعلیم اور مذہبی تربیت کی توقع فضول ہے، گھروں کے ماحول جیسے ہو گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہے، ماں باپ کو اپنے بچوں کی دنیا کی فکر جس قدر ہے اس کا دس فیصد بھی ان کی دین کی فکر نہیں ہے۔

اگلی نسل کو اسلامی مزاج پر دیکھنے کی اب کیا صورت ہے؟ ان بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم دینے اور دینیات و اسلامیات سے واقف کرانے کا آخر کیا طریقہ ہے؟ علماء کرام کا ان سے کوئی رابطہ نہیں، معلمین و مدرسین کو مدرسہ کی ذمہ داریوں سے فرصت نہیں، دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کا نشانہ بڑی عمر کے لوگ ہیں چھوٹے بچے نہیں۔ ملت اسلامیہ کا یہ معصوم طبقہ دس مہینے تک اسکول میں سرکھپانے کے بعد دو مہینے کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ اگر مالدار ہے تو تفریح و تفریح میں نکال دیتا ہے اور اگر غریب ہے تو سڑکوں کی گردش و آوارگی میں صرف کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو مہینوں کا دینی و اسلامی تعلیم کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا؟ ضرور ہو سکتا ہے، بشرطیکہ:

(۱) والدین اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں، وہ رشتہ داروں سے ملاقات، تقریبات میں شرکت، اور تفریحات کے پروگراموں پر اپنے بچوں کے دین و ایمان اور تعلیم و تربیت کو

ترجیح دیں، وہ اپنے بچوں کے تئیں اپنے اوپر تربیت کی عظیم ذمہ داری کا احساس کریں، قیامت کے دن کی باز پرس کو سوچیں، خود بچوں کو شعور آنے کے بعد والدین کی اس حق تلفی کا جو شکوہ ہوگا اس پر غور کریں۔ اور یہ طے کر لیں کہ تعطیلات کی فرصت میں ہر مصلحت اور ہر سماجی و معاشرتی تقاضے کو پیچھے ڈال کر یا کم از کم محدود کر کے ہم اپنے بچوں کو دینی و مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کا معقول انتظام کریں گے، خواہ اس کے لئے کتنا ہی ایثار کیوں نہ کرنا پڑے

(۲) علماء کرام، عالماۃ اسلام، ائمہ مساجد، مدارس دینیہ کے معلمین و مدرسین اپنے اپنے محلوں میں جس قدر ہو سکے گرمائی مکاتب کا انتظام و اعلان کریں، اور روزانہ کم از کم تین تا چار گھنٹے مکتب چلائیں، ایک جامع و آسان نصاب مقرر کریں اور اس کی تکمیل پر جلسہ عام کر کے بچوں کو اپنی سیکھی باتوں کے مظاہرہ کا موقع دیں، انعام سے نوازیں اور اس زائد وقتی محنت کو اپنی آخرت کا سودا اور وارث انبیاء ہونے کا بنیادی تقاضہ تصور کریں۔

(۳) مساجد و مدارس کے ذمہ دار حضرات اپنی مسجدوں اور مدرسوں کے اندر اور ہو سکے تو قرب و جوار میں جس قدر ممکن ہو گرمائی کلاس کا انتظام کریں، مسجدوں میں رسمی مکاتب تو چلتے ہیں جو اکثر بے فیض اور ضابطہ کی خانہ پڑی کے طور پر ہوتے ہیں، ضرورت مؤثر طریقے پر کام کرنے کی ہے، زائد اور عارضی تقرر کرنا پڑے تو کریں، خرچ کرنا پڑے تو کریں، بجٹ منظور کر لیں، گنجائش نہیں ہے تو فنڈنگ کریں، آج کل مساجد و مدارس میں تزئین و تسہیل کے لئے کیا کچھ صرف کیا جا رہا ہے، لاکھوں روپیہ لوگ دے بھی رہے ہیں، اس کو عمارتوں میں کھپایا بھی جا رہا ہے، آخر بنیادی مقاصد ہی کیلئے سرمایہ کی کمی کا رونا کیوں؟

(۴) ان بچوں کا مزاج ذرا مختلف ہوتا ہے، اکثر شوخ و تیز ہوتے ہیں، مدارس دینیہ کے طلبہ کی طرح سکون سے نہیں بیٹھ پاتے، اساتذہ کو بھی کچھ نہیں سمجھتے، اس لئے ایک تو ان بچاروں کو ان باتوں کی تلقین ہی نہیں ہوئی، دوسرے عمر کا تقاضہ بھی ہوتا ہے، اس لئے اساتذہ متحمل مزاج اور سب کچھ گوارا کرتے ہوئے کام کرنے والے ہوں، انہیں بھی باقاعدہ

ہدایات دی جائیں اور طریقہ کار قولاً و عملاً سمجھایا جائے، تاکہ ہر طبقہ سماج کے بچے شرکت و استفادہ کر سکیں۔

(۵) کوشش کی جائے کہ ایک جامع نصاب ۵۰ سبقوں پر مشتمل پہلے ہی مرتب کر لیا جائے، جس میں تجوید قرآن کے علاوہ اسلامی عقائد، مسنون دعائیں اور بنیادی فقہی مسائل شامل ہوں۔ چھوٹی چھوٹی حدیثیں بھی از بر کرائی جائیں۔ نیز ہفتہ واری اجتماع کے ذریعہ سیرت نبوی، سیرت خلفاء راشدین، عظمت صحابہؓ اور اخلاقیات کے مختلف عناوین پر بچوں کی فہم کے مطابق تاریخی واقعات کی مدد سے سلسلہ وار لکچرز دئے جائیں، اس کا بہت نفع ہوتا ہے۔

(۶) بالغین و بالغات کے لئے بھی مستقل نظم ہونا چاہیے، کالج کے لڑکوں کو کم از کم دو گھنٹوں کے لئے جوڑا جائے، اس کے لئے ان کی نفسیات اور ضرورت کے لحاظ سے نظام العمل بنایا جائے، ہو سکے تو ان کی اپنی تعلیم میں مدد کرنے کی کوئی صورت بھی سوچی جائے کہ اس بہانے انہیں اس طرف میلان ہو، اس وقت ۱۳ تا ۲۰ سال کے بچوں کا حال بہت بُرا ہوتا جا رہا ہے، ہر قسم کی بُری عادتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، اور کچھ نہیں تو بے دینوں اور منسلک اسٹاروں کی نقالی، آوارہ گردی اور ٹھٹھا تماشا ان کا دلچسپ مشغلہ ہوتا جا رہا ہے، دین سے دوری کا یہ عالم ہے کہ اکثر نو جوان دین کو پرانے زمانے کی باتیں سمجھنے لگے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ غور کرنے سے اہل علم و صلاح کو بہت تدبیریں اور نافع طریقے سمجھ میں آ سکتے ہیں، یہ بات نہیں ہے کہ امت میں باصلاحیت لوگ نہیں ہیں، بات صرف یہ ہے کہ فکر و احساس کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ ان سطروں کے ذریعہ بس اسی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

آج ہی ظہر کی نماز ایک دیہات کی مسجد میں پڑنے اور مقامی لوگوں سے بات کرنے کا موقع ملا، گاؤں میں معلوم ہوا کہ ساڑھے چار سو مسلم مکانات ہیں، مسجد میں کل نو افراد نماز

کے لئے آئے تھے، جس میں سے سات بوڑھے اور دونو جوان تھے، ایک چھوٹی سی مسجد قدیم زمانے کی بنی ہوئی ہے، میں نے بوڑھے حضرات سے عرض کیا کہ اگر ہر گھر میں دو آدمی مسجد جانے کے قابل مان لئے جائیں تو بھی نوسو ہو جاتے ہیں جبکہ نو مسلمان مسجد میں آئے ہیں، گویا سو میں ایک آدمی کا مسجد سے تعلق ہے اور ان نو میں نو جوان صرف دو ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بوڑھوں کے گزر جانے کے بعد مسجد میں صرف دو ہی مصلیٰ رہ جائیں گے، آپ سوچئے کہ ہمارے بڑوں نے ہمیں نمازی بنایا، مسجد سے جوڑا، تو ہم اس بڑھاپے تک جڑے ہوئے ہیں، اب اگر ہم اپنے بچوں کے لئے یہ فکر نہ کریں گے تو وہ کیسے مسجدوں سے جڑیں گے؟ ہمارے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے شادی نہ کر کے عبادات میں مشغول رہنے سے شادی کر کے اس کی الجھنوں میں مشغول ہونے کو افضل سمجھا، تاکہ ہم بھی عبادت کریں اور ہمارے بعد ہمارے ذریعہ سے عبادت گذاروں کی ایک جماعت دنیا میں چھوڑ جائیں، امام صاحبؒ کی یہ بات ہے بھی بڑی معقول، مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اولاد پیدا کر کے تھیٹروں، بازاروں اور سڑکوں کی رونق بڑھانے اور شراب و کباب کی محفلیں جمانے میں مدد کر رہے ہیں، مسجدیں ویران ہیں اور حقے پارلر آباد ہیں، جس برائی میں دیکھو مسلم مرد اور عورتیں پیش پیش نظر آ رہی ہیں۔

پھر میں نے ان لوگوں سے معلوم کیا کہ گاؤں میں اسکول کتنے ہیں؟ بتایا گیا کہ ایک گورنمنٹ اسکول ہے ایک پرائیوٹ، دونوں میں کل ملا کے ایک سو بیس بچے بچیاں پڑھ رہے ہیں! میں نے عرض کیا کہ اگر گاؤں کے ہر گھر میں پڑھنے کے قابل دو بچے بھی مان لئے جائیں تو نو سو بچے محتاج تعلیم ہیں، اور ایک سو پڑھ رہے ہیں باقی آٹھ سو بچے کہاں ہیں؟ ان معصوموں مظلوموں کا کون جوابدہ ہے؟ یہی جاہل بچے جو آج گلی کوچوں میں صبح کو شام کر رہے ہیں، کل کے جاہل نو جوان اور پرسوں کے جاہل ماں باپ ہوں گے، کیا چند فکر مند لوگ اور مسجد کے پیش امام صاحب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ کسی طرح محنت کر کے اسکول میں

بچوں کی تعداد دو گنی کر دیں، بچے بڑھیں گے تو حکومت اساتذہ کو بھی بڑھائیگی عمارت بھی بڑھائیگی، اس میں تو اپنا کچھ خرچہ بھی نہیں ہے، مگر بات وہی فکر و احساس کی کمی کی ہے۔

گاؤں کے ان نو نمازیوں اور امام صاحب نے بہت اہتمام سے یہ باتیں سنیں، حالاً وقالاً ان باتوں سے اتفاق کیا اور کچھ کرنے کا وعدہ بھی کیا، جب یہ لوگ میری باتیں توجہ سے سن رہے اور چہرے بشرے سے بات سمجھ میں آنے کا اشارہ کرتے جا رہے تھے، تب میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم بے حس بھی نہیں ہوئی ہے، ہماری طرف سے انہیں احساس دلانے میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ بے شک علماء کرام بہت کچھ کر رہے ہیں، لیکن شاید ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پر تاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کا علماء کے نام پیغام ہے۔

رحمت کا ابر بن کر سارے جہاں پہ چھائیے

عالم یہ جل رہا ہے، برس کر بجھائیے

اور ہمارے حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر علماء کی مجلس

میں بڑے سوز و درد سے سنایا کرتے تھے۔

دل میں لگا کے ان کی لو،

کردے جہاں میں نشرِ ضو

شمعیں تو جھل رہی ہیں سو،

بزم میں روشنی نہیں

اللہ کرے کہ ہمیں قوم کے ان لاکھوں محروموں کے لئے کچھ کرنے کی توفیق

(اداریہ: اپریل ۲۰۱۱ء)

ملے۔ آمین

کرنے کے چند اہم کام یہ بھی ہیں

مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کو یہ دولت ملی ہے اس پر اس کے صحیح استعمال کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، حدیث میں ہے کہ بنی آدم کے قدمِ محشر سے اس وقت تک ٹل نہیں سکتے جب تک کہ اس سے پانچ امور سے متعلق مواخذہ نہ کر لیا جائے، عمر کے بارے میں، جوانی کے بارے میں، مال کے ذرائع حصول کے بارے میں، مال کے مواقع صرف کے بارے میں اور اپنے علم پر عمل کے بارے میں۔ (ترمذی: ۲۳۵۳) ان پانچ اہم سوالات میں سے۔۔۔ جن کا جواب دے بغیر اللہ تعالیٰ کے سامنے سے ہٹ سکتا تو بہت دور کی بات ہے آدمی قدم بھی نہیں ہلا سکتا۔۔۔ دو سوال مال ہی سے متعلق ہیں۔ کہاں سے کمایا؟ کہاں خرچ کیا؟ معلوم ہوا کہ جس طرح مال کا حلال و طیب ذرائع اور جائز طریقوں سے کمانا ضروری ہے وہیں ان کے مصارف کا معقول اور مناسب ہونا بھی ضروری ہے، نامعقول اور ناجائز طریقے سے کمایا بھی نہیں سکتا اور خرچ بھی نہیں کر سکتا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مال بندے کی مجازی ملکیت ہونے کے باوجود حقیقت میں امانتِ خداوندی ہے اور مالکِ حقیقی کے منشا و مرضی کی اس میں رعایت لازمی و ضروری ہے۔

اس کے باوجود اگر غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھی اور مانی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں جو مالدار بے دین ہیں اور حلال و حرام کی تمیز کے بغیر کماتے اور خرچ کرتے ہیں ان کا تو کہنا ہی کیا ہے، جو مالدار دین پسند اور سنجیدہ و سمجھدار ہیں وہ بھی اگر چہ کمانے میں حدود

جواز کی رعایت رکھتے ہیں مگر خرچ کرنے میں اس کا بھرپور خیال نہیں کرتے کہ معقول اور مناسب مصرف میں ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کام کے لئے اتنی مقدار ضروری ہے یا اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے؟ یہ کام زیادہ ضروری ہے یا اس سے بھی انفع اور اہم کوئی اور کام ہو سکتا ہے؟ بعض تو انفاق فی سبیل اللہ میں تقاضہ وقت اور رواج زمانہ سے زیادہ کچھ نہیں دیکھتے۔ مثال کے طور پر ہمارے دیار کے عوام ایصالِ ثواب کے لئے مسجد میں پاروں کا سیٹ بیچنے کے رواج پر کچھ سوچے سمجھے بغیر اب تک بھی عمل کرتے چلے آ رہے ہیں، کسی زمانہ میں جب قرآن مجید چھپے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بمشکل فراہم ہو پاتے تھے تب بے شک مساجد میں متعدد نسخوں کی فراہمی کا ثواب تھا، حدیث میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن جب قرآن مجید کے نسخوں اور سپاروں کے سیٹ کثرت کی وجہ سے رکھے رکھے بوسیدہ ہو رہے ہوں اور اس قدر زیادہ ہوں کہ سال بھر میں ایک دفعہ بھی استعمال کی نوبت نہ آتی ہو کیا اس وقت بھی یہی کارِ خیر ایصالِ ثواب کا بہتر ذریعہ ہو گا یا اس سے بہتر کی تلاش عقل و علم کا تقاضہ ہونا چاہیے؟ اسی طرح لوگوں کو کھانا کھلانے کی کتاب و سنت میں بڑی فضیلت آئی ہے ایک دور تھا جب کہ لوگ ایک وقت کے کھانے اور نان جویں کو ترستے تھے، غریبوں کے بچے بھوکے پیٹ ہی تھپک تھپک کر سلا دئے جاتے تھے، لیکن آج جب کہ ایسے بھوکے تلاشِ بیکار کے باوجود ملنے مشکل ہوں کھانا کھانا ہی بڑی فضیلت کی بات ہے یا انسانوں کی کوئی دوسری ضرورت جو اشد و اقدم ہو پوری کرنا اس سے زیادہ ثواب کی بات ہو سکتی ہے؟ یا جیسے عرب اہلِ خیر کا حال ہے کہ وہ مسجد بنانے سے زیادہ ثواب کا کوئی کام نہیں سمجھتے، ان سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بنی بنائی مساجد کی آبادی بھی معرضِ خطر میں ہے اور کستنی ہی مسجدیں جہل و بے دینی کے نتیجے میں ویران پڑی ہیں اس کے بجائے مدارس و مکاتب کی تعمیر میں حصہ لیجئے، جن کے ذریعہ دین زندہ ہو گا اور نمازی وجود میں آئیں گے اور جب نمازی ہوں گے تو مسجدیں خود بخود بنیں گی مگر یہ حقیقت کسی طرح ان کے فہم و ادراک میں جگہ

نہیں پاسکتی، مسجد بنانا ہی ان کے نزدیک ثواب کا کام ہے خواہ وہ ایران ہی کیوں نہ ہو جائے۔ حاصل یہ ہے کہ بہت سے متمول لوگ راہِ خدا میں صرف کرنے کے متمنی ہوتے ہیں مگر اس کے لئے مواقع صرف کا انتخاب ضرورت کے مقابلہ میں خواہش کی بنیاد پر کرتے ہیں، آج کی صحبت میں اسی امر کی طرف اہل خیر طبقے کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ آج کل بڑے شہروں میں مدارس اور مساجد کی تعمیرات کا معیار اور ان کی مقدار اکثر جگہ ضرورت کے مقابلے میں خواہش اور چاہت کے موافق ہوتی جا رہی ہے، کسی زمانے میں جب بادشاہوں اور نوابوں کا دور تھا جس طرح تاریخ ساز اور یادگار عمارات ذاتی یا مملکتی زیرِ کثیر صرف کر کے بنائی جاتی تھیں اسی قسم کی مسجدیں اور مدرسے بنانے کا آج کل بھی رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جہاں کام کی وسعت کی وجہ سے وسیع عمارات کی ضرورت ہے وہاں تو خیر کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ہونی چاہیے، لیکن جہاں ضرورت اس معیار و مقدار کے مصارف کی داعی نہ ہو وہاں بھی اس قسم کے مصارف کی کیا کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے؟ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں مسجد وسیع و عریض اور آراستہ پیراستہ ہے مگر مصلیٰ معدودے چند، بعض جگہ مدرسہ کی عمارت کافی لمبی چوڑی ہے مگر طلبہ پچیس پچاس، سو سو سو ہیں، جب کہ اتنی عمارت دو چار سو بلکہ ان سے بھی زیادہ طلبہ کے کام آ سکتی ہے، پھر یہ ایسے وقت جب کہ اسی علاقہ میں اس سے اہم کام اور قومی مسائل محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے تشنہ توجہ ہیں۔ مثلاً ایک علاقہ میں ایک مسجد کے بارے میں معلوم ہوا کہ دس کروڑ روپے سے تعمیر ہوئی ہے، دیکھنے میں کوئی اتنی بڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، پوچھنے پر اس بے تحاشہ صرفہ کی کئی وجوہات بتائی گئیں جن میں سے کوئی بھی ضرورت کے درجہ کی نہ تھی محض پسند اور چاہت کا معاملہ تھا، جب اسی مسجد کے اطراف میں آباد مکینوں کی معاشی، دینی اور اخلاقی حالات کا جائزہ لیا گیا تو وہ جہالت و عیسائیت زدہ نکلے۔ ایسے میں سمجھ میں نہ آ سکا کہ مسجد ہی کی تعمیر میں اس قدر خطر و مہم کیوں صرف کی گئی۔ کم از کم اس کی آدھی رقم سے بھی ایک دو اسلامی نہج کے اسکول، ایک دو اسلامی

نہج کے کلینک، دس بیس ابتدائی تعلیم کے دینی مکاتب قائم کر دئے جاتے تو علاقہ کے مسلمان خوشحال بھی ہوتے، جہالت کچھ نہ کچھ دور ہوتی اور ارتداد کے خطرات کسی نہ کسی درجہ میں کم ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی شعور پیدا ہونے کی برکت سے یہ مسجد آباد اور مصلیوں سے شاد ہو جاتی۔

مجھے ایک مخصوص علاقے کے دیہاتوں میں شہدِ دین کی خدمت کا بفضلہ تعالیٰ گذشتہ چند سال سے موقع مل رہا ہے، ایک چھوٹے سے دیہات میں ایک عرب صاحب نے شادی کی، انہیں وہاں مسجد بنانے کا خیال ہوا، ان کے مد نظر صرف رقم تھی کہ پچاس لاکھ روپے خرچ کر کے مسجد بنانا ہے، باقی کسی مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، گاؤں والوں نے اتنی بڑی مسجد کو بے ضرورت بتلایا، قریب کے بڑے گاؤں کی نشاندہی کی جہاں اس کا صحیح مصرف ہو سکتا تھا، مدرسے یا اسکول کھولنے کی ترغیب دی، ہاسپٹل قائم کرنے کا مشورہ دیا، کوئی بات قبول نہیں، مسجد بنے گی اسی گاؤں میں بنے گی اتنی ہی رقم کی بنے گی، ایک آرکیٹیکٹ کو شہر سے بلا کر اس کے ذمہ یہ خدمت کی گئی، اس نے سارا پیسہ صرف کروادیا، آپ یقین جانیں کہ گاؤں میں دس بارہ مسلم مکانات ہیں، ان کے لئے پانچ لاکھ میں بھی شاندار مسجد بن سکتی تھی مگر پچاس لاکھ کے صرفہ سے ایک مسجد وہ بھی ادھوری بنا کر چھوڑ دی گئی، دو تین آدمی بھی نماز پڑھنے والے نہیں ہیں۔

آندھرا پردیش کے ایک ضلع سے تعلق رکھنے والے صاحبِ خیر دیئے میں رہتے ہیں، اللہ پاک نے انہیں انتہائی غربت سے انتہائی دولت تک پہنچایا، آدمی متواضع اور شکر گزار ہیں مگر جو لوگ ان کی دولت کو دین کے نام پر برباد کر رہے ہیں وہ رہبروں کی شکل میں رہزن سے زیادہ کچھ کھلانے کے قابل نہیں ہیں۔ ایک صاحب نے انہیں ایک اسکول کھولنے کا مشورہ اور منصوبہ دیا، انہوں نے چہرے بشرے اور ہمدردانہ و دردمندانہ باتوں سے متاثر ہو کر قبول کر لیا، جس جگہ یہ کام شروع کیا گیا وہاں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر ہے، ایک بہت بڑی زمین خریدی گئی، تعمیر شروع ہوئی، دورانِ تعمیر اس عاحبز کو بھی معائنہ کروایا گیا تھا، جو معیار اور میٹرل استعمال کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر بے ساختہ ضمیر نے پکارا اَتَّخِذُوا مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ؟ ایک غیر اقامتی درس گاہ کے لئے جس میں مستقبل بعید تک بھی چند سو سے زائد بچے نہیں مل سکتے بلاشبہ کروڑوں روپے اس شخص کے لگوائے جا رہے ہیں، یہ کام دیاندارانہ تجزیہ کیا جائے تو اس رقم اور اس زمین کے دسویں حصے میں بھی اچھی طرح اور اچھے پیمانے پر کیا جاسکتا تھا، بقیہ رقم سے اسی علاقے کے مسلمانوں کے بعض دیگر مسائل حل ہو سکتے تھے، یا اسی ادارہ کو مسلمانوں کی مختلف ملی و سماجی خدمات کا سرچشمہ بنایا جاسکتا تھا، مگر خرچ کرنے والے نے آنکھ بند کر کے کسی پر اعتماد کر لیا اور اعتماد حاصل کرنے والے نے دوسرے کے پیسے پر اپنی انانیت کا بھوت سوار کر لیا۔

والعیاذ باللہ من الشیطن الرجیم۔

میرے ایک شاگرد نے چند دنوں قبل ایک علاقہ میں اپنے مدرسہ چلنے کی خواہش کی جہاں وہ پڑھاتے ہیں، موقع نہ ہونے کی وجہ سے جاتو نہیں سکا البتہ زبانی کچھ معلومات حاصل کیں، معلوم ہوا کہ آٹھ دس برس سے مدرسہ چل رہا ہے ۳۵ طلبہ اقامتی اور اتنے ہی غیر اقامتی پڑھتے ہیں، مدرسہ زیر تعمیر ہے، اب تک ساٹھ لاکھ روپے خرچ ہو گئے ہیں ابھی بہت کام باقی ہے۔ یہ کام کوئی شخص واحد بھی نہیں کروا رہے ہیں، عمومی چندہ سے کیا حبار ہا ہے۔ بقدر ضرورت کام اور بقدر ضرورت استحکام کی میں مخالفت نہیں کر رہا ہوں، صرف ضرورت سے زائد تعمیر و تزئین کی بات ہو رہی ہے۔

اس وقت ملت کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کاموں کی ضرورت ہے اور کوئی کام بھی ظاہر ہے کہ سرمایہ کے بغیر تکمیل نہیں پاتا، اس لئے اہل خیر حضرات کو راہِ خدا میں صرف کئے جا رہے اپنے سرمایے کو علماء کرام کے مشورہ سے مفید سے مفید تر بنانے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں چند مشورے درج ذیل ہیں۔

(۱) مدارسِ دینیہ کا استحکام سب سے ترجیحی ضرورت ہے، یہ مدارس ہی ہندوستان میں ملت اور مذہب کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، لیکن مدارس پر بھی اپنا سرمایہ صرف کرتے وقت کام کی مقدار اور معیار کو سامنے رکھ کر بقدر ضرورت صرف کریں، البتہ کام کی مقدار اور اس کے معیار کو بڑھانے میں جتنی مدد کی ضرورت ہو درلغ نہ کریں۔ جس جگہ فی الحال نہ مقدار قابل لحاظ ہے اور نہ معیار لائق اعتبار، بس وسائل و اسباب کے بڑھانے اور مضبوط کرنے کی فکر ہے وہاں ہرگز صرف نہ کریں کہ یہ مال کے ضیاع اور قیامت کے مواخذہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ محدثِ عظیم شیخ محمد عوامہ نے یہاں مدرسہ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا ”کبھی اس پر بھی غور کرو کہ جب مسجد نبوی تعمیر کے اعتبار سے خستہ ٹٹیوں اور مٹی کی دیواروں پر مشتمل تھی، بارش کا پانی بھی ٹپکتا تھا تب اس سے ہدایت کا کتنا فیضان ہوتا تھا اور اب دنیا کی نایاب تعمیر سے آراستہ ہے تو ہدایت کا کتنا کام ہو رہا ہے؟“

(۲) دیہاتوں میں مختصر سی مسجد اور مسجد میں مکتب کا قیام عمل میں لایا جائے، حفاظ و علماء اس کے لئے عموماً تیار نہیں ہوتے، اس لئے سیدھے سادے دیہی نوجوانوں کو نورانی قاعدہ اور مختصر دینیات کی تربیت دے کر انہیں کے ذریعہ یہ کام لیا جائے، ہر پچاس مکتب کے لئے ایک سینٹر ہو جو قاضی مدرسہ کا بھی کام کرے، معلمین کی نگرانی و تربیت کا کام بھی کرے، تنخواہوں کا اجرا اور ضروریات کی فراہمی بھی یہاں سے ہو، اس سینٹر کے ذمہ دار کے لئے موٹر سائیکل کی سہولت ہوتا کہ وہ دورے کر کے برسر موقع جائزہ لیتا رہے اور کام کرنے والوں کی رہبری کرے، اس سینٹر میں چند علاقائی زبان جاننے والے مبلغ بھی ہوں جو گاؤں کے دورے کر کے اسلام دشمن سرگرمیوں پر نظر رکھیں، لوگوں کے دکھ درد، موت مٹی کے مسائل میں تعاون کریں۔ تجربہ ہے کہ دیہات کے قادیانی معلمین تعلیم کے اعتبار سے قابل تو کچھ زیادہ نہیں ہوتے مگر میدان جیتنے اور ماحول بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

(۳) علماء کرام کے ذریعہ سے ضرورت کی جگہوں پر مستقل تعلیمی نظام والے مدارس

کے قیام کا انتظام کریں، جہاں ضرورت کم ہے وہاں کا تعاون کم کر کے جہاں بالکل کام نہیں ہو رہا ہے وہاں کام شروع کرانے کی فکر کریں۔ آج کل جس کے جی میں آ رہا ہے بس مدرسہ کا اعلان کر کے جگہ کی خریدی اور شاندار تعمیر کے لئے جدوجہد میں لگ جا رہا ہے، تعمیر کی سو فی صد فکر ہے اور تعلیم کی طرف دس بیس فی صد توجہ بھی نہیں ہو رہی ہے۔

(۴) مساجد میں چلنے والے مکاتب کو معیاری تنخواہ پر اچھے اساتذہ فراہم کر کے مؤثر بنائیں، اکثر مساجد میں مکاتب تو ہوتے ہیں مگر محض رسمی طور پر چلتے ہیں، امام مؤذن کی تنخواہ میں دو چار سو کا اضافہ کر کے انہیں ناقابلِ تحمل تعداد طلبہ کو پڑھانے کی ذمہ داری دے دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ بچوں اور اساتذہ کے ٹائم پاس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، بچوں کی نہ تجوید ہی صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی دینیات و اسلامیات سے واقفیت ہوتی ہے۔

(۵) مساجد سے ہٹ کر بھی محلوں کے مختلف مقامات پر جزوقتی مکاتب دینیہ کا قیام عمل میں لایا جائے، خواہ اس میں کتنا ہی سرمایہ صرف ہو، البتہ ان مکاتب کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کا نظام معتبر علماء کرام کی نگرانی و سرپرستی میں چلایا جائے، اس سے نئی نسل کے عقیدہ و عمل اور فکر و نظر کو اسلامیانے میں بہت مدد ملے گی اور بستیوں کے ماحول میں ایک خوشگوار اسلامی و اخلاقی تبدیلی نظر آئے گی۔

(۶) اقامتی صنعت خانے قائم کئے جائیں، جہاں حسبِ سہولت دو تین پیشہ ورانہ ہنر سکھانے کا اہتمام ہو، ساتھ ہی بقدرِ ضرورت علمِ دین اور مسنونِ تربیت کا اہتمام بھی ہو، جو بچے نہ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور نہ عصری درسگاہوں سے وابستہ ہیں انہیں اس میں شریک کر کے صنعت و حرفت سے آراستہ کیا جائے، اس سے ایک طرف ان کے لئے کسبِ حلال کا بندوبست ہو جائے گا، اخلاقی خرابیوں سے محفوظ ہو جائیں گے، دوسری جانب لوگوں کو بااخلاق و ہنرمند کاریگروں کی فراہمی آسان ہو جائے گی۔

(۷) غربت زدہ مسلمانوں اور پسماندہ بستیوں میں چھوٹے پیمانے پر اسلامی و عصری

علوم کے امتزاج کے ساتھ پرائمری درجہ کے اسکول کھولے جائیں اور گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرنے والے بچوں کو کسی طرح کچھ نہ کچھ تعلیم فراہم کی جائے، یہ کام گرچہ بہت مشکل ہے مگر پیسے کی طاقت سے بہت حد تک کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسے بچے ترغیبات و انعامات کے لالچ میں آمادہ تعلیم ہو جاتے ہیں، ان کے والدین پچیس پچاس روپے کی مزدوری کو تعلیم و تربیت پر ترجیح دے کر مارکٹوں کے حوالے کر دیتے ہیں، بعد میں یہی بچے بدکاری و شراب خوری کے خوگر ہو کر مسلم سماج کے لئے داغ اور اپنے خاندان کیلئے آفتِ حسان بن جاتے ہیں۔

(۸) ایسے علاقوں میں مسلم لڑکیوں کو ٹیلرنگ اور دیگر خانہ داری کے امور کی تربیت کا نظم بھی کیا جاسکتا ہے، عورتوں میں بڑے خاموش طریقے پر عیسائیت کی محنتیں ہو رہی ہیں، کافی نقصانات کے بعد یہ خبریں باہر آ رہی ہیں، اس قسم کے سنٹرز اہل باطل قائم کر کے اس کو مذہبی تبلیغ کا وسیلہ بنا رہے ہیں، ہم بھی ایسے مراکز قائم کر کے اپنے بھائیوں کے حفاظتِ دین و ایمان کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں، دعوت و ہدایت کی محنت تو مومن کی زندگی کا جزو لا ینفک ہے۔

(۹) مسلم ڈاکٹروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ پیشہ ورانہ پریکٹس میں سے تھوڑا سا وقت فارغ کر کے سلم بستیوں میں خدمت کریں، اس کے لئے متمول حضرات کلینک کے لئے جگہ اور ادویہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لیں، اس میں دو فائدے ہیں، ایک تو یہ کہ علاج جو اس زمانے کی بیش خرچ ضرورت ہے غرباء کو بہ سہولت حاصل ہو جائے گا، دوسرے اس کے ذریعہ دعوت و ارشاد کے کام میں بے حد مدد ملے گی، آج بڑے بڑے شہروں میں تک اہل باطل کے ڈاکٹرز اپنی کلینک کو اپنی تحریک کی دعوت کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ آسانی سے شکار ہو رہے ہیں۔

(۱۰) گریجویٹ نوجوانوں کے ذریعہ ٹیوشن سنٹرز چلائے جاسکتے ہیں، یہاں پر اکثر نوجوان آتے ہیں اور اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر آتے ہیں، ان کی تعلیمی کمزوری کو دور

کرتے ہوئے ان کی فکری و عملی اصلاح کی جدوجہد مؤثر طریق پر بآسانی کی جاسکتی ہے اور اہل باطل خوب اچھی طرح کر رہے ہیں۔ اس قسم کے کاموں کے ذریعہ دیکھتے دیکھتے بستیوں میں اچھے خاصے گھرانوں کے بچے تک فکری بے راہ روی کے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں، ان سنٹرز سے پڑھ لکھے بچوں کو آمدنی بھی ہو جائے گی اور نوجوانوں کو اسلام اور اسلامی اعمال سے دلچسپی بھی ہو جائے گی۔

(۱۱) غریب لڑکیوں کو اسلامک فیشن ڈزائنر بنایا جائے، اور بڑے پیمانے پر کمپنی قائم کر کے برانڈڈ معیار کارڈی میڈ اسلامی لباس مارکیٹوں میں لایا جائے یا فیکٹری آؤٹ لیٹ میں متعارف کرایا جائے۔ آج دینداروں کی عورتیں بے تکلف طریقے پر غیر اسلامی لباس قبول کرتی چلی جا رہی ہیں بالخصوص بچے بچیاں، کیونکہ تیار ملے بوسات استعمال کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے، جب کہ ملے بوسات تیار کرنے والی سب کی سب کمپنیاں یورپ سے فیشن درآمد کرتی ہیں، اور یورپ میں سب کو معلوم ہے کہ دن بہ دن بے لباسی کو لباس کا درجہ دیا جا رہا ہے، اس قدر شرمناک قسم کے لباس متعارف ہو گئے ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظریں حیا سے جھک جائیں مگر پہننے والے فخر و مسابقت کے ساتھ ان کا استعمال کر رہے ہیں، حد یہ ہے کہ علماء و حفاظ کے گھروں میں تک ان کا چلن ہوتا جا رہا ہے، فالی اللہ المشتکی۔ اس مجبوری کو بڑے پیمانے پر فیکٹریاں قائم کر کے جذبات و خواہشات کے لحاظ کے ساتھ اسلامی مطالبات کی رعایت والے لباس متعارف کروا کے دور کیا جاسکتا ہے، اور انشاء اللہ ایک لباس کی یہ تبدیلی بہت سے سماجی و اخلاقی مضرات سے حفاظت کا سبب ثابت ہو سکتی ہے۔

(۱۲) نو فارغ علماء کرام کے لئے علاقائی زبان پر عبور اور انگریزی زبان بقدر ضرورت سکھانے کے با معیار اور باوقار مراکز کا قیام بھی ایک اہم ضرورت ہے، دعوت کے کام میں زبان ہی حقیقی ہتھیار اور مضبوط رابطہ ہے، آج علاقائی زبانوں میں اہل باطل کا جتنا لٹریچر آ گیا ہے اس کا عشر عشر بھی اہل حق کا نہیں ہے۔ میں ایک مرتبہ ایک بہت بڑے

بکڈ پو پر گیا، ہمارے علاقے کی تینگوزبان میں ہر باطل تحریک کی میسوں چھوٹی بڑی کتابیں نظر آئیں، اس کافی بڑے اور نظر نواز ذخیرے میں اہل حق کی کتابیں چند ایک ملیں وہ بھی کافی تلاش کروانے پر۔ یہ اہل حق کا المیہ ہے کہ پڑھنے والے خواہ کسی زبان میں پڑھتے سمجھتے ہوں کتابیں ہماری سب اردو میں لکھی جا رہی ہیں۔ ان مراکز میں علماء کو اچھی اسکا لرشپ دی جائے، محنت بھی خوب لی جائے، کیونکہ اکثر علماء فارغ ہونے سے قبل ہی خانگی و معاشی مسائل کے شکار رہتے ہیں، مزید ایثار و انتظار ان کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے، یقین کیجئے کہ اس پر خرچ ہونے والا سرمایہ علماء پروری اور دعاۃ سازی کے دو گئے اجر و ثواب کا سبب بن جائے گا۔ اس کام میں البتہ اس کا خیال بھی ضروری ہے کہ اس مرکز کا ماحول تقویٰ و طہارت، فکر آخرت اور دردامت والا ہو، علماء ربانین کی آمد و رفت اور نصیحت و موعظت کا سلسلہ جاری رہے، اعمال صالحہ، مسنون طرز زندگی اور سادگی و سنجیدگی کی تربیت بھی ہوتی رہے۔

یہ چند امور ہیں جن کی جانب۔

بگ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا
کچھ تو سچے خدا کرے کوئی

کے مصداق اس راقم عاجز نے قریب ہی زمانے میں مختلف علاقوں میں مختلف حوالوں سے بے حساب پیسے کے ضیاع کو دیکھ کر اہل خیر و متمول طبقے کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے، یاد رہے ہم اس نبی کی امت ہیں جس نے الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشتہ فرمایا تھا، (نبہتی، باب الاقتصاد فی النفقة) اس امت کا وہ پیسہ جو بے دینوں کی خود سری و من مانی کی نذر ہو رہا ہے اس کی تو کوئی حد نہیں لیکن جو سرمایہ دیندار مالداروں کا لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے بے موقع و بلا ضرورت لگ رہا ہے کم از کم اس کا تحفظ ہو کر ضرورت کے مصارف خیر میں استعمال ہو جائے تو بھی الحاد و ارتداد کے بہت سے دروازے بند کئے جاسکتے اور ضلالت و گمراہی کے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ان سطور کے ذریعہ ہونے والے دین کے کاموں کی ناقدری یا مخلص معاونین اسلام کی ناشکری مقصود نہیں بلکہ کام کے مختلف تشنہ توجہ میدانوں کی جانب توجہ مبذول کرانا اور بے اعتدال و غیر متوازن مصارف سے بچا نامہ نظر ہے۔ اِنْ اُرِیدُ الْاَصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اداریہ: جون ۲۰۱۱ء)

رمضان مولائے مہربان کے لئے یا نفس و شیطان کے لئے؟

رمضان المبارک انتہائی برکت و رحمت اور قدر و عظمت والا مہینہ ہے، نبی کریم ﷺ بعض روایات کے مطابق ہلالِ رجب کے نمودار ہوتے ہی رمضان المبارک کی یاد اور اس کے ملنے کی تمنا فرمایا کرتے تھے، اعمالِ خیر میں اضافہ فرماتے تھے، پھر جب شعبان کا مہینہ شروع ہو جاتا تو بکثرت روزے رکھتے تھے بلکہ پورا مہینہ روزوں میں گزار لیتے تھے، صحابہ کرامؓ کو اواخر شعبان میں رمضان کے قریب تر آ جانے کی خبر دے کر اس کے فضائل و خصوصیات اور مسائل و احکام سے باخبر فرماتے تھے، رمضان کے شروع ہوتے ہی آپ کی خیرات اور نغمگاری و مواسات میں مزید شدت پیدا ہو جاتی تھی، آپ ﷺ رمضان کے دن میں روزہ تو رکھتے ہی تھے رات کی نوافل بھی بڑھادیتے تھے، آخری عشرہ میں تو اپنی دیگر دینی و دعوتی مصروفیات ترک کر کے مسجد میں معتکف ہو جاتے اور پوری یکسوئی و انہماک کے ساتھ عبادتِ الہی میں مشغول رہتے تھے۔

آپ کے خود اہتمام فرماتے اور دوسروں کو اہتمام کی ترغیب دیتے رہنے کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد تابعین عظام پھر ائمہ مجتہدین اور محدثین، علماء و صوفیاء اور عامہ مومنین غرض یہ کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ مہینہ عظمت و برکت ہی کا نہیں طاعت و عبادت، ذکر و تلاوت، استغفار و انابت اور جود و سخاوت کی کثرت کا مہینہ قرار پا گیا۔ عہدِ نبوی ﷺ سے لے کر آج تک ہر زمانے کے مسلمان — کیا عوام کیا

خواص — بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی طرف راغب رہتے ہیں، اور پورے عالم میں ہر طرف تقویٰ و طہارت اور بندگی و عبادت کا روحانی و نورانی ماحول بن جاتا ہے، جس سے اہل ایمان کے قلوب مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

غور کریں تو واقعی یہ رمضان المبارک کا آنا بھی کوئی معمولی نعمت نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہ کا اپنے بندوں پر عظیم انعام اور زبردست احسان ہے کہ بہ یک وقت دونوں جہاں کی سرخروئی کا سامان ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ یہ نفس امارہ بالسوء آدمی کو چین سے رہنے نہیں دیتا، اس کے پاس تمناؤں اور ارامانوں کی ایک لمبی فہرست ہے، حیلے بہانوں کا بڑا ذخیرہ ہے، تاویلات و تسویلات کا زبردست خزانہ موجود ہے، اس دشمن دین و ایمان اور رہزن تقویٰ و پرہیز کا شیوہ ہی آدمی کے ہر عمل کو ضائع اور ہر خوبی کی مٹی پلید کرنا ہے۔ چنانچہ یہ قوت نفسانیہ رمضان جیسے مہینے کی مبارک ساعتوں اور قیمتی اعمال کو گھن لگانے میں بھی پیچھے نہیں ہٹتی بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے، پہلے تو اعمالِ خیر ہی سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے بنائے گئے خاص ماحول کی برکت سے قوت پا کر اہل اسلام آمادہ طاعت و طہارت ہونے لگتے ہیں تو وہ ان اعمالِ صالحہ کی شکلیں بدلنے اور ان کا حلیہ بگاڑ کر ناقابل قبول بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں رسمیت حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔

روزہ فاقہ محض ہو کر رہ جاتا ہے، تراویح تفریح کی دوسری شکل بن جاتی ہے، افطارِ صائم افطار پارٹی کی مکروہ صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے، ذکوۃ و خیرات ریا و احسان کی نذر ہو جاتی ہے، از دیا در زق اسراف و تبذیر کے حوالہ ہو جاتا ہے، نوجوان منافقوں کی طرح دن تمام پڑے سوتے رہنے اور راتوں کو بازاروں اور چبوتروں کی زینت بنے رہنے کو رمضان کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ بازار تو بقیعہ رنگ و روشنی بن کر اہل ایمان کے قلوب کو دعوتِ ظلمت دینے لگتے ہیں، عشرہ اخیرہ بجائے اعتکاف اور شب قدر کی تلاش کے عید کی تیاریوں

میں کھپ جاتا ہے، لیلۃ القدر میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ توجہ ہو جاتی ہے مگر اب یہ انتہائی بابرکت رات بھی قدر کے عنوان سے کم اور جشن کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہو گئی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک مہینے کے ذریعہ — جسے اہل دل بزرگانِ دین نے سلوکِ ربانی کا مہینہ قرار دیا ہے — ہماری مغفرت و نجات کا سامان فرمایا تھا مگر ہمارے نفسِ لعین نے اپنے مکروشر کے ذریعہ سامانِ مغفرت کو سامانِ مواخذہ بنا دیا ہے۔

یاد رکھئے! نفس ہو کہ شیطان یہ اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کام کے لئے ہوئے ہیں، لیکن ہم مسلمان ان کی چالپوسی کے لئے نہیں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کس قدر بد نصیبی کی بات ہے کہ جس مخلوق کو ہم خود ملعون قرار دیتے ہیں تو وہ تو اپنا کام برابر کرتے رہیں اور ہم جو اشرف المخلوقات کہلائے جاتے ہیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے عاجز رہ جائیں! فیہا اسفا علی عجزنا وغفلتنا!!

ہم انسان ہیں، سب سے زیادہ طاقتور ہیں اور سب مخلوقات کو مسخر کرنے کے قابل ہیں، ایسے مواقع پر ہمیں ارادہ کی طاقت سے کام لینا چاہیے۔ آئیے! ہم ارادہ کریں کہ اس سال رمضان المبارک کو اس طرح گزاریں کہ نفس و شیطان مایوس اور مولائے مہربان راضی و خوش ہو جائے۔ اللہ ہماری مدد فرمائے۔ آمین

(اداریہ: اگست ۲۰۱۱ء)

ایصالِ ثواب کا عقیدہ برحق اور اجماعی ہے

اسلامی عقائد میں ایک اہم عقیدہ ”ایصالِ ثواب“ کا بھی ہے، معتزلہ اس کے سرے سے منکر ہیں، اہل السنۃ والجماعۃ اس بات کو جائز اور درست قرار دیتے ہیں کہ کسی مسلمان کے انتقال کے بعد اس کے عزیز و اقرباء یا کوئی بھی مسلم اپنی سعی و عمل کا ثواب اس کو بخش دینا چاہے تو بخش دے۔

امام ابو جعفر طحاویؒ اس سلسلہ میں اپنی شہرہ آفاق کتاب ”العقیدۃ الطحاوی“ میں اہل اسلام کا عقیدہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفی دعاء الاحیاء وصدقۃہم زندہ لوگوں کی دعاؤں اور ان کے صدقات منفعة للاموات۔ (ص: ۱۳۴) کا نفع مردوں کو پہنچتا ہے۔

اس کی تشریح میں حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

اتفق اہل السنۃ علی ان الاموات اہل سنت والجماعۃ کا اس پر اجماع ہے کہ یتنفعون من سعی الاحیاء بطریق مردوں کو متعدد طریقوں سے زندوں کی سعی عیدۃ۔ (ایضاً علی الہامش) و عمل کا نفع پہنچ سکتا ہے۔

امام نووی شافعی رحمہ اللہ نے مقدمہ صحیح مسلم کی شرح میں ایک مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے ضمناً اس عقیدہ پر بھی روشنی ڈالی ہے:

من اراد بر والدیه فلیتصدق عنهما، فان الصدقة تصل الى الميت وینتفع بها بلا خلاف بین المسلمین، هذا هو الصواب واما ما حکاه اقضى القضاة ابو الحسن ما وردی البصری الفقیه الشافعی فی کتابه ”الحاوی“ عن بعض اصحاب الکلام من ان الميت لا یلحقه بعد موته ثواب فهو مذهب باطل قطعاً وخطأً بین مخالف لنصوص الکتاب والسنة واجماع الامة فلا التفات الیه ولا تعریج علیه۔ (مسلم بشرح النووی ۱/۸۰)

یہ مسئلہ اپنی جگہ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہیکہ اگر کوئی والدین سے مرنے کے بعد حسن سلوک کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ صدقہ خیرات کرے، اس لئے کہ صدقہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور وہ اس سے منتفع ہوتا ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، اور وہ جو قاضی ابو الحسن ماوردی نے اپنی کتاب الحاوی میں بعض اہل کلام سے نقل کیا ہے کہ میت کو اس کی موت کے بعد کوئی ثواب نہیں پہنچ سکتا تو ان کا یہ قول قطعی طور پر باطل اور بالکل واضح غلطی ہے، نیز کتاب وسنت کے نصوص اور اجماع امت کے برخلاف ہے، اس لئے ناقابل التفات و توجہ ہے۔

امام قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں آیت شریفہ **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** کے تحت ”المسئلة السابعة“ میں حج بدل کے احکام بیان کرتے ہوئے اس عقیدہ پر اجماع کا ذکر کیا ہے:

فقی هذا ما يدل على انه من باب التطوعات وايصال البر والخيرات للاموات، الا ترى انه قد شبه فعل الحج بالدين، وبالاجماع لو مات ميت وعليه دين لم يجب على وليه قضاءه من ماله، فان تطوع بذلك تأوى الدين عنه۔ (قرطبي: ۴/۱۱۷)

اس حدیث میں — کہ آپؐ نے سائل سے فرمایا: اگر تمہارے مرحوم والد پر قرض ہوتا اور تم ادا کرتے تو کیا ادا نہ ہوتا؟ — اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل نفل کاموں کے ایصالِ ثواب کے باب سے ہے، دیکھئے آپؐ نے حج کے عمل کو قرض سے تشبیہ دی (اور فرمایا کہ جس طرح میت کی طرف سے اس کا قرض ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے، اسی طرح اس کی جانب سے حج کیا جائے تو وہ بھی ادا ہو جائے گا) جب کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ میت کے اولیاء پر لازم نہیں ہے کہ اپنے مال سے اس کا قرض ادا کر دیں، (پھر بھی) اگر کسی نے ادا کر دیا تو ادا ہو جاتا ہے۔

علی ابن ابی العزدمشقی فرماتے ہیں:

اتفق اهل السنة ان الاموات يتتفعون من سعي الاحياء بامرین، احدهما: ما تسبب اليه الميت في حياته والثاني: دعاء المسلمين لهم واستغفارهم له، والصدقة، والحج... وذهب بعض اهل البدع من

اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مردے زندوں کے عمل سے دو طرح منتفع ہو سکتے ہیں، ایک ان ذرائع سے جن کے اسباب انہوں نے خود اپنی زندگی میں بنائے ہوں، دوسرے مسلمانوں کی اپنی طرف سے کی جانے والی دعا، استغفار، صدقہ خیرات

اهل الکلام الی عدم وصول شیء اور حج وغیرہ کے ذریعہ..... (اس سلسلہ میں
البتة لا الدعا ولا غیرہ فقولہم جزئی اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں)
مردود بالکتاب والسنة۔ اور بعض بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ کسی قسم کا
(شرح العقیدۃ الطحاویہ ص: ۳۶۹) انتفاع زندوں سے مردوں کو نہیں ہو سکتا، نہ
دعا سے نہ کسی اور عمل سے تو ایسے لوگوں کا
قول کتاب وسنت کی روشنی میں مردود اور
نا قابل قبول ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ پہلی صورت یعنی اپنی زندگی میں اپنی سعی سے اختیار کردہ ذرائع
ثواب سے مرنے کے بعد فائدہ اٹھا سکتا تو اس کے ثبوت میں وہ روایت کافی ہے جو امام مسلم
اور دیگر محدثین نے اپنی سند سے نقل فرمائی ہے:
اذامات ابن آدم انقطع عمله الا من آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع
ثلاث صدقة جاریة، او ولد صالح ہو جاتا ہے سوائے تین اعمال کے (۱)
یدعوله، او علم ینتفع به بعده۔ صدقہ جاریہ (۲) نیک اولاد جو اس کے لئے
(مسلم، کتاب الوصیۃ/ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ) دعا کرتی ہے اور (۳) اس کا وہ علم جس سے
لوگ اس کے مرنے کے بعد بھی مستفید
ہوتے رہیں۔

اور دوسری صورت یعنی ان اعمال کے ذریعہ بھی میت کو ثواب پہنچ سکتا جو محض
دوسروں کا عمل ہے تو اس کا ثبوت بھی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس صحیح
ہر چہ اصول دین میں موجود ہے (اس کے بعد انہوں نے متعدد دلائل نقل کئے ہیں، یہاں
ان میں سے صرف ایک ایک مثال نقل کی جا رہی ہے۔)
کتاب اللہ سے ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

حق تعالیٰ نے اس میں مردہ مسلمانوں کے لئے زندوں کی دعا کی تعریف فرمائی ہے، اگر ان کا یہ عمل مقبول و معتبر نہ ہوتا تو قرآن کریم میں اس کی تعریف کئے جانے کے کیا معنی؟

سنت رسول اللہ ﷺ سے ثبوت کے لئے اس حدیث کو ملاحظہ کر لیجئے جسے امام ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عثمان غنیؓ سے روایت کیا ہے:

● کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیہ فقال: استغفروا لاختیکم، واسألوا له الثبیت، فانه الان یسأل۔
(ابوداؤد، کتاب الجنائز بسند صحیح)

جب نبی کریم ﷺ کسی میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو وہاں تھوڑی دیر ٹھہرتے اور فرماتے: اپنے مسلمان بھائی کے لئے مغفرت کی دعا کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے استقامت طلب کرو، کیونکہ یہ

وقت اس کے سوال و جواب کا وقت ہے۔

● اجماع امت کا ثبوت یہ ہے کہ نبی کریم کے زمانہ سے لے کر آج تک امت بلا اختلاف مردوں پر نماز جنازہ پڑھتی اور دعائے مغفرت کرتی آ رہی ہے، یہ میت کا اپنا عمل نہیں ہے غیر کا ہے، مگر اس کو غیر کے اس عمل سے نفع ہوتا ہے کسی کو اس سے عملی اختلاف نہیں ہے۔

● قیاس صحیح اور عقل کامل بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ نفل اعمال کا ثواب بندہ کا اپنا حق ہے، اگر وہ کسی اور کو ہدیہ کر دینا چاہتا ہے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جیسا کہ کوئی آدمی اپنا مال کسی اور کو ہبہ کر دینا چاہے تو کر سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں، یا جیسا کہ اگر کوئی

زندہ مردہ کا قرض ادا کر دے تو اس کی جانب سے ادا ہو جاتا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص ثواب کا کام کرے اور اس کا ثواب کسی مرحوم کو بخش دے تو اس کو پہونچنے میں عقلاً کوئی تردد نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم (انتہی کلامہ)

بہر حال! یہ تو نفس ایصالِ ثواب کا ثبوت تھا کہ زندوں کے عمل کا مردوں کو ایصالِ ثواب کرنا باجماع امت ثابت و جائز ہے، خواہ میت نے زندگی میں اپنی طرف سے ان کے اسباب کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، بس مسلمان اپنی جانب سے پہونچا رہے ہوں، دونوں صورتیں صحیح ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ ایصالِ ثواب کو لغو عمل اور میت کے لئے غیر نافع کام سمجھتے ہیں وہ اجماع امت کے مخالف، بدعتی اور اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں۔ البتہ اہل السنۃ والجماعۃ کے ائمہ میں ”ایصالِ ثواب“ کے برحق ہونے پر اتفاق کے باوجود اس کی صورت و نوعیت میں کچھ اختلاف موجود ہے کہ بعض علماء کے ہاں وہ چند عبادات کے ساتھ خاص ہے اور بعض کے ہاں عام! امام مالک اور امام شافعیؒ اس کو بعض اعمال کے ساتھ خاص کرتے ہیں، امام اعظمؒ ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور جمہور سلف تمام اعمالِ صالحہ نافلہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب کو جائز سمجھتے ہیں۔

امام ابی العزیز دمشقی فرماتے ہیں:

واختلف فی العبادات البدنیۃ عبادات بدنیہ مثلاً روزہ، نماز، تلاوت
کالصوم والصلوۃ وقراءۃ القرآن قرآن اور ذکر اللہ سے ایصالِ ثواب
والذکر، فذهب ابو حنیفہ واحمد کرنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے، امام
وجہور السلف الی وصولہا، ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور جمہور علماء سلف کے
والمشہور من مذهب الشافعی نزدیک ان اعمال کا ثواب میت کو پہونچتا
وما لک عدم وصولہا۔ ہے اور امام مالک و شافعیؒ کے نزدیک
(شرح العقیدۃ الطحاوی ص: ۳۶۹) مشہور قول کے مطابق نہیں پہونچتا ہے۔

کا قول اختیار کرتے ہوئے جمہور ہی کی تائید کی ہے۔

● امام مسلم نے حضرت بریدہ سے نقل کیا ہے کہ:

یہ اور اس قبیل کی تمام قولی و عملی روایات جو مختلف الفاظ و انداز میں منقول ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ زندوں کی جانب سے مردوں کے لئے دعا و استغفار کا فائدہ مردوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اُن رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال، یا رسول اللہ! ان امی ا قتلت نفسہا، ولم یوص، واطنہا لو تکلمت تصدقت، افلہا اجر ان تصدقت عنہا؟ قال نعم!

(بخاری، کتاب الجنائز)

یہ اور بخاری ہی میں مروی حضرت سعد بن عبادہؓ کے اسی طرح کے واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ میت کو زندوں کے صدقات و خیرات کا اجر و ثواب پہنچتا ہے۔

● بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم کسی شخص کا انتقال ہو گیا اور اس کے ذمہ من مات وعليه صيام صام عنه وليه روزے رہ گئے ہوں تو اس کی طرف سے (بخاری، کتاب الصوم) اس کا ولی روزہ رکھ لے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدنی عبادات کا ثواب بھی میت کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میت کے قضا روزے اس کا ولی روزوں کی شکل ہی میں ادا کر سکتا ہے یا اس کا فدیہ ادا کر کے اس کو سبکدوش کر سکتا ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مروی ممانعت کی وجہ سے روزہ کا فدیہ ادا کرنا زیادہ صحیح ہے۔

● صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

ان امرأة من جهينة جاءت الى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: ان امي نذرت ان تحج فلم تحج حتى ماتت، افاحج عنها؟ قال حجى عنها ارأيت لو كان على امك دين اكنت قاضيته؟ اقضوا الله فالله احق بالوفاء۔ (بخاری، کتاب الحج)

ایک خاتون نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی، مگر اس کو پورا کرنے سے قبل ہی انتقال کر گئیں، کیا میں ان کی جانب سے حج کر لوں؟ فرمایا: کر لو، دیکھو! اگر اس پر قرض ہوتا تو تم ادا نہ کرتیں؟ پس اللہ کا حق بھی ادا کر دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے وفا کی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے ذریعہ بھی میت کو نفع پہونچایا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ حج بھی اصلاً بدنی عبادت ہے، اگرچہ مال اس کا ذریعہ ہے مگر سب کے لئے ضروری نہیں، حرم شریف کے رہنے والے بغیر کسی مالی صرفے کے محض مناسک حج ادا کرتے ہیں اور ان کا حج سب کے نزدیک معتبر ہے۔ معلوم ہوا کہ حج اصلاً بدنی عبادت ہے۔

● امام احمد نے جابر بن عبد اللہؓ سے بہ سند حسن روایت کیا ہے:

”ایک شخص کا انتقال ہوا تو ہم لوگوں نے ان کا جنازہ تیار کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے، اور عرض کیا کہ نماز جنازہ پڑھا دیجئے، آپ چند قدم چلے پھر رک کے پوچھا کہ میت مقروض تو نہیں؟ عرض کیا گیا کہ اس پر دو دینار کا قرضہ ہے، یہ سن کر آپ لوٹ گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابو قتادہؓ نے عرض کیا: اس کی ادائیگی میری ذمہ داری ہے، ادائیگی کا اطمینان کر کے آپ نے نماز جنازہ پڑھا دی، اگلے دن آپ ﷺ نے ان دیناروں کی ادائیگی کے بارے میں پھر دریافت فرمایا، جب حضرت قتادہ نے عرض کیا کہ وہ دینار ادا کر دئے گئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الآن بَرَدَتْ عَلَيْهِ جِلْدُهُ (منداحم: ۳/۴۰۵) اب تم نے اس کی روح کو پرسکون کر دیا۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اولاد اور رشتہ تو کیا؟ کوئی اجنبی شخص بھی ازراہ خیر خواہی میت کا قرض ادا کر دے یا اور کوئی نفع اس کو پہونچانا چاہے تو شریعت میں گنجائش ہے اور اس کا یہ اهداء و ایصالِ ثواب معتبر ہے۔

● امام احمد، امام ابو داؤد اور امام ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے:

فلما انصرف (من المصلی) اتی (بقرعید کے دن) عید گاہ سے واپسی کے بکبش فذبحہ فقال، بسم الله والله اکبر اللهم هذا عنی وعمن لم یضح من امتی۔ (منداحم: ۳/۱۳۳)

بعد آپ نے ایک مینڈھا بسم الله الله اکبر کہہ کر ذبح فرمایا، اور کہا اے اللہ! یہ قربانی میری جانب سے ہے اور میری امت کے ان تمام افراد کی جانب سے ہے جو قربانی نہیں دے سکے۔

● ان کے علاوہ اور بھی متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں مثلاً سعد بن عبادہؓ کو آپ ﷺ نے ان کی بہن کی طرف سے پانی کی سبیل لگانے کا مشورہ دیا، حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمن کی طرف سے اعتکاف کیا اور غلام آزاد کیا، حضرت علیؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ہدایت دی کہ وہ حج کو نہیں جاسکتا ہے تو کسی اور کو اپنی جانب سے بھیج دے۔ (دیکھئے: قرطبی ۱/۱۱۵) حضرت عمرو بن عاصؓ کے دریافت کرنے پر کہ ان کے والد عاص نے سو غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی مگر پوری نہ کر سکے، مرنے کے بعد میرے بھائی ہشام نے اپنے حصے کے پچاس غلام آزاد کر دئے، کیا میں بھی اپنے حصے کے غلام آزاد کر دوں؟ آپ نے فرمایا: اگر تمہارے والد نے توحید کا اقرار کر لیا تھا تو اس کا نفع پہونچے گا، خواہ غلام آزاد کرو، یا ان کی طرف سے صدقہ کرو، یا حج کرو۔ (سب کا ثواب پہونچے گا) (ابوداؤد، باب ما جاء فی وصیۃ الحر، مسند احمد) حدیث سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایصالِ ثواب کے مفید ہونے کے لئے میت کا مومن ہونا بھی ضروری ہے۔

● امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذا مات احدكم فلاتحسوه واسرعوا به الى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليها خاتمة البقرة۔
میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اسے روکے مت رکھو، جلدی سے اس کی قبر میں پہونچا دو، اور چاہیے کہ (تدفین کے بعد) اس کے سر اہنے رجليها خاتمة البقرة۔
(شعب الایمان: ۲/۱۲۳۰) سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پانچویں اس کی

آخری آیات پڑھ دی جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کا ایصالِ ثواب بھی دیگر عباداتِ نافلہ کی طرح بالکل درست ہے اور اس سے میت کو نفع ہوتا ہے، عصر حاضر کے عظیم محقق و مفسر اور فقیہ

ومدبر علامہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی اپنی تفسیر ”التفسیر المنیر“ میں رقمطراز ہیں:

والمعتمد فی المذاهب الاربعة ان ائمة اربعة کے نزدیک جو بات معتبر و محقق ثواب القراءة یصل الی الاموات، ہے وہ یہ کہ قراءت قرآن کا ثواب بھی میت لانہ ہبہ و دعاء بالقران الذی تنزل کو پہونچتا ہے، کیونکہ وہ ہدیہ اور دعا ہے اس الرحمت عند تلاوته، وقد ثبت فی قرآن کا جس کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ السنة النبویة وصول الدعاء کی رحمتیں اترتی ہیں، جب کہ میت کی والصدقة للمیت، و ذالک مجمع طرف سے کئے گئے صدقہ اور اس کے لئے علیہ۔ (التفسیر المنیر ۱۴۰/۱۴) کی گئی دعا کا پہونچنا سنت نبویہ سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا تمام روایات سے یہ باتیں اچھی طرح واضح ہو گئیں کہ:

(۱) ایصالِ ثواب برحق ہے، سلف سے خلف تک اس کی حقیقت پر سب کا اجماع ہے۔

(۲) ایصالِ ثواب تمام عباداتِ قولیہ، مالیہ اور بدنیہ کا ہو سکتا ہے۔

(۳) زندوں کی اس سعی و سفارش اور اہداء و ایصال کا نفع میت کو حاصل ہوتا ہے۔

رہ گیا وہ اشتباہ جو وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى سے معتزلہ یا ان کے ہم نوا طبقے کو ہو گیا ہے کہ انسان کو اپنی سعی (عمل) کے علاوہ کسی چیز کا نفع نہیں ہو سکتا تو اس شبہ کا باطل ہونا اظہر من الشمس ہے، تفصیل تو حدیث کے شارحین اور متکلمین کی کتب میں دیکھی جاسکتی ہے، ہم امام قرطبی جیسے عظیم مفسر کی اسی آیت کے تحت کی گئی ایک وضاحت پیش کر دینے کو عوام الناس کے لئے کافی سمجھتے ہیں، صاحبِ سمجھ و انصاف کے لئے یہی کافی ہے۔

وقال الربيع بن انس (وان ليس
للانسان الا ماسعى) يعنى الكافر،
واما المؤمن فله ماسعى وماسعى له
غيره قلت كثير من الاحاديث يدل
على هذا القول، وان المؤمن ليصل
اليه ثواب العمل الصالح من غيره۔
(تقریبی ۱۷/۱۱۳)

ربیع ابن انس آیت شریفہ میں انسان سے
کافر کو مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کافر کو
زندوں کی کسی سعی کا نفع نہیں پہنچ سکتا،
البتہ مومن کو تو اس کی اپنی سعی بھی نفع دے
گی اور غیر کی سعی بھی۔ میں کہتا ہوں کہ ربیع
ابن انس کے اس قول کی تائید بہت سی
احادیث شریفہ سے ہوتی ہے کہ مومن کو

دوسرے کے عمل صالح کا ثواب پہنچتا ہے
اس تفصیل سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ مردہ مسلمانوں کے لئے ایصال ثواب تمام
اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک جائز ہے، جو لوگ اس کے منکر ہیں وہی بدعتی اور اہل السنۃ
والجماعۃ سے خارج ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(مضمون: اگست ۲۰۱۱ء)

برہنہ سری اسلامی تہذیب کے خلاف ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں میں دینی احکام اور اسلامی تہذیب کا احترام دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے، اس کے برخلاف مغربی تہذیب کو عام کرنے کی کوششیں چو طرف سے اور مختلف ذرائع سے عام ہوتی جا رہی ہیں۔ نتیجتاً ایک ٹوپی ہی کیا سارا لباس بلکہ پوری معاشرت ہی اسلامی خصوصیات و امتیازات سے محروم ہو گئی ہے۔ یہ صورتحال افسوسناک ضرور ہے مگر تہذیبی تصادم اور مغرب کے ناحق دباؤ نیز عالم اسلام کی تہذیبی مغلوبیت کے مد نظر تعجب خیز بالکل نہیں ہے، تعجب صرف اس پر ہوتا ہے کہ بعض جدید و غیر معتبر افکار کے حاملین ان یورپ سے درآمد شدہ فیشنوں کو کلین چٹ بلکہ اسلامک لیبل کس طرح دیدیتے ہیں؟ بیماری حد سے بڑھ جائے اور بد عملی قابو سے نکل جائے تو اسے صحت اور نیکی کا نام دے کر قبول کر لینا اور بڑھاوا دینا کسی عقل مند کے نزدیک صحیح نہیں ہو سکتا۔

برہنہ سر رہنے یا نماز پڑھنے کا چلن انگریزوں کی آمد سے پہلے مسلم معاشرہ میں کہیں نظر نہیں آتا، ان کی آمد سے قبل علماء و صلحاء تو سر ڈھانک کر رہتے ہی تھے عام شرفاء بھی اسے تہذیب و شرافت کا لازمہ سمجھتے تھے۔

امام ابن جوزیؒ تلخیص ابلیس میں فرماتے ہیں:

”سمجھدار آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ سر کا کھلا رکھنا بُری بات اور ناپسندیدہ حرکت ہے، کیونکہ اس میں ترکِ ادب اور شرافت کی خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔“

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں:
 ”ننگے سر لوگوں میں گھومنا پھرنا (مسلمانوں کے لئے) مکروہ ہے۔“

(بحوالہ فتاویٰ رحمیہ ۸/۱۵۰)

ہندوستانی مسلمانوں میں برہمنہ سری انگریزوں کی آمد کے بعد اور عالم عرب میں مغربی ممالک سے تعلقات کے بعد وجود میں آئی ہے۔ لیکن یہ تقلید فرنگ شروع میں صرف دفاتروں، کالجوں اور بازاروں تک محدود تھی، مذہبی مجلسوں اور مسجدوں میں لوگ اس طرح شرکت کو سخت معیوب سمجھتے اور اس سے احتراز کرتے تھے۔ گویا یہ پہلا مرحلہ تھا جب کہ مسلمانوں نے اسلامی تہذیب کو اسلامی سرگرمیوں کے ساتھ مخصوص کر کے انگریزی تہذیب کو زندگی کے بقیہ مرحلوں میں اختیار کر لیا تھا۔ پھر جب طبیعتیں اس اجنبی تہذیب سے مانوس ہو گئیں اور ایک نسل گذر گئی تو اگلی نسل کے لئے یہ جدید کلچر ہی پسندیدہ کلچر بن گیا اور سابقہ تہذیب اجنبی سی ہو گئی۔ اب جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ٹوپی پہننا ایسا ہی معیوب ہو گیا ہے جیسے چند سال قبل ننگے سر رہنا معیوب تھا، یہ سب تہذیب جدید یا یہودیوں کی عالمی واحد تہذیب (یعنی گلوبلائزیشن) کی کوششوں کی دین ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا علماء دین اور امت کے مصلحین کا کام بہر صورت اسلامی ثقافت اور تہذیب کا تحفظ کرنا اور قوم کے اندر اس کے شعور کو باقی رکھنے کی فکر کرتے رہنا ہے، چاہے قوم اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے، بلکہ جب ایسا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سخت پکڑ فرمائی، قرآن کریم میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہے۔ اس لئے بطور اتمام حجت کے یہ چند سطریں تحریر کی جا رہی ہیں۔

قرآن کریم میں خود نماز و عبادت کے لئے مکمل لباس اور کامل زینت اختیار کرنے کی ترغیب موجود ہے، سورۃ الاعراف: ۳۱ میں ارشادِ ربانی ہے: **يَبْتَغِيْ اَدَمًا حُذُوًا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ**، یہ اگرچہ برہمنہ بدن کعبۃ اللہ کا طواف کرنے والوں کو دی

گئی ہدایت ہے مگر مفسرین کرام نے کُلِّ مَسْجِدِ کے عموم سے یہی سمجھا ہے کہ اس میں نمازوں اور دیگر عبادات کے ادا کرنے اور مقدس مقامات پر جانے کے لئے بھی مکمل لباس اختیار کرنا داخل و شامل ہے۔ اور کل لباس میں جہاں کرتا پا جامہ داخل ہے وہیں ٹوپی یا عمامہ بھی شامل ہے۔

نبی کریم ﷺ کا برہنہ سر رہنا یا نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے، مشہور حسن سلمان نے ابن تیمیہؒ کی ”الذین الخالص“ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے حالت احرام کے علاوہ ننگے سر نماز پڑھانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اگر آپ نے پڑھائی ہوتی تو احادیث میں ضرور منقول ہوتا، اگر کسی کو اس کے ثبوت کا دعویٰ ہے تو دلیل اس کے ذمہ ہے۔ والحق الحق ان یتبع۔ (القول البین ص: ۵۷)

اس کے برخلاف متعدد روایتوں میں آپ کے سر مبارک کا عمامہ یا ٹوپی سے آراستہ ہونا مروی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ سفید ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔ (شعب الایمان: ۲۵۶/۱۳) حضرت عائشہؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ (جامع صغیر: ۱۲۰/۲) حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ ٹوپی عمامے کے تحت بھی اور بغیر عمامے کے بھی استعمال فرماتے تھے۔ (جامع صغیر: ۱۲۰/۲) حضرت ابو قریصہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں ایک ٹوپی دے کر اس کے استعمال کی ہدایت دی تھی۔ (فتح الباری: ۱۰۰/۲۲۳) جب آپ مرض الوفات میں آخری خطبہ دینے کے لئے مسجد میں تشریف لائے تھے تو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں آپ کا سر مبارک عمامہ یا سرخ پٹی سے ڈھکا ہوا تھا۔ (بخاری: ۵۳۶/۱) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے پاس تین ٹوپیاں تھیں، ایک کن ٹوپ بھی تھی جسے سفر میں استعمال فرماتے تھے۔ (تخریج احادیث الاحیاء: ۱۱۰/۶) ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

”آپ ﷺ عمامہ باندھتے تھے، اس کے نیچے ٹوپی بھی پہنتے تھے، کبھی بغیر ٹوپی کے بھی

عمامہ باندھتے تھے، کبھی بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی بھی پہن لیتے تھے۔ (زاد المعاد: ۵۱) یہی بات حضرت ابن عباسؓ سے روایتاً بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ ٹوپی استعمال فرماتے تھے، عمامے کے ساتھ بھی، بنا عمامے کے بھی۔ (جامع صغیر: ۲/۱۲۰)

یہ تو نبی کریم ﷺ کا معمول اور عادت شریفہ تھی، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صحابہ کرامؓ کا عام رواج بھی یہی تھا، کیوں نہ ہوتا؟ وہ لوگ تو آپ ﷺ کی ہر ہر ادا کے عاشق اور اس کے متبع تھے، بخاری شریف میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ سے محرم کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کون کون سے کپڑے پہن سکتا ہے؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: قمیص، شلوار، عمامہ اور ٹوپی نہ پہنے۔ (بخاری: ۲/۴۴) معلوم ہوا کہ ٹوپی کا پہننا صحابہ کرامؓ کے معاشرہ کی عام بات تھی، تب ہی تو آپ نے دوسرے لباس کے ساتھ اس کا بھی ذکر فرمایا۔ فلتان بن عاصم سے مروی ہے کہ جب وہ حضور ﷺ سے ملنے کے لئے پہنچے تھے تو صحابہ کرام کو کپڑوں اور ٹوپوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ (مجموع زاد: ۲/۱۸۴) اسی طرح ترمذی میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے شہید کی فضیلت بیان کرتے ہوئے بتلار ہے تھے کہ اس کے بلند ترین مقام کو یوں سراٹھا کر دیکھا جائے گا، جب آپ نے سر پیچھے کیا تو ٹوپی سر سے گر گئی۔ (ترمذی: ۳/۲۴۱) اس کے علاوہ متعدد صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کے بارے میں روایات موجود ہیں کہ وہ ٹوپی کا استعمال فرمایا کرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انسؓ کی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھے گئے۔ (۲/۲۷۰) اسی طرح ابواسحاق کے بارے میں ہے کہ انہوں نے نماز کی حالت میں ٹوپی نکال کے رکھی پھر اٹھا کے پہن لی۔ (۱/۵۱۵)

مصنف ابن ابی شیبہ میں تو متعدد احادیث موجود ہیں، مثلاً جلد ۲ کتاب الصلوٰۃ میں حضرت شریح، اسود، عبداللہ ابن زید، سعید ابن جبیر، علقمہ، مسروق رحمہم اللہ کے بارے میں اور جلد ۱۲ کتاب اللباس میں حضرت علی بن حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت

ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت انس بن مالکؓ، ابراہیم نخعیؓ اور ضحاکؓ کے بارے میں ٹوپیوں کا استعمال کرنا منقول ہے۔ اسی طرح حضرت حسن بصریؓ سے بخاری شریف میں مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ ٹوپیوں اور عمامے کی کوروں پر سجدہ کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری: ۱/۲۳۲) اس سے تو صحابہ کرام کا عموم استعمال صراحتاً معلوم ہو گیا۔ فتح الباری میں عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے کہ قرآن کریم کے تمام قراء (صحابہ) کے پاس ٹوپیاں ہوا کرتی تھیں۔ (۱۶/۳۵۴) اسی لئے ابن عربی فرماتے ہیں:

”ٹوپی انبیاء، صالحین و اولیاء کے لباس میں داخل ہے، سر کی حفاظت کرتی ہے اور عمامہ کو جماتی ہے، جو کہ سنت ہے البتہ سر سے چمٹی ہوئی ہو بلند نہ ہو۔ ہاں! اگر آدمی بخاراتِ دماغ کے خروج کی ضرورت محسوس کرے تو سوراخ دار بلند ٹوپی بھی پہن سکتا ہے۔“

(فیض القدیر: ۵/۲۹۹)

فتح الباری کتاب الحج میں محرم کے لئے سر ڈھانکنے کے متعدد طریقوں کا ذکر کر کے ان کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ (۵/۱۸۶) جس سے اتنا تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ سر ڈھانکنا قدیم رواج ہے۔

مذکورہ بالا احادیث و آثار جن میں بعض صحیح اور بعض اُن کی مؤید ہیں یہ بتلا رہی ہیں کہ سر کو ڈھانکنا یعنی ٹوپی یا عمامہ سے آراستہ رکھنا بالخصوص نماز کے اندر برہنہ سری سے بچنا اسلامی تہذیب کا حصہ اور مسنون لباس میں داخل و شامل ہے۔ اس کے برخلاف ٹوپی نہ پہننے یا برہنہ سر رہنے کی ترغیب و فضیلت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ صحیح حدیثوں میں نہ ہی ضعیف روایتوں میں۔ پس معلوم ہوا کہ موجود زمانے کا یہ فیشن اور غیر مقلدین کا چلایا ہوا چلن غیر اسلامی اور ناپسندیدہ ہے، جس سے احتیاط کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کا ان روایتوں سے استدلال کرنے کا تعلق ہے جن میں ایک اور دو کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے، وہ یا تو وقتی ضرورت پر محمول ہے یا بیانِ جواز کے لئے ہے، ورنہ

دوامی معمول نبی کریم ﷺ کا سر ڈھانک کر رہنا ہی ہے۔ بالخصوص نمازوں میں تو کبھی ننگے سر امامت فرمائی ہی نہیں۔

شیخ ناصر الدین البانی ایک بڑے عالم گذرے ہیں، سلفی علماء اور عوام انہیں حناتمۃ الحدیثین سمجھتے ہیں، چونکہ ننگے سر کا کلچر اسی طبقے سے عام ہو رہا ہے بلکہ باقاعدہ کیا جا رہا ہے اس لئے ان کی چشم کشائی کے واسطے اس مسئلے میں شیخ کی تحقیق ذیل میں نقل کی جا رہی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس لئے کہ نماز کا مکمل ہیئت اسلامی میں ادا کرنے کا پسندیدہ ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کے لئے اپنے آپ کو سنوارا جائے، نیز ننگے سر رہنے کی عادت ڈال لینا، یا بازاروں میں ننگے سر گھومنا یا مقامات عبادت میں ننگے سر داخل ہونا سلف صالحین کے مبارک عرف میں ہیئت حسنہ کے خلاف اور غیر اسلامی تہذیب کا امتیاز ہے، جو کفار کے بلاد اسلامیہ میں داخل ہونے کے بعد شائع ہوا ہے، وہاں کے مسلمانوں نے بلادلیل شرعی ان بُری عادتوں کو قبول کر کے اس مسئلے میں اسی طرح بعض اور تہذیبی مسائل میں بھی اپنے بڑوں کی تقلید ترک کر دی ہے، پس یہ نئی رسم اس لائق نہیں ہے کہ اسلام کے سابقہ عرف اور طریقے کی مقابل بن سکے، اور نہ ہی اس رسم کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز نکالا جاسکتا ہے۔“

اس کے بعد بعض علماء کے غلط استدلال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہاں تک مصر کے بعض علماء کا حج کے دوران سر کھلے رکھنے اور اسی طرح نماز پڑھ لینے سے استدلال کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کا یہ قیاس قیاس مع الفارق ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، اس لئے کہ اولاً تو وہ مناسک حج کے ساتھ خاص ہے اور شعائر حج میں سے ہے اس کو عام نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر اس سے ہر حال میں سر کھلے رکھ کر نماز پڑھنے کا

ثبوت نکل سکتا ہے تو پھر وجوباً ماننا پڑے گا جوازاً نہیں، کیونکہ احرام میں سر کھلا رکھنا واجب ہے، یعنی ننگے سر نماز پڑھنے کو واجب کہنا پڑے گا جو کوئی نہیں کہتا۔ پس یہ ایسا الزام ہے کہ ان لوگوں کو اپنے قیاسِ فاسد سے رجوع کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ علماء اپنی غلطی سے رجوع کر لینگے۔ (تمام المرتبہ فی التعلیق علی فقہ السنۃ ۶۵/۱۶۳)

نوٹ: ہم نے اس سلسلہ میں فقہاء کرام کے مواقف اور فقہی احکام اس لئے نقل نہیں کئے کہ جس طبقے کو متوجہ کرنا مقصود ہے اس کی نظر میں اس کا کوئی مقام اور احترام نہیں ہے۔ ورنہ فقہاء کرام بلکہ غیر مقلدین کے معتبر و معتدل علماء کرام کے فتاویٰ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(مضمون: ستمبر ۲۰۱۱ء)

سنِ ہجری، تاریخ و احکام

اسلامی جنتری کے اعتبار سے محرم الحرام سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا ہے، اور ذی الحجہ پر سال کا اختتام عمل میں آتا ہے، گویا ہم اب اپنی تاریخ کے چودہ سو تیس سال مکمل کر کے چودہ سو تین سو سال میں داخل ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے گزشتہ سال کے اختتام اور نئے سال کے آغاز کو ہر اعتبار سے خیر و برکت اور امن و سلامتی کی خوشخبری بنا دے، آمین۔ ضرورت ہے کہ ہم اس موقع پر پچھلے سال اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جو دینی صورت حال رہی اس کا جائزہ لے کر اگلے سال کے لئے اس سے بہتر لائحہ عمل بنانے کی فکر کریں تاکہ گذرتے دنوں کے ساتھ ہم اپنے رب کے حضور حاضری کی تیاری بھی اچھی طرح کر سکیں۔

سنِ اسلامی کا استقرار سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ اور ان کے اتفاق سے ہوا، ہجرتِ نبوی کے واقعے کو اس کی اساس و بنیاد بنایا گیا، اسی لئے اس کو سنِ ہجری کہتے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ) اس کے مقابلے میں سنِ عیسوی سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخِ ولادت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، اسی لئے اس کو سنِ میلادی بھی کہا جاتا ہے۔ ”ہجرت“ بمعنی علیحدگی و دوری ایک اسلامی اصطلاح ہے اور اس کے معنی اپنے دین کی حفاظت کے لئے ترکِ وطن کر کے کسی دوسرے مقام کو منتقل ہو جانے کے ہیں۔ (التعریفات للہجر جانی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اپنے دین کو بچانے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے چاہے وہ ہجرت ایک بالشت کے برابر بھی کیوں نہ ہو اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ (مجمع بحار الانوار)

ابتداء اسلام میں اہل اسلام کو مکے پر کفار کے غلبہ کی وجہ سے پہلے حبشہ کی جانب پھر مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا گیا تھا، صحابہ کرامؓ یکے بعد دیگرے ہجرت کرتے رہے، بالآخر نبی کریم ﷺ نے حق تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق نبوت کے تیرہویں سال اور اپنی عمر مبارک کے تیرہویں سال مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، ہجرت الی المدینہ فتح مکہ سے قبل تک ایک خاص ضرورت کے تحت ہر مسلمان کے لئے لازم تھی، لیکن ضرورت پڑنے پر اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہجرت کرنا اب بھی دین میں داخل ہے: لَا تَنْقَطِعُ الْهَجْرَةُ حَتَّى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ۔ (بیہقی) یعنی جب تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوگا اس وقت تک ہجرت کا حکم بھی منسوخ نہیں ہوگا اور حدیث میں لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (بخاری) جو فرمایا گیا ہے تو اس کے معنی ہجرت کی منسوخی کے نہیں ہیں۔ خاص مدینہ منورہ کی طرف نصرت اسلام کے لئے جو ہجرت فرض تھی اس کی ضرورت فتح مکہ کے بعد چونکہ ختم ہوگئی اس لئے اس کی فرضیت بھی منسوخ ہوگئی، باقی ضرورت پڑنے پر اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسَعَتْ فِتْنَهَا جَرُّوْا فِيْهَا کے تحت ہجرت کا حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ (النساء: ۹۷)

اپنے آبائی وطن سے محبت ایک فطری امر ہے، جہاں آدمی پلتا پھلتا اور بڑا ہوتا ہے وہاں کے افراد و احباب، اشیاء و اسباب حتیٰ کہ گلی کو چوں اور درو دیواروں سے بھی قلبی تعلق اور فطری لگاؤ ہو جاتا ہے، اسے چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا تو دور کی بات ہے اس کے تصور سے بھی آدمی کو تکلیف ہوتی ہے، آسانی سے دل آمادہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت آدمی کو مجبور کرتی ہے تو ترک وطن کرنا ہی پڑتا ہے، خاص طور سے طلب علم اور کسب مال کے لئے ترک وطن کا عام رواج پہلے بھی تھا اب بھی ہے اسلام نے تحفظ دین و ایمان اور نصرت اسلام کے لئے جب ہجرت کے عنوان سے ترک وطن کا حکم دیا تو صحابہ کرامؓ نے بصدد ذوق و شوق اپنے گھر دار کو خیر باد کہہ کے اور مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر کے دین و ایمان کی حفاظت اور اسلام کی اشاعت کو ہر تمنا پر مقدم رکھنے کی نظیر قائم فرمادی، اور ہتی دنیا تک مسلمانوں کو سبق دے گئے

کہ حقیقی مومن وہ ہے جس کے نزدیک دین و ایمان سے بڑی کوئی دولت نہ ہو اور وہ اس کے تحفظ کیلئے سب کچھ قربان کر سکتا ہو۔ یہ حضرت عمرؓ کی فراستِ ایمانی اور دور اندیشی تھی کہ انہوں نے اسلامی جنتری کی بنیاد اسلامی تاریخ کے اس عظیم الشان و فقید المثال واقعہ پر رکھی۔

جہاں تک ماہِ محرم کا تعلق ہے تو وہ نہایت ہی بابرکت مہینہ ہے، اشہرِ حرم یعنی حرمت و عزت کے لائق مہینوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ** (سورہ توبہ: ۳۶)۔ بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کی کتاب میں زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت ہی سے بارہ ہے اور ان میں سے چار بہت حرمت والے ہیں۔ ان چار میں سے ایک محرم بھی ہے۔ (بخاری) احادیثِ صحیحہ میں اس کی نسبت اللہ پاک کی طرف کرتے ہوئے اس کو شہرِ اللہ بھی کہا گیا ہے۔ (مسلم) جو اس کی عظمت و جلالت کی نشاندہی کرتا ہے، اس مہینے کے روزہ کو رمضان شریف کے روزوں کے بعد سب سے افضل بتلایا گیا ہے۔ (مسلم) ایک روایت میں تو محرم کے مہینے کے ایک روزہ کو ایک مہینے کے روزوں کے برابر فرمایا گیا ہے۔ (طبرانی کبیر) خلاصہ یہ کہ اسلامی تاریخ کا یہ پہلا مہینہ یعنی محرم الحرام متعدد وجوہ سے فضیلت و بزرگی کا حامل ہے اور اس کی یہ فضیلت اسلام سے قبل ہی سے چلی آ رہی ہے، کیونکہ تکوینی طور پر کائنات کے بہت سے اہم انقلابات کا اس مہینے سے تعلق ہے، اہل کتاب اور مشرکین مکہ بھی اس کی حرمت کے قائل تھے، اسلام نے بھی اس کی تحریم و تعظیم برقرار رکھی، اس لئے عوام الناس کا ”شہادتِ حسینؑ“ کے واقعے سے منسوب کر کے اس مہینے کو منجوس سمجھنا اور روافض کی طرح غم و ماتم کے رسوم اختیار کرنا جہالت اور کم فہمی و کم علمی کی وجہ سے ہے۔ افسوس! رسم و رواج کا اتباع بھی ایسی اندھی چیز ہے کہ حرمت و برکت کے عقیدے کو شقاوت و نحوست کے اعتقاد سے تبدیل کر لیا گیا۔

عاشوراء دسویں محرم کو کہتے ہیں، احادیث سے اس دن کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور

اس میں دو کاموں کا حکم ملتا ہے، ایک اس دن روزہ رکھنا اور یہود کی مشابہت سے بچنے کے واسطے دس کے ساتھ نو یا گیارہ کا روزہ ملا لینا۔ دوسرے اس دن اپنے اہل و عیال کے نفقے میں توسع کرنا، یعنی روزمرہ کے اخراجات میں کچھ زیادتی کر لینا۔ پہلے عمل کی فضیلت یہ ہے کہ عاشوراء کا روزہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم) اور دوسرے عمل کا فائدہ یہ ہے کہ اگلے سال روزی میں برکت رہتی ہے۔ (شعب الایمان) امام بیہقیؒ اس سلسلہ میں چھ روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: *هَذِهِ الْأَسَانِيدُ وَإِنْ كَانَتْ ضَعِيفَةً، فَهِيَ إِذَا ضَمَّ بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ أَخَذَتِ الْقُوَّةَ وَاللَّهُ أَعْلَمُ* عاشورے کے دن وسعت اتفاق کی یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں مگر ایک دوسرے سے مل کر قوی ہو جاتی ہیں یعنی قابل عمل ہیں۔ ان دو اعمال کے علاوہ کوئی عمل مشروع نہیں ہے اور یہ دو عمل بھی فرض و واجب درجہ کے نہیں ہیں مستحب اور پسندیدہ سمجھے گئے ہیں، اس لئے ان فضیلتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ کسی عمل کی فضیلت عمل کرنے اور حصول اجر و ثواب کے لئے ہی بیان کی جاتی ہے۔ البتہ ان کے ضروری اور لازمی ہونے کا اعتقاد نہ رکھے جس کی علامت یہ ہے کہ نہ کرنے والوں پر طعن و اعتراض نہ کرے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ محرم اور عاشوراء کے حوالے سے — اس مہینے کی فضیلت، صوم عاشوراء اور اہل و عیال پر وسعت کے علاوہ — جو کچھ اعمال اور توہمات مسلم معاشرہ میں پائی جاتی ہیں وہ سب من گھڑت و بے اصل ہیں، رافضیوں اور شیعوں کے ساتھ اختلاط اور سماجی تعلقات کے نتیجے میں سنی مسلمانوں کی معاشرت میں بھی داخل ہو گئی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض تو درجہ اعتقاد کو پہونچ کر ایمان کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں اور بعض کلچر کا حصہ بن کر بد عملی و رسوم پرستی کی شکل اختیار کر گئی ہیں، ان باطل اعمال اور خیالات سے خود بچنے اور امت مسلمہ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کی اتباع اور اس کی اشاعت کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

حیاتِ برزخی علامہ ابن تیمیہؒ کی نظر میں

آج کل کے جدید الفکر طبقوں نے علماء دین، ائمہ مجتہدین و متبوعین کو چھوڑ کر اتباعِ کتاب و سنت کے نام پر صرف ایک عالمِ دین یعنی ”امام ابن تیمیہ الحُرانی رحمہ اللہ“ کو پکڑ لیا ہے، تقلید کے شرک فی النبوۃ ہونے اور ترکِ تقلید کے ضروری ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر امت کو ابن تیمیہؒ کی جامد تقلید پر لا کھڑا کیا ہے، میں گذشتہ دنوں تقریباً ایک چلہ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں رہا، جمعے کے خطبوں اور ریڈیو پر ہونے والے محاضروں میں قال ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے قول کا ذکر شاذ و نادر ہی سننے میں آیا، اور شاذ و نادر ہی کوئی خطبہ یا مقالہ یا محاضرہ یا کوئی مضمون ایسا دیکھنے میں آیا جس میں کتاب و سنت کی وضاحت کے لئے ابن تیمیہؒ کے افکار و اقوال کا سہارا نہ لیا گیا ہو۔ مدینہ یونیورسٹی کے ایک معتدل المسلمک استاذ نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ دکتورہ کے ایک مقالے کے لئے عنوان کی بات چل رہی تھی، میں نے طلبہ ہی سے کچھ عناوین وضع کر کے دکھانے کے لئے کہا، طلبہ بیس بائیس عنوانات لکھ کر لائے اور سب کے سب ”ابن تیمیہ و افکارہ“ ہی پر مشتمل تھے، صرف تعبیرات جدا تھے۔ تعجب ہے کہ ایسی جامد و فاسد تقلید کے قائل ہونے کے باوجود یہ لوگ تیرہ صدیوں سے چلی آرہی ائمہ متبوعین کی معقول اور مدلل و محقق تقلید کو بدعت بلکہ شرک تک کہہ دینے کی جرأت کیسے کر لیتے ہیں؟ یعنی ہماری آہیں تو بدنامی کا سبب بن جاتی ہیں اور ان کے قتل و غارت کا کہیں چرچہ نہیں ہوتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

اس جدید فیشن یا کہنے قریب العہد نظریے کے دور رس نہیں چشم دید اعتقادی، عملی اور

تہذیبی مضمرات پر بہت کچھ اظہار خیال کا جی چاہنے کے باوجود اس وقت اس موضوع کو قلم انداز کر کے ایک دوسرے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ اور وہ مسئلہ ہے ”ایصالِ ثواب“ کا۔ آئے دن اس مسئلہ کے سلسلہ میں مرد و خواتین معلوم کرتے رہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ذریعہ مردوں کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جب ان کو اثبات میں جواب دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایصالِ ثواب سے میت کو نفع پہنچنا برحق ہے تو بتلاتے ہیں کہ ہمارے فلاں رشتہ دار یا اہل تعلق کہہ رہے ہیں کہ یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان ایصالِ ثواب کے لئے شائع کردہ احادیث صحیحہ کے ایک مجموعے کو دیکھ کر برہم ہوتے ہوئے کہنے لگے ”کیا ان حدیثوں کو چھاپ دینے اور لوگوں کے ان کو پڑھ لینے سے آپ کے باپ کی مغفرت ہو جائے گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر دین ہی کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ہی بد عمل رہ کر مر جاؤ، بچے ایصالِ ثواب کر کے کام بنا دیں گے، یہ سب بے کار باتیں ہیں جو جاہل مولویوں نے پھیلا رکھی ہیں، ورنہ آدمی کے ساتھ اپنے عمل کے علاوہ کچھ جانے والا نہیں ہے“ وغیرہ

یہ اور اس قسم کی بہت سی منطقیں ہیں جو قرآن و حدیث پر عمل کے نام سے ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، اور ہم حتی المقدور احقاقِ حق کی سعی کرتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے حالیہ سفر سعودی عرب کے دوران ایک مکتبے پر ایک مختصر رسالہ ”حکم عذاب القبر و عذابہم و نعیمہم“ کے نام سے نظر آیا، جو امام ابن تیمیہؒ کی ایک فتویٰ ہے جسے مدینہ یونیورسٹی کے ایک استاذ ڈاکٹر عبداللہ بن محمد نے اپنی تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے، اخیر میں خلاصے کے طور پر برزخ سے متعلق اہل السنۃ والجماعت کے ۳۱ عقیدے بھی نقل کردئے ہیں۔ چونکہ متواتر و متفق علیہ تقلید کو قولاً بدعت یا شرک قرار دے کر تنہا ابن تیمیہؒ کی تقلید کو عملاً تو حید و سنت اعتقاد کرنے والا طبقہ انہی کی تحقیقات کو حق سمجھتا ہے، خواہ وہ ان کا تفرد ہی کیوں نہ ہو، اس لئے امام ابن تیمیہؒ کے اس فتوے کو جو جمہور علماء اسلام کے اجماعی

اعتقاد کے مطابق ہے ترجمہ کر کے ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے، تاکہ ایسے لوگوں کے چشم و فکر سے پردہ اٹھانے میں مددگار ہو۔ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس زمانے میں لوگ خود مسترآن و حدیث پڑھ لیا نہیں کرتے تھے، بلکہ علماء سے معلوم کر لینے کو ضروری سمجھتے تھے۔

ان سے کسی نے درج ذیل استفتاء کیا تھا:

- (۱) کیا مردے زائرین کو دیکھنے اور ان کی آواز سننے پر قادر ہوتے ہیں؟
- (۲) کیا اس وقت ان کی ارواح ان کے ابدان کی طرف لوٹائی جاتی ہیں؟
- (۳) کیا ان کو پسماندگان کی طرف سے ایصال کئے گئے تلاوت و صدقہ کا ثواب پہنچتا ہے؟

(۴) کیا آدمی کی روح مرنے کے بعد پہلے مرچکے اپنے عزیز و اقارب کی ارواح کے ساتھ مل سکتی ہے؟

(۵) کیا آدمی کی روح اس جگہ منتقل کر دی جاتی ہے جس جگہ کی مٹی سے وہ پیدا ہوا تھا، خواہ کہیں مرا اور دفن ہوا ہو؟

(۶) کیا میت کو اس کے اعزہ و اقربا کے گریہ و بکاء کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے؟

سائل نے لکھا کہ ان سوالات کو لے کر (ہمارے علاقے میں) بہت تشویش پائی جاتی ہے، اس لئے کتاب و سنت، اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ متبوعین کی روشنی میں تسلی بخش جواب عنایت فرمائیے اور اختلاف کی صورت میں راجح قول کی نشاندہی بھی کیجئے، اللہ آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے گا انشاء اللہ۔

امام ابن تیمیہؒ ان سوالات کے جواب میں حمد باری تعالیٰ کے بعد رقم طراز ہیں:

(۱) جی ہاں! مردہ زائر کی آواز کو فی نفسہ سن لیتا ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب لوگ قبر کے پاس سے لوٹنے لگتے ہیں تو میت کو ان کے چپلوں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ (بخاری ۲/۲۴۴، مسلم ۴/۲۲۰)

اسی طرح حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے مقتولین کو تین دن تک یونہی پڑے رہنے دیا، اس کے بعد ان کی لاشوں کے پاس آئے اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اے ابو جہل ابن ہشام، اے امیہ ابن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ! کیا تم لوگوں نے تمہارے رب کے وعدوں کو برحق نہیں پایا؟ میں نے تو اپنے رب کے وعدہ کو بالکل سچ دیکھ لیا! حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کو سنا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ لوگ تو گل سڑ گئے، یہ کیسے آپ کی باتیں سن لینگے اور کیا جواب دے سکیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم سے بڑھ کر وہ لوگ میری بات سن رہے ہیں لیکن وہ بس جواب نہیں دے سکتے۔ (بخاری ۷/۳۵۰) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ (بخاری ۳/۲۴۷)

صحیحین میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو اہل قبور کو سلام کرنے کا حکم دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ قبرستان جاؤ تو یوں کہنا کرو: السلام علیکم اہل الدیار من المؤمنین والمسلمین الخ (مسلم: ۹۷۵) اس سلام و دعا میں اہل برزخ کو مخاطب کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطبت اسی سے ہوتی ہے جو سننے کا اہل ہوتا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جب بھی کوئی شخص کسی شخص کی قبر سے گزرے جس کو وہ پہنچاتا تھا اور اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اس میت کی روح اس کے جسم میں لوٹاتے ہیں تا کہ وہ سلام کا جواب دے سکے۔

(الاستذکار ۱/۲۳۴)

خود اپنے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب بھی کوئی مسلمان مجھ کو سلام کرے گا تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ میں لوٹا دے گا اور میں اس کے سلام کا جواب دوں گا۔ (مسند احمد ۱۶/۴۷۷)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: جمعہ کی شب اور اس کے دن میں مجھ پر کثرت سے درود پڑھو، کیونکہ تمہارا درود مجھ کو پہنچایا جاتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: ہمارا

صلوٰۃ و سلام آپ کو کیسے پہونچے گا جب کہ آپ بوسیدہ ہو جائیں گے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو گلا ناجائز کر دیا ہے۔

(ابوداؤد، النسائی، ابن ماجہ، احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان بسند صحیح)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر فرشتے مقرر کر دئے ہیں جو میری امت کا سلام مجھ کو پہونچاتے ہیں۔ (نسائی، احمد، دارمی وغیرہ بسند صحیح)

پس! یہ اور ان جیسی دیگر نصوص واضح کرتی ہیں کہ مردہ زندے کی آواز فی نفسہ سنتا ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر وقت سنتا رہے، بلکہ کسی وقت سنتا ہے تو کسی دوسرے وقت نہیں سن پاتا، جب کہ زندہ کو بھی ایسی صورت حال پیش آتی ہے کہ کبھی متوجہ کرنے والے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کبھی کسی عارض کی وجہ سے متوجہ نہیں ہو پاتا۔ البتہ یہ سننا ادراک و شعور کے تحت ہوتا ہے، اس پر کوئی جزا مرتب نہیں ہوتی۔ نیز یہ سننا وہ سننا نہیں ہے جس کی إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى سے نفی کی گئی ہے، کیونکہ اس آیت میں مطلق سننے کی نفی نہیں ہے، قبولیت و تعمیل والے سننے کی نفی ہے، اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو مردے سے تشبیہ دی ہے جو پکارنے والے کا جواب نہیں دے سکتا، اسی طرح چوپایوں سے تشبیہ دی ہے کہ آواز تو سن لیتے ہیں مگر معنی نہیں سمجھ پاتے۔ پس مردہ بھی اگرچہ پکارنے والے کی آواز سن لیتا اور اس کے مفہوم و معانی کو بھی سمجھ جاتا ہے مگر جواب دینے یا حکم پورا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو امر و نہی کا۔ باوجود سننے کے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

جہاں تک مردے کے دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کے جواز و ثبوت میں بھی حضرت عائشہؓ وغیرہ کے آثار موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب تک میرے کمرہ میں نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ مدفون تھے میں یہ سوچ کر کہ یہ تو میرے شوہر اور میرے والد ہیں کپڑے اتار لیا کرتی تھی، مگر جب حضرت عمرؓ بھی مدفون ہو گئے تو خدا کی قسم اس کے بعد میں کبھی بغیر اچھی طرح چادر اوڑھے اپنے کمرہ میں داخل نہیں ہوتی تھی، کیونکہ مجھے

عمرؓ سے حیا آتی تھی۔ (رواہ حاکم ۳/۶۱، واسنادہ علی شرط الشیخین)

(۲) یہ سوال کہ آیا مردے کی روح قبر میں اس کے بدن کے اندر لوٹائی جاتی ہے یا اس وقت اس کی قبر پر منڈلاتی رہتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مردے کی روح زیارت قبر کے وقت اس کے اندر لوٹادی جاتی ہے جیسا کہ خود حدیث شریف میں آیا ہے، زیارت پسماندگان کے علاوہ وقتوں میں بھی روح بدن میں وقتاً فوقتاً لوٹائی جاتی رہتی ہے۔

مومنین کی روحیں حدیث شریف کے مطابق جنت کے درختوں پر پرندوں کی طرح لٹکی ہوتی ہیں، جب اللہ تعالیٰ حشر فرمائے گا تو ان کے ابدان میں لوٹادی جائیگی۔ دوسری روایت میں ہے کہ ”پھر عرش پر لٹکی قندیلوں میں پہنچ جاتی ہیں“ (موطا امام مالک ۱/۲۴۰) اسی کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ چاہے بدن میں بھی پہنچتی رہتی ہے، اور یہ بدن میں روح کا آنا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس کی آمد و رفت اسی سرعت کے ساتھ ہوتی رہتی ہے جیسے کہ فرشتوں کی زمین و آسمان کے درمیان آمد و رفت ہوتی رہتی ہے یا جیسے سونے والے کی شعاعوں کے زمین پر آنے کی رفتار ہوتی ہے کہ کسی لمحہ وہاں ہوتی ہے تو کسی لمحہ یہاں! یہ بات متعدد آثار حدیث میں منقول ہے کہ روحیں قبر کے اندر رہتی ہیں یعنی کبھی (اور کبھی وہیں چلی جاتی ہیں جو ان کا مقام ہے)، یہ آثار ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور، ابن قیم کی کتاب الروح، ابن رجب کی احوال القبور اور سیوطی کی شرح الصدور وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۳) اب جہاں تک قراءت، صدقات اور دیگر خیر کے اعمال مردوں کو پہنچنے یا نہ پہنچنے کا سوال ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک صدقہ و خیرات، دعا و استغفار، نماز جنازہ اسی طرح قبر کے پاس (آزمائش برزخ میں تسہیل کے لئے) کی گئی دعا کا ثواب مردوں کو پہنچنے میں کوئی اختلاف نہیں (یعنی اس پر اہل السنۃ والجماعت کا اجماع ہے) البتہ عبادات بدنیہ مثلاً نماز، روزہ، تلاوت کا ثواب پہنچنے میں اگرچہ بعض

کو اختلاف ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان سب کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔

صحیحین میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ: اگر کسی مرنے والے کے ذمے روزے باقی رہ گئے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے یہ روزے رکھ لے۔ (بخاری ۲۲۶/۴) یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ ایک عورت کا انتقال ہوا جس کے ذمے روزے رہ گئے تھے تو آپ ﷺ نے اس کی بیٹی کو مرحومہ والدہ کی طرف سے روزہ رکھنے کا امر فرمایا۔ (بخاری ۲۲۷/۴) مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص (کے پوچھنے پر ان) سے فرمایا تھا کہ: تمہارے والد اگر مسلمان ہوتے تو تمہارا ان کی طرف سے صدقہ کرنا اور روزہ رکھنا انہیں نفع دے سکتا تھا۔ (مسند احمد، سنن ابوداؤد، بیہقی ۲۷۹/۶ بسند صحیح)

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے، اور مالکی علماء کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ (گویا جمہور علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ عبادات مالیہ کی طرح عبادات بدنیہ کا اجر و ثواب بھی میت کو پہنچایا جاسکتا ہے)

جن لوگوں نے **وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى** (النجم: ۳۹) سے یہ سمجھا ہے کہ زندوں کی سعی و عمل سے مردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو ان کی بات غلط ہے، اس لئے کہ سنت متواترہ اور اجماع امت سے یہ جو ثابت ہے کہ میت پر نماز جنازہ پڑھی جائے، اس کے لئے دعا و استغفار کی جائے، یہ بھی توسعی وغیرہ اور دوسرے کا عمل ہے، نیز صدقہ و خیرات اور مالی عبادات کا اجر پہنچنے پر پوری امت کا اجماع ہے جب کہ وہ بھی دوسرے ہی کا عمل ہے، جب یہ اعمال (آیت مذکورہ) کے منافی نہیں سمجھے گئے تو بقیہ اعمال صالحہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا، اور منکرین سے کہا جائے گا کہ تم آیت مذکورہ کے ہوتے ہوئے نماز جنازہ و دعائے مغفرت و خیرات کے جائز ہونے کا جو ثبوت دو گے وہی ثبوت ہم بقیہ اعمال صالحہ نماز، روزہ اور حج و تلاوت کے جواز کے لئے تم کو دینگے۔ ویسے علماء نے اس اشکال کے مختلف جوابات دئے ہیں، ان میں سے ایک مضبوط جواب یہ ہے کہ آیت **وَأَنْ لَّيْسَ**

لَا نُسَانِ إِلَّا مَا سَخَىٰ میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ انسانوں کو دوسرے کا عمل نفع نہیں دیتا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس کو اس کا عمل نفع دیتا ہے، یعنی وہ صرف اپنے عمل کا مالک ہے دوسرے کے عمل پر اس کا کوئی تصرف نہیں ہے، لیکن دوسرا اپنا عمل کسی اور کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس کی کہیں ممانعت نہیں، جیسا کہ مال کا معاملہ ہے کہ آدمی صرف اپنے مال کا مالک ہے، اسی پر حق رکھتا ہے، دوسرے کے مال پر اس کا کوئی حق نہیں، لیکن اگر دوسرا اپنا مال اپنی خوشی سے کسی کو دینا چاہے تو وہ برابر دے سکتا ہے، مال کی طرح کوئی اپنے اعمال (نافلہ) کا ثواب کسی اور کو دے دینا چاہے تو بلا خوف دے سکتا ہے، اس میں کوئی اشکال کی وجہ ہی نہیں ہے۔

(۴) کیا مرنے والے کی روح اور پہلے سے مرے ہوئے لوگوں کی روحوں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں؟

حدیث میں آتا ہے کہ میت کی روح جب آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے تو دوسری روحوں اس سے مل کر زندہ لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگتی ہیں کہ کیا حال ہے؟ پھر ان میں سے بعض روحوں کہتی ہیں ٹھہرو! اس کو ذرا آرام تو لے لینے دو۔.....

(ابن حبان، بطرانی کبیر ۴/۱۵۳، بسند ضعیف)

چونکہ زندوں کے اعمال و احوال کا مردوں کو علم ہو جاتا ہے اسی لئے حضرت ابوذر داء دعا میں کہتے تھے ”اے اللہ! میں آپ کی کسی ایسے عمل کے کرنے سے پناہ چاہتا ہوں جس کی وجہ سے عبد اللہ بن رواحہؓ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے“

یہ تو روح کے پہونچنے کے وقت پچھلی روحوں کا استقبال اور سوال و جواب تھا، جہاں تک ان روحوں کے مستقل قیام کا معاملہ ہے تو ان کی قیام گاہیں ان کے حسب مراتب ہوں گی، بعض جو اللہ تعالیٰ کے بہت ہی مقرب ہوں گے وہ اعلیٰ منازل میں ہوں گے اور جو اس مرتبے کے نہیں ہوں گے وہ ان سے کم مرتبے کی منزلوں میں ہوں گے، لیکن جب اللہ چاہے گا یہ روحوں جمع بھی ہوتی رہیں گی، جیسا کہ دنیا میں لوگ درجات کے تفاوت کے باوجود ایک

دوسرے کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ اب خواہ دفن کے اعتبار سے یہ اموات دنیا میں ایک دوسرے سے قریب رہی ہوں یا بعید وہاں تو اپنے اپنے مقام کے اعتبار سے ہوں گے۔ مثلاً کوئی کافر کسی مسلمان کے جوار میں مدفون ہو مگر روحیں وہاں ایک کی جنت میں ایک کی جہنم میں ہوں گی، یا مثلاً دو آدمی ایک ساتھ دفن کئے گئے ہوں مگر اعمال کے تفاوت کی وجہ سے دونوں میں دوری ہو سکتی ہے کہ کوئی عذاب کا حق دار ہو اور کوئی انعام و اکرام کا مستوجب تو یکجا دفن ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہوں گے۔

(۵) جسم کے پیدائش کی جگہ منتقل کر دئے جانے کی بات صحیح نہیں ہے، (اس جگہ دو روایات میں مصنفؒ سے خلطِ مبحث ہو گیا ہے، محقق نے حاشیہ میں اس کی صراحت کر دی ہے) انسان قیامت کے دن وہیں سے اٹھایا جائے گا جس جگہ مرا اور مدفون ہوا، نیز تدفین کے بعد اس کے جسم کا قبر میں پایا جانا عام تجربہ و مشاہدہ ہے، محض وہم و گمان کے ذریعہ مشاہدہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا، پس انتقالِ جسم کا خیال عقل و نقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔

(۶) کیا میت پر رونے سے میت کو تکلیف ہوتی ہے؟

اس مسئلے میں علماءِ سلف و خلف کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں صحیح بات یہ ہے کہ میت کو پسماندگان کے اس عمل سے تکلیف پہنچتی ہے، جیسا کہ بخاری (۱۸۰/۳) میں ہے ”میت کو اس کے گھر والوں کے رونے اور بین کرنے سے عذاب ہوتا ہے“ اسی طرح حضرت عبداللہ بن رواحہ کے واقعہ (بخاری ۵۸۹/۷) میں ہے کہ ان کے سکرات کے موقع پر ان کی بہن بین کر کے رونے لگیں تھیں اور اس بیچ میں ان کو ہوش آیا تو انہوں نے فرمایا ”جب بھی تم میری کوئی تعریف کر رہی تھیں تو مجھ سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا تم واقعی ایسے ہی ہو؟“

برخلاف اس کے بہت سے علماءِ سلف و خلف کی یہ بھی تحقیق ہے کہ میت کو عذاب نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں میت کا کوئی قصور نہیں اور دوسرے کے گناہ کی وجہ سے اس کو عذاب دئے جانے کا کوئی جواز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ

اُخْرٰی (الانعام: ۱۶۴) پھر جو احادیث صحیحہ اوپر مرقوم ہوئی ہیں ان کے سلسلہ میں ان علماء میں سے بعض مثلاً حضرت عائشہؓ اور امام شافعیؒ نے راویوں کی تغلیط کی ہے، بعض مثلاً امام مزنیؒ وغیرہ نے میت کے اس سے راضی رہنے اور تاکید کرنے پر محمول کیا ہے کہ اگر میت اس عمل کو پسند کرتا تھا یا اس نے خود اس کی وصیت کی تھی تو ان زندوں کی اس حرکت سے اس کو بھی عذاب ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں میت اپنی پسند کی وجہ سے اس سزا کی مستوجب ہو جائے گی۔

یہ اقوال ضعیف ہیں جب کہ ان کے مقابلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے صحابہ کرامؓ سے مروی احادیث واضح اور مضبوط ہیں۔ (آگے مصنف سے ایک دوسری بحث چھڑ گئی ہے جو نفس موضوع سے متعلق نہیں ہے اس لئے ترک کر دی گئی ہے۔) از مترجم (البتہ یہ اشکال کہ بلا قصور سزا دینا اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل اور اصولِ دین و لا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقاب اور سزا تو نائحہ یعنی بین کرنے اور رونے والوں ہی کو ملے گی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اس کو قیامت کے دن سوزش کی قمیص اور تار کول کا پا جامہ پہنا یا جائے گا۔ (مسلم: ۹۳۴) یہاں عذاب سے مراد تکلیف و اذیت ہے عقاب اور جزاء عمل نہیں، اسی وجہ سے یعذب کہا گیا ہے یعاقب نہیں کہا گیا، عذاب عقاب کے مقابلے میں اعم ہے، یعنی اس کے معنی میں وسعت ہے، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے سفر کو قطعۃ من العذاب فرمایا ہے جو کھانے پینے کی مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ (بخاری ۳/ ۷۲۸) پس معلوم ہوا کہ احادیث میں پسماندگان کے نوحہ کرنے اور بین کرنے سے میت کو عذاب ہونے کی جو بات کہی گئی ہے وہ کسی کے عمل کا بوجھ کسی دوسرے پر ڈالنا نہیں ہے بلکہ اپنے معنی کی وسعت کے اعتبار سے دوسری چیز ہے یعنی اذیت و تکلیف کا محسوس ہونا۔ بہر حال میت کو اس عمل سے تکلیف ہونا واضح ہے۔ یہ تو سب ہی مانتے ہیں کہ قبر میں آدمی مختلف

طریقوں مثلاً خوفناک آوازوں، متعفن بدبوؤں اور قبیح شکلوں کے ذریعہ عذاب دیا جاتا ہے، تو پھر اسی کے انکار کی کیا وجہ ہے کہ میت کو اس کے لوگوں کے نوحہ و بکاء سے عذاب ہوتا ہے؟ (غور کیا جائے تو مصنفؒ نے اتنی ساری تفصیل اور حضرت عائشہؓ کی بھرپور تردید کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ وہی ہے جو حضرت عائشہؓ کا موقف ہے۔ از مترجم)

(اداریہ جولائی ۱۲ء)

اعتکاف میں آداب کی رعایت

اس شمارے کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک رمضان المبارک کا عشرہ رحمت نکل چکا ہوگا اور عشرہ مغفرت کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ اس لئے اس شمارہ میں رمضان المبارک کی نسبت سے تو صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام عشرہ اخیرہ کے اعتکاف اور شب قدر کی تلاش کی طرف خصوصی توجہ خود بھی فرمائیں اور متعلقین و احباب کو بھی متوجہ کریں۔ شب قدر اگرچہ غیر متعین شب ہے مگر احادیث مبارکہ میں اُسے رمضان کے عشرہ اخیرہ کی راتوں میں محصور بھی بتلایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عشرہ اخیرہ کے اعتکاف کی مصلحت شب قدر کی تلاش اور حصول کو یقینی بنانا ہی قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں شب قدر کو یقینی طور پر پالینے اور اس کے خیر سے محروم ہونے سے اپنے کو بچانے کا شاید اعتکاف سے بہتر، آسان اور باوقار طریقہ کوئی اور سوچا بھی نہیں جاسکتا، سوچیں تو دریافت بھی نہ ہو سکے گا۔ اللہ پاک پوری امت کی طرف سے آقائے محسن و مہربان ﷺ کو بہترین جزا عطا فرمائے جنہوں نے ہم کمزور عزم و ہمت والوں کے لئے آخرت کی بھلائیاں حاصل کرنے کے نہایت آسان طریقے سکھائے اور ہمیں ان احسانات کی قدر دانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اعتکاف کی ترغیب کے علاوہ باتوفیق دوستوں بالخصوص نوجوانوں سے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ہر عمل کی طرح اعتکاف میں بھی نیت کا استحضار اور مقاصد کا استذکار بار بار کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر اچھے عمل کو عادت سے عبادت کی طرف منتقل کر کے بندہ کیلئے اجر و ثواب اور ترقی درجات کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں مگر نفس و شیطان اسے عبادت سے عادت و رسم کی

طرف لے جا کر بے شمر و بے اجر بنادینے کی سازش میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے بیچ میں نیت کو رکھا گیا ہے، تجدید نیت سے عادت عبادت بن جاتی ہے، یعنی ہر عمل سے قبل مقاصد شرعیہ کا لحاظ اور رضائے الہی کے خیال کو تازہ کرنا پھر دوران عمل آداب کی رعایت اور احکام کے احترام کو ملحوظ رکھنا، نیز ایک دوسرے کو اپنے ضرر سے بچانا بہت ضروری ہے، اسی کے بعد کسی عمل کا دنیوی و اخروی نتیجہ صحیح معنوں میں میسر آتا ہے، پس جو لوگ اپنے مقام کی مسجدوں میں انفراداً معتکف ہوتے ہیں ان کو بھی اور جو لوگ اپنے مشائخ یا معتبر علماء کی معیت میں تعلیم و تربیت کا زائد نفع اٹھانے کی غرض سے اجتماعاً اعتکاف کرتے ہیں ان کو بھی سب ہی کو کوشش کرنی چاہیے کہ مقاصد اعتکاف کو ملحوظ خاطر رکھیں اور منشاء صرف رضائے الہی اور شب قدر کی برکات کا حصول ہو۔

اسی طرح مساجد کے بیوت اللہ ہونے اور اس کے آداب کی اہمیت کو فراموش نہ کریں ہر شخص اپنے کوتاہیاں آیا ہوا سمجھے، دوستانہ ہمارے آج کل کچھ زیادہ معتبر نہیں ہوتے، اکثر دوستوں سے دینی لحاظ سے نفع کم نقصان زیادہ ہوتا ہے، اعتکاف میں اگرچہ مباح کلام ممنوع نہیں ہے مگر اس بہانے ہمارا نفس ہمیں معاصی تک پہنچا دیتا ہے، غیبتوں تک کا ارتکاب ہو جاتا ہے، کچھ نہیں تو کم از کم فضولیات میں مبتلا تو ضرور ہی ہو جاتا ہے، جبکہ روحانیت کو نقصان پہنچانے کے لئے فضول کلام کچھ کم زہر نہیں ہے، اسی لئے حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں کہا جاتا ہے کہ اعتکاف میں یہ سب سے بڑا پرہیز تھتا کہ آپس میں باتوں کی اجازت نہ تھی۔ مختصر یہ کہ اعتکاف میں نیتوں کی صحت اور اوقات کے صحیح استعمال کی طرف توجہ ضروری ہے ان باتوں کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اعتکاف جیسی عظیم عبادت کی شان اور اس کی شکل متاثر ہو رہی ہے اور عام مسلمانوں پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگ عام طور سے وقتی اعمال پر قناعت کے عادی ہوتے

جار ہے ہیں، عوام کا تو خیر پہلے ہی سے یہ مزاج تھا خواص بھی اب اس کے خوگر ہوتے جارہے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم کچھ ایسا نظام بنائیں اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے رمضان المبارک میں کی گئی عبادتوں اور مجاہدوں کی برکات اگلے رمضان تک متعدی ہوں، تاکہ دین و ایمان اور اعمال و اخلاق میں ہر سال ترقی ہو سکے، اب ایسا ہو رہا ہے جیسے کوئی شخص بڑی مشکل سے ایک سیڑھی چڑھے پھر بجائے اگلی سیڑھی چڑھنے کے واپس پہلی سیڑھی پر آجائے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص عمر بھر اسی جگہ رہے گا آگے نہ بڑھ سکے گا، ہر رمضان ہمارے لئے قرب الہی کے اگلے مرحلے کی طرف ترقی کا سبب ہونا چاہیے، اگر ہم ہر سال رمضان میں سنبھل جائیں پھر حسب حال بحال ہو جائیں تو اگرچہ رمضان کے یہ اعمال و اشغال، انفاق مال اور توبہ و استغفار، ہماری پاکی کا تو حسب وعدہ الہی سبب بن جائیں گے، مگر ترقی کا سبب نہ بن پائیں گے، ترقی کا سبب یہ اعمال اس وقت ہوں گے جب کہ اس سطح کو اگلی رمضان تک قائم رکھیں اور اگلے رمضان میں اس سے اوپر اٹھیں، یوں ہر رمضان ایک سیڑھی کے مثل ہمارے ایمان و یقین اور تعلق مع اللہ کو پروان چڑھاتا رہے گا۔ امید کہ قارئین کرام اس پر غور فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ خود مجھے اور میرے تمام احباب و قارئین اور جمیع مسلمین کو دین و ایمان میں ترقی کے لئے مسلسل سعی کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

(اداریہ اگست ۱۲ء)

رمضان کے بعد!

رمضان المبارک کا مبارک و مسعود مہینہ تیس دنوں تک اپنی باغ و بہار برکات و رحمت دکھا کر بالآخر رخصت ہو گیا، خدا تعالیٰ کے بندوں نے حسبِ قدرت و توفیق اس بارانِ رحمت و بہار مغفرت سے بہرہ لیا، ہر چہار طرف صیام و قیام، خیرات و صدقات، انفاق و ایثار اور ذکر و تلاوت ہی کی باتیں اور اسی کے مناظر آنکھوں کے سامنے تھے، اس کے بعد سعید سعید کی مسرتوں اور خوشیوں نے ایک دوسرے کو قریب اور بغل گیر کر کے ان رحمتوں کی تکمیل کر دی۔ فالحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات۔

اب رمضان المبارک کو تو گزرنے لگا لیکن رمضان میں ملی نعمتوں کا تحفظ ہمارے ذمے رہ گیا، کہنا چاہئے کہ ایک مہینے تک رمضان انگلی پکڑ کر ہمیں چلاتا رہا اور آگے اسی طرح خود چلتے رہنے کی تاکید کر کے چھوڑ گیا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ بندگی کی اس شان کو یعنی طاعات کے اہتمام اور معصیات سے اجتناب کو حتی المقدور اسی طرح باقی رکھنے کی کوشش کریں، عزائم اور ارادے تو سب نے اچھے ہی کئے ہیں مگر نفس و شیطان کے مقابلے میں ہم لوگ اکثر ہار جاتے ہیں، بعض جلد بعض بہ دیر!

رمضان المبارک کی سب سے عظیم سوغات ”نورِ تقویٰ“ کا حصول ہے، قرآن کریم میں روزہ کا مقصد لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ فرمایا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ روزہ رکھ کر بھی اگر کسی نے گناہ کا کام اور گناہ کی باتیں ترک نہیں کیں تو اس کا یہ بھوکا پیاسا رہنا فاقہ تو کھلا سکتا ہے صوم کا مبارک و محبوب کا عمل بن نہیں سکتا۔

معلوم ہوا کہ ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے صوم کا ماحول بنا کر ہمیں تقویٰ اللہ کی دولت سے سرفراز کیا گیا ہے، اور تقویٰ کی حقیقت ”امتثال الاوامر واجتناب عن النواہی“ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالاتے رہنا اور اس کی منہیات و ممنوعات سے اپنے کو دور رکھنے کی سعی کرتے رہنا۔ پس مبارک ہیں وہ بندے جنہیں رمضان کے بعد بھی رمضان میں ملی اس عظیم نعمت تقویٰ کے تحفظ کی توفیق ہو جائے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ

منکرین فقہ کا ظلم وعدوان^۱

ادھر چند برسوں سے ایک دین نا آشنا طبقے کی مہربانیوں سے جیسے ہی رمضان المبارک کا چاند نظر آجاتا ہے اختلافی مسائل کے مباحث چھڑ جاتے ہیں، شہسروں سے لے کر دیہاتوں تک مختلف علاقوں سے ملی خبروں کے مطابق عوام الناس میں بجائے عملی جدوجہد کے علمی بحث و مباحث کا بازار گرم رہا اور وہ بھی پوری بے علمی و جہالت کے ساتھ! اس لئے کہ بحث و تحقیق علما کا کام ہے اور اس کے لئے مسئلہ مجوٹ عنہا سے متعلق موافق و مخالف دلائل اور اختلاف کے اسباب پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان عوام کے بس کا کام نہیں جو دین کے بنیادی علم سے بھی بے خبر ہیں چہ جائیکہ وہ اصول روایت و درایت اور اساس تفقہ و اجتہاد کی بصیرت رکھتے ہوں۔

منکرین فقہ اپنے عمل کے ذمہ دار اور عند اللہ جواب دہ ہیں کہ انہوں نے محض اپنے مسلک کی توسیع و اشاعت کے لئے دور حاضر میں ملے چند مادی اسباب کو استعمال کرتے ہوئے عمل بالحدیث کے نام پر مسلمانوں کے درمیان جو انتشار و اختلاف برپا کیا ہے اس کا شرعی جواز کیا ہے؟ کیا ماضی میں علمی مباحث کبھی عوام کا لانعام کے حوالے کئے گئے تھے؟ کیا اختلافی مسائل کو کبھی دین اور بے دینی یا ضلالت و ہدایت کے خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا؟ کیا محدثین کے اصول اخذ و رد اور فقہاء کے ضوابط تقدیم و ترجیح کا اصل محرک اتباع سنت اور

۱۔ اس طبقے کے لئے اہل حدیث، سلفی، غیر مقلد کسی نام کا اطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا، وہ صحیح معنوں میں حدیث پر عامل ہیں، نہ سلف کے پیروکار ہیں اور نہ ہی تقلید سے محفوظ ہیں، بس ان کا کام فقہ اور فقہاء کا انکار ہے۔

مراد نبوی تک پہنچنا ہی نہیں ہے؟ کیا علماء غیر مقلدین کو نہیں پتہ کہ اختلافی مسائل میں اصلاً اختلاف کتاب و سنت کے فہم، معانی کی تعیین اور روایات میں ترجیح و تطبیق کے سلسلہ میں ہوتا ہے، ہر فریق اتباع کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے پاس اپنے موقف کو ترجیح دینے کے لئے عقلی و اجتہادی دلائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، چونکہ وہ اس سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس سے زیادہ کامکف بھی نہیں، اس لئے یہ اجتہادی نتیجہ اس کیلئے اور اس پر اعتماد کرنے والے کے لئے قابل عمل اور شریعت میں مقبول و معتبر ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہوتا کہ حنفی اپنا موقف اجتہاد شخص سے ثابت کرتا ہے اور سلفی وحی الہی سے اس کو متعین کرتا ہے، ظاہر ہے کہ ختم نبوت اور انقطاع وحی کے بعد اس کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی مراد الہی اور منشاء نبوی ہے، دوسری کوئی صورت کا احتمال نہیں۔ اور کرتا ہے تو کذاب و مفتری قرار پا کر جب خود ہی مردود ہے تو دوسروں کے لئے ایسا شخص مطاع و راہنما کیسے بن سکتا ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ مواقع اختلاف میں ایک ہی معنی متعین یا ایک ہی موقف قابل ترجیح ہوتا ہے تو اولاً تو اس کی کوئی دلیل نہیں دوسرے پھر کیا ضروری ہے کہ غیر مقلدین کا موقف ہی برحق اور متعین ہو کسی اور کا کیوں نہیں ہو سکتا؟

یہ حقیقت ہے کہ اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف ناگزیر ہے، جہاں اختلاف کی کوئی شرعی وجہ نہیں وہاں علماء امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، سب کا ایک ہی موقف ہے اور سب متحد ہیں۔ پھر جن مسائل میں اختلاف ہوا ہے وہ یا تونس کے معنی میں ایک سے زائد احتمالات ہونے کی وجہ سے ہوا ہے، یا نصوص میں تعارض کی وجہ سے ہوا ہے، یا نصوص اور تعامل میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے، یا صحابہ کرامؓ کے عمل میں تعدد کی وجہ سے ہوا ہے، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کی یہ وہ وجہ ہیں جن کی واقعیت و واجبییت سے کوئی صاحب علم تو کیا کوئی عقل مند بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی معقول اور ناگزیر وجہ سے بعض مسائل شریعت کی تعیین و ترجیح میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہوا وہ تمام علماء و عقلاء امت کے

نزدیک خیر سمجھا گیا اور محمود قرار پایا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اجتہادی اختلاف اسلام کے مزاج رحمت اور اصول تیسرے تسہیل کے حوالہ سے دیکھا جائے تو تکوین و تقدیر ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اختلاف الوان والسنہ قرآن کریم کی روشنی میں توحید باری تعالیٰ کی آیت بن سکتے ہیں تو علوم نبویہ کے ذریعہ عمل کی مختلف شکلوں کا وجود میں آنا توحید و رسالت کو متاثر کرنے کا سبب کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان چند مسائل کی بنیاد پر علماء امت کے درمیان جو اختلاف وجود میں آئے ان کو لے کر بڑے بڑے علمی مباحثے منظر پر آئے اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کے تبادلے ہر زمانے میں ہوتے رہے، کتابیں لکھی گئیں، علوم اسلامیہ میں ان کی وجہ سے متعدد فنون کا اضافہ ہوا، لیکن اس سب کے باوجود اگادگات و اتفاقات کو چھوڑ کر — جن سے اتنے بڑے سماج کا خالی ہونا ممکن بھی نہیں اور ان کی کوئی انصاف پسند پذیرائی بھی نہیں کرتا — اہل اسلام علماء و عوام متحد و متفق اور ایک دوسرے کے حقوق کے محافظ رہے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسرے کی حمایت و تائید سے بھی گریز نہ کیا۔ چونکہ یہ اختلاف فہم و عقل اور استنباط و استخراج میں ہوتا تھا اس لئے ہر مفسر اپنے موقف کو اپنی کوشش میں کامیابی کے اطمینان پر غلطی کے امکان کے ساتھ ”صحیح“ اور دوسرے کے موقف کو اس کی دیانت و دلیل کے اعتماد پر صحت کے امکان کے ساتھ ”غلط“ سمجھتا تھا، اسی امکان کی گنجائش و وسعت نے اختلاف میں اتحاد اور خصوصیت میں مودت و محبت کی شان پیدا کر دی تھی۔

یہ ساری تفصیل اس لئے لکھنی پڑی کہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران طبقہ منکرین فقہ کی طرف سے توسیع مسلک اور تبلیغ موقف کی جو جارحانہ و جاہلانہ مہم شروع کی گئی ہے اس نے مذکورہ بالا معیار اختلاف اور وقار علم و عمل کو تاخت و تاراج کر کے تنفر و توہش کا ماحول قائم اور بغض و عناد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس صورتحال پر جس قدر بھی غور کیا جاتا ہے تو اس کی درج ذیل وجوہ سمجھ میں آتی ہیں کہ ان حضرات نے

● اختلافی مسائل میں اپنے موقف کو اس طرح حتمی اور قطعی سمجھ لیا ہے جیسے وحی آسمانی سے مؤید کر دیا گیا ہو، گویا ان کا موقف ایک عقیدہ ہے جس سے سرموانحراف کی گنجائش نہیں، اسی لئے اس کی باقاعدہ دعوت دیتے اور اس کے خلاف کو بے دینی و گمراہی سمجھتے ہیں، جب کہ ایسا سمجھنا حقیقت واقعہ اور عقیدہ متواترہ کے خلاف ہے۔

● احادیث و آثار کے صحت و سقم کے سلسلہ میں اصول متواترہ کو نظر انداز کر کے کتب متعینہ بلکہ کتاب واحد یعنی بخاری شریف پر انحصار کر لیا گیا ہے یا شیخ البانیؒ کی تصحیح و تضعیف کو حرف آخر مان لیا گیا ہے۔ اگرچہ کہ یہ انحصار بھی عملاً اپنی ضرورت کی حد تک ہی ہے، کل مرویات پر نہیں۔

● خالص علمی مباحث کو جو فوری علم اور احاطہ معلومات کے متقاضی ہیں عوام الناس کے — جوان مباحث کے الف بے سے بھی واقف نہیں ہوتے — حوالے کر کے انہیں انتہائی سطحی اور نعوذ باللہ سوتی حد تک اتار دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے تحقیق و اجتہاد کا اختلاف دین و ایمان کے اختلاف کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

● اپنا اصولی موقف اپنے اکابر کے حوالہ سے مضبوط رکھنے کے بجائے ”سلفیت“ سے جوڑ دیا گیا ہے، اور اس میں تلبیس سے کام لیا گیا ہے، کیوں کہ حنابلہ کی سلفیت مخصوص کلامی موقف سے تعبیر ہے، جبکہ غیر مقلدین کی سلفیت فقہی موقف و امتیاز پر مبنی ہے۔ چنانچہ سعودی علماء سلفیت کے حوالہ سے استواء علی العرش، الایمان قول و عمل، اور باری تعالیٰ کے وجودی فوقیت و علویت جیسے مباحث پر بولتے لکھتے رہتے ہیں اور غیر مقلدین سلفیت کے نام سے آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ وغیرہ مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ گویا اتحاد مسلک کا فریب دے کر ان کی سرکاری و مالی تائید حاصل کی گئی ہے، اور اس کا استحصال کرتے ہوئے سعودی عرب میں آنے والے نوجوانوں کو باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ اب تک بدعقیدہ و بدعمل تھے، کم از کم اب ان کے ذریعہ اپنے دین و ایمان کو صحیح کر لیں۔

● مسائل قیاسیہ و نواز لہ میں اپنے پاس کوئی صحیح صریح نص نہ ہونے کے باوجود حنابلہ کے فتاویٰ اور ان کی تحقیقات کو ان کی مالی مدد سے عام کیا جا رہا ہے، اسی پر عمل کیا اور کرایا جا رہا ہے، اس طرح کہ یہی وحی آسمانی ہے اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ فعلِ شیطانی ہے۔

● حنابلہ کے بمقابلہ احناف کو بالخصوص کمزور دکھانے، ان کی تصغیر و تحقیر کرنے اور ان پر صدیوں سے بلکہ خیر القرون سے بنے اعتماد کو متاثر و مضحک کرنے کے لئے شرمناک تعبیرات کا استعمال کیا جا رہا ہے، فرضی داستانیں وضع کی جا رہی ہیں اور کتب فقہ کے لاکھوں مسائل میں سے بعض ضمنی مسائل یا تسمات کو چُن چُن کر پھیلا یا جا رہا ہے، یہ تاثر دیتے ہوئے کہ فقہ بس ایسی ہی باتوں کا نام ہے، گویا فقہاء کرام نے اپنی عمریں پیشاب سے تعویذیں لکھنے، انگلیوں سے غلاظت چاٹنے اور جانوروں سے بدعلی کرنے کی وکالت و حمایت میں گزاری تھیں، اور ان کے متبعین اب تک بھی یہی کر رہے ہیں۔ رہ گئی عبادت و انابت، تقویٰ و طہارت، خوف و خشیت تو یہ سب سلفیوں کے حصے ہی میں آئے ہیں، تقریر و تحریر کا یہ انداز مسلکی تعصب کی بدترین و نادر صورت حال ہے۔

● فقہ و فتاویٰ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ سب قیاسی مسائل ہیں اور قیاس شیوہٴ ابلیس ہے اس کا کتاب و سنت سے کوئی تعلق نہیں، تاکہ عوام الناس علماء سے آزاد ہو کر انہی کی بتائی ہوئی ہر بات کو برحق مان لیں یا پھر بدرجہٴ مجبوری حنابلہ سعودیہ کے فتاویٰ اور خیالات اختیار کئے جاسکیں، حنفیہ کے تو ہرگز نہیں۔

اسی صورت حال کو ہم نے منکرینِ فقہ کی جارحانہ و جاہلانہ مہم سے تعبیر کیا ہے، ان کے سنجیدہ طبقے سے ہمیں نہ پہلے کوئی اختلاف تھا اور نہ اب ہے، البتہ اس صورت حال کی خاموش تماشاخی بنے رہنے اور اس کے نتیجے میں پیش آمدہ دین بیزاری و عداوت باہمی کو گوارا کر لئے جانے پر اس طبقے کے علماء و قائدین پر تعجب ضرور ہے۔ جب کہ دین محض ان اختلافی مسائل کا نام نہیں ہے، دین ان مسائل کے اختلاف کا متحمل ہو سکتا ہے مگر اس نفرت و انتشار اور کسی

ایک موقف پر ناروا اصرار کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا، کتاب وسنت صرف نماز اور نماز کے بھی چار مسائل کا نام نہیں ہے، کتاب وسنت تو ایمانیات سے لے کر اخلاقیات تک تمام شعبہ ہائے حیات کی راہنمائی کرتے ہیں، حقوق اسلام و مسلمین پر روشنی ڈالتے اور اس کا سختی سے پابند بناتے ہیں، تہذیبی ورثے کی طرف توجہ دلاتے ہیں، لیکن ان سب سے بے خبر اور بے پروا ہو کر اس طبقے کی اکثریت حقوق اسلام و مسلمین کو پامال کر رہی اور نفرت و علاحدگی کی دیواریں تعمیر کر رہی ہے۔

رمضان تمام چاروں طرف یہی سوالات اور یہی مباحث چلتے رہے، مثبت و مفید کاموں میں کم اور منفی و مضر بلکہ بعض لغو و لالیعنی باتوں میں وقت ضائع ہوتا رہا، علماء کا بھی عوام الناس کا بھی۔ تراویح میں یہ لوگ سب مل کر ایک طرف کو کھڑے ہوتے ہیں تاکہ آمین کی گونج کر سکیں، آٹھ رکعت ہوتے ہی صفوں میں سے نکل کر صحن میں انفرادی نفلیں پڑھتے ہیں یا قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، بعض تو مسجد کی چھتوں پر سگریٹ نوشی اور گپ ہاشی میں مصروف ہوتے ہیں مگر مسجد میں نماز باجماعت اور تسلسل تلاوت سے استفادہ نہیں کرتے، جیسے آٹھ سے زائد نماز ان کے ہاں نماز نہیں کوئی بڑا گناہ اور فحش عمل ہو^۱۔ اعتکاف میں آتے ہیں تو بھی انہی مسائل کی اشاعت کرنے اور انہی امور پر اصرار رکھانے کے لئے آتے ہیں، مغرب سے قبل عین امام کے پیچھے سنت کی نیت باندھ لیتے ہیں، خطبے میں قصداً تاخیر سے آ کے بیچ مسجد میں سنت شروع کر دیتے ہیں، جبکہ ایک طرف کو ہو کے بھی پڑھ سکتے ہیں، بعض جگہ معمولاً جماعت کے بعد آ کر علاحدہ جماعت بناتے ہیں، ٹوپی پہننے کو کبیرہ گناہ سے کم نہیں سمجھتے^۲، دینی مجالس میں بھی کوئی سوال کرتے ہیں تو انہی اختلافی امور سے متعلق

۱۔ مجھے امریکہ میں مقیم ایک عالم دین نے بتایا کہ شیخ البانیؒ جب وہاں بلائے گئے تھے، ان کی قیامگاہ سے قریب مسجد میں بیس رکعت تراویح ہوتی تھی، شیخ بھی مکمل پڑھتے تھے کسی کے اعتراض پر فرمایا کہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے، میں قائل تو آٹھ رکعت تراویح کا ہی ہوں مگر اس کے بعد بھی اگر نوافل جاری ہیں تو میں اس کو کیوں ترک کروں؟

۲۔ ایک نوجوان کو اسی رمضان میں خود دیکھا کہ کھڑے کھڑے وضو بنایا، جوتوں پر مسح کر لیا، اور پھر جوتے باہر چھوڑ کر مسجد میں نماز ادا کر لی، اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کونسا مسلک ہے؟

کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چند مسائل کے علاوہ دین و ایمان کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ نری بے دینی کی بات ہے۔

اس تیزی سے بڑھتی جا رہی بے دینی کی عام صورتحال کے ذمہ دار وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سوائے ان علامتی مسائل کے اور کسی مسئلے کی اہمیت سے اپنے طبقے کو واقف نہیں کراتے اور نہ اختلاف کے حدود و آداب سے باخبر کرتے ہیں۔ الحمد للہ ہم لوگ تو ہمارے نوجوانوں کے معلوم کرنے پر یہی کہتے ہیں کہ وہ عمل اور طریقہ بھی مروی ہے جیسے ان لوگوں نے اختیار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک مسنون ہونا ثابت نہیں۔ اس دینی ناانصافی اور عملی خیانت کا جواب اگر اُسی طرز و انداز پر دیا جائے تو یہ ہمارے لئے کوئی بڑی بات نہیں، جہالت و جارحیت کیلئے کرنا ہی کیا پڑتا ہے؟ لیکن دو باتیں ہمارے لئے رکاوٹ ہیں، ایک تو یہ کہ اس صورت میں نہ تو احادیث و روایات کا احترام باقی رہے گا نہ محدثین و رواۃ کا مقام قائم رہ سکے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو یہ نقصان ہو چکا ہے۔ ان کے ہاں عام رجحان میں صحیح کا مطلب سچ اور ضعیف کے معنی جھوٹ ناقابل التفات بلکہ وضع محض کے ہو گئے ہیں، جبکہ بات ایسی نہیں ہے، یہ اور ان جیسی تمام اصطلاحات صرف فنی معیار اور وضعی مفاہیم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہیں ورنہ یہ بات مسلم ہے کہ بسا اوقات کوئی صحیح حدیث ہر اعتبار سے صحیح و صریح ہونے کے باوجود ناقابل عمل اور ایک ضعیف روایت ضعف و جرح کے باوجود شواہد و تواضع یا تعامل و توارث کی مدد سے لائق احتجاج و استفادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کیلئے وسیع علم اور اصول و ضوابط پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح خود جرح و تعدیل میں ائمہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ ہر ایک کے اصول الگ ہیں، پھر جرح و تعدیل کے انداز و الفاظ میں قوت و ضعف کا اختلاف پایا جاتا ہے، نیز ائمہ جرح و تعدیل میں تشدد و تساہل بصیرت و عجلت کا اختلاف موجود ہے۔ غیر مقلد حضرات نے محدثین کے وضع کردہ اصطلاحات کے حوالہ سے صرف صحیح و ضعیف کی بحث عوام کو یاد کرا کے دیگر ضوابط و تفصیلات

سے بے خبر رکھا ہے۔ اب اگر ہم بھی تمام قواعد و ضوابط سے صرف نظر کر کے صرف مفت البہ آرائی اور فتح مندی کے جذبات سے آگے بڑھیں اور محض یک طرفہ بات کرتے رہیں تو عوام کے جہل کا فائدہ تو اٹھایا جاسکتا ہے مگر اپنے ہی دین کی جڑوں کو کھوکھلا ہونے سے بچایا نہیں جاسکتا۔ ہم محدثین و فقہاء دونوں کا احترام و اعتماد بحال رکھنے کو دین اسلام کی حفاظت کیلئے لازم سمجھتے ہیں، کیوں کہ جس طرح سے فقہ اور فقہاء کی پکڑیاں اچھالی جا رہی ہیں اسی طرح اصول حدیث اور محدثین کی قبائیں اتاری جانے لگیں تو پھر دین اسلام تو ایک مذاق و مفروضہ بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے ہمارا طریق یہ ہے کہ اختلافی امور میں اختلاف کی نسبت محقق اور مجتہد کی طرف کی جائے، اس کو دین و بے دینی یا حق و باطل کا اختلاف نہ کہا جائے، نیز مجتہد اور اس کے تبع کیلئے اپنی تحقیق کو اختیار کرنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ اس لئے کہ ہر فریق نے کتاب و سنت سے استشہاد کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ ایک کا استشہاد دوسرے کے نزدیک کامل نہیں۔ چنانچہ ہم اپنی تحقیق کے مطابق جس موقف کو مجروح و مطروح سمجھتے ہیں اس کی بھی تو بین و تنقیص نسبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے جائز نہیں سمجھتے، تضلیل تو دور کی بات ہے، کیوں کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات کی نسبت جائز نہیں اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب باتوں کو کسی مضبوط و مستحکم دلیل کے بغیر اور صحت کے امکان کے باوجود یکنخت رد کر دینا بھی صحیح نہیں۔

آپ غور کریں کہ احادیث مبارکہ کی محض روایتی صحت و ضعف کی بنیاد پر تقسیم کا جو کام شیخ ناصر الدین البانیؒ نے انجام دیا سابقہ محدثین میں کسی نے یہ کام نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی یہ کام اچھی طرح کر سکتے تھے مگر ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حدیث پر فنی حکم تو صادر کرتے تھے مگر دیگر وجوہات کی بنیاد پر اس کی روایت بھی کرتے اور عمل بھی برقرار رکھتے تھے، مگر شیخ کی موجودہ تقسیم نے ذخیرہ حدیث کے ایک بڑے حصے سے عوام کا اعتماد یک لخت اٹھا دیا بلکہ ان کے دلوں میں ایک گونا بعد و نفرت پیدا کر دیا ہے۔

غرض چونکہ یہ روئے احادیث مرویہ کے بارے میں — اگرچہ وہ ہماری تحقیق میں مجروح و منسوخ یا معدول ہی کیوں نہ ہوں — ہم اختیار نہیں کر سکتے اس لئے ہم منکرین فقہ کے موجودہ سطحی طرز اختلاف کا جواب اسی طرز و انداز پر دینے سے بچنے کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، حدیث رسول کے بارے میں یہی ہماری احتیاط آج کل کے منکرین فقہ کو سرچڑھ کے بولنے اور ہمارے موقف کو قطعاً گمراہ بتلانے کی جرأت دیتی ہے، ورنہ یہ بات نہیں کہ ہمارے پاس دلیل نہیں، نہ یہ بات ہے کہ منکرین فقہ کا موقف منزل من اللہ اور نافتا بل اختلاف ہے۔

دوسرا مانع یہ ہے کہ مقابلہ آرائی یا تضلیل دیگر کا یہ سلسلہ ہماری طرف سے بھی عامیانہ سطح پر شروع ہو جائے تو اس سے بجز اس کے کہ خانہ جنگی شروع ہو کر جنگ ہنسائی ہو اور دشمنان اسلام کو اس انتشارِ باہمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سنہرا موقع مل جائے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، امت کا یہ نقصان کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جہالت و جارحیت کا جواب ترکی بہ ترکی دینے کے بجائے ہمارے علماء کرام کو اپنے موقف کی سچائی اور واقعیت کا اثبات اور منکرین فقہ کے مختار موقف کا رد دلائل واضحہ کی روشنی میں اس وقت تک کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ وہ ائمہ مخالف پر دوپٹہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ائمہ کے اتباع کا بالاجماع جائز بلکہ عوام کے لئے ضروری ہونے کے باوجود وہ اسے جب تک شرک سے ناحق تعبیر کرتے اور مقلدین کو گمراہ قرار دیتے رہیں گے تب تک اپنی حقیقت کا دفاع نہ صرف یہ کہ مقلدین کا حق ہے، بلکہ حق متواتر اور حق اجماعی کا حق ہے۔

علماء کرام کو چاہیے کہ پہلے وہ خود ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیں، دلائل کو سمجھیں اس کے بعد عوام الناس کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہیں، مختلف زبانوں میں عام فہم انداز میں مختصر رسائل، پمفلٹ اور چارٹس تیار کر کے اسے پھیلائیں، مساجد میں آویزاں کریں، نوجوانوں کیلئے تربیتی کلاس لیں اور سنجیدہ علمی طریقے پر احقاقِ حق کرتے رہیں،

اسی کے ساتھ اگر یہ لوگ مناظروں اور جوابوں کا چیلنج دیں تو علماء کرام اس کے لئے بھی مکمل تیار رہیں، قطعاً پیچھے نہ ہٹیں۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو حق کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے، اور منکرینِ فقہ کو توفیق عطا فرمائے کہ ان فروعی و ترجیحی مسائل کو لے کر امتِ شکنی کا کام کرنے کے بجائے قادیانیت، عیسائیت، اور لادینیت کا مقتبلہ کرنے کی اہم ترین ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں۔ آمین۔ صلی اللہ علی النبی الکریم

(اداریہ: ستمبر ۱۲ء)

انہا شہادۃ

کہتے ہیں کہ ایک عربی ادیب ”فتح بن خاقان“ نے حسد کی وجہ سے اپنے ایک ہم عصر ادیب ”ابن الصائغ“ کے خلاف مضمون لکھا، اس میں اس کی خوب ہجو اور مذمت کی، طرح طرح کی تہمتیں لگائیں اور اس کے اخلاق و عزت کا دامن داغدار کیا، ”ابن الصائغ“ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے بہت صبر و حلم سے کام لیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا، جواب میں کسی جذباتی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ”ابن الصائغ“ کہیں جا رہا تھا راستے میں اس نے اپنے حاسد ”فتح بن خاقان“ کو شاگردوں کے درمیان محفل جمائے بیٹھا ہوا دیکھا، قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اور انہا شہادۃ یعنی وہ سب باتیں میرے کمال کی دلیل ہیں کہہ کر آگے بڑھ گیا، وہ تو آگے نکل گیا مگر ”فتح بن خاقان“ کا حال بُرا ہونے لگا، وہ آگ بگولا اور لال پیلا ہوتا جا رہا تھا، شاگردوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہا شہادۃ کہہ کر آخر ایسی کونسی گالی دیدی جو اس قدر تاثر اور غیض و غضب کا سبب ہو رہی ہے؟۔ ان لوگوں نے استاذ ہی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دراصل اس نے اس جملے کے ذریعے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے:

واذا أتتک مذمتی من ناقص

فہی الشہادۃ لی بانی کامل

شاعر کہتا ہے کہ اگر تمہارے سامنے کسی ناقص و عاجز شخص کی زبان سے میری برائی پہونچے تو تم متاثر نہ ہونا، کیوں کہ کسی گھٹیا شخص کا میری برائی کرنا تو میرے باکمال ہونے کی

شہادت ہے مذمت نہیں۔

”فتح بن خاقان“ کہنے لگا کہ میں نے اپنے مضمون کے بیسیوں صفحات میں اس کی جتنی مذمت و برائی بیان کی تھی اور اسے رسوا کرنے کی جو کچھ کوشش کی تھی اس ایک جملہ سے اس نے مجھے اس سے زیادہ رسوا کر دیا، مطلب یہ ہے کہ نہ جوابی مضمون لکھا، نہ گالیوں کے ڈھیر لگائے، نہ جذبات سے بے قابو ہوا، نہ توڑ پھوڑ کر کے اپنا ہی سب کچھ لٹایا بلکہ ہمت و حوصلے سے کام لے کر اور مناسب وقت کا انتظار کر کے ایسا مضبوط و تیر بہ بدف جملہ کہا کہ دشمن کے دماغ ٹھکانے لگ گئے اور اپنی اوقات سمجھ میں آ گئی۔ واقعی جب کوئی چھوٹا بڑوں پر، جاہل قابل لوگوں پر، بے عزت عزت والوں پر، ناپاک پاکبازوں پر اور کندہ ناتراش اصحاب فضل و کمال پر انگلی اٹھاتا ہے تو اس کا ان کو منہ چڑانا ہی عقل مندوں کے نزدیک حاسد کی ذلت و بے بسی اور محسود کی عزت و سر بلندی کی علامت و شہادت بن جاتا ہے۔

گذشتہ دو ہفتوں سے میڈیا اہانتِ اسلام کی خبروں سے لبریز ہے اور زبائیں اسی کے چرچوں سے میں سرگرم! ہوا کیا؟ کسی بد خصال و بد قماش شخص نے ایک فلم تیار کی جس میں پیغمبر اسلام و رحمت عالم ﷺ کی عظیم الشان ہستی کو قابلِ اعتراض کردار کے ساتھ نمایاں کرنے کی مذموم سعی کی، ظاہر ہے کہ اس حرکت کو ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان تو کیا کوئی شریف الطبع اور انصاف پسند غیر مسلم بھی گوارا نہیں کر سکتا!

کہا جاتا ہے کہ فلم کے تیرہ منٹ پر مشتمل چیدہ چیدہ مناظر انٹرنیٹ کی یوٹیوب نامی سائٹ پر بھی نمایاں کئے گئے، اس کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں تک یہ مناظر پہنچیں اور وہ مشتعل و بے قابو ہو کر وہ سب کریں جو ایسے مواقع پر جذبات سے مغلوب اور انجام سے بے خبر طبقہ کیا کرتا ہے، جس کا کوئی اثر مجرم پڑتا ہے اور نہ ہی مجرم کی پشت پناہی و جانبداری کرنے والوں کے کانوں پر جوں رینگتی ہے، کچھ اثر ہوتا بھی ہے تو بعد از خرابی بسیار ہوتا ہے، وہ بھی کچھ زیادہ اہم نہیں محض طفل تسلی کے بطور ہوتا ہے۔

یہ جذباتی رد عمل کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ فطری اور نفسیاتی ہے، ہونا ہی چاہئے ہوتا ہی ہے، مگر عقل و شعور اور علم و آگہی کی روشنی میں دیکھا جائے تو نہ یہ دانشمندانہ طریقہ کار ہے اور نہ ہی کتاب و سنت کے مطابق ہے، جبکہ ہم بہ حیثیت انسان عقل کے اور بہ حیثیت مسلمان علم کے پابند ہیں، جذبات کے رو میں بہنے سے بنتے ہوئے کام بگڑتے تو ہیں مگر بنتے نہیں، بچہ جب اپنے منشاء کو پورا کرنے میں ناکام ہوتا ہے جو کھانا برتن، کھلونے وغیرہ اس کے سامنے رکھے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی اٹھا کر پھینک دیتا ہے یا پٹخ کر توڑ دیتا ہے لیکن بڑا آدمی ایسے مواقع پر یہ حرکتیں نہیں کرتا، کیوں؟ وہی شعور بے شعوری کا فرق!

اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اس وقت صرف ایک مثال دیتا ہوں، ہمارے شہر میں کسی معروف مشنری اسکول کے بارے میں خبر آئی کہ وہاں طلبہ سے صلیب کی تعظیم کروائی جا رہی ہے، جیسے ہی یہ خبر اخباروں میں آئی نو جوان جذبات سے بے قابو ہو گئے اور ایک بڑے جتھے کی شکل میں اسکول پر پہنچ گئے آفس میں داخل ہوئے، وہاں رکھی ہوئی صلیب اور میری^۱ کے مجسمے توڑ دیئے، سامان بکھیر دیا اور خوب ہنگامہ برپا کیا، اسکول کے منتظمین نے پولیس کو طلب کر کے ان نو جوانوں کو ان کے حوالے کر دیا، بچوں کے سر پرستوں سے وقتی معذرت اور مفاہمت کر لی، بات ختم ہو گئی، اور چند دنوں کے بعد اسکول کے معمولات مشنری کے تقاضوں کے مطابق بحال ہو گئے، اب کون ہر بار جا کے توڑ پھوڑ کرتا رہے گا۔

یہ ایک معمولی واقعہ ہے ہمارے معاشرہ کے ہزاروں واقعات میں سے، آپ سنجیدگی سے غور کریں کہ اس اقدام سے مسلمانوں کو کیا ملا؟ چار نو جوان پولیس کے حوالے ہوئے، انتظامیہ نے متاثر سے ہمدردی کی، اخباروں میں موافق و مخالف تبصرے چند دنوں تک چلتے رہے، اسکول والوں نے اپنا آفس بھی بحال کر لیا اور اپنے معمولات بھی جاری کر لئے۔

۱۔ ”مریم“ کا اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ فی الواقع ان کے نہیں۔

اس اسکول میں پڑھنے والے مسلم بچوں کو آخر اس سے کیا فائدہ ہوا؟ اس کے بجائے اگر مسلمان بچوں کے سر پرست مل بیٹھتے، مشورہ کرتے اور اپنے اپنے بچوں کو اس اسکول سے اسی دن نکال لیتے تو ان معصوموں کے دین و ایمان کا تحفظ بھی ہو جاتا اور اسکول والوں کو تعلیم کے نام پر تبلیغ کرنے کا انجام بھی معلوم ہو جاتا، لیکن افسوس! مسلمانوں نے یہ سب کیا مگر اپنے بچوں کو مشنریز میں پڑھانا نہیں چھوڑا۔ مختصر یہ کہ جن مواقع پر صبر و حلم اور عقل و شعور سے کام لے کر مؤثر و پائیدار فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت جذبات سے مغلوب ہو کر غیر مؤثر اور ناپائیدار اقدامات سے بچنا مسلمانوں کی شان اور اسلام کا شعار ہے، اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

رہ گیا یہ سوال کہ دشمنان اسلام کی طرف سے رہ رہ کر ایسے حالات کیوں پیدا کئے جا رہے ہیں اور ان کا سد باب کیا ہے؟ تو سب سے پہلے ہمارے مد نظر رہنا چاہیے کہ یہ حالات و حادثات اتفاقی طور پر یا کسی غلطی اور نادانی کے نتیجے میں نہیں پیش آرہے ہیں، اس کے پیچھے جانی بوجھی سازشیں اور منظم طاقتیں کارفرما ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مسلمان کسی کامیابی کی طرف گامزن ہوتے ہیں یا کوئی بامقصد جدوجہد میں مشغول ہوتے ہیں یا دشمنان اسلام کو کوئی مخالف اسلام و مسلمین ہنگامی قدم اٹھانا ہوتا ہے، یا اسلام کی حقانیت کی طرف اہل مغرب کا رجحان ہونے لگتا ہے تو ایسے وقت میں مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور جی جلانے والا کوئی واقعہ رونما کر کے ان کے دل و دماغ کو ماؤف اور ان کی توجہات و خدمات کو منتشر کر دیا جاتا ہے، وہ چند دنوں تک اپنی بامقصد مساعی کو چھوڑ کر کسی انجمن ہدف اور بے منزل سفر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، میڈیا بھی سارے عالم کی آنکھوں پر انہی خبروں اور سرخیوں کے پردے ڈالے رکھتا ہے، پھر اس ہنگامے کے ختم ہوتے ہوتے ان طاقتوں اور سازشوں کے کام نکل جاتے ہیں اور ہم احتجاجیوں اور دکھی دلوں کے کام معرض خطر میں پڑ جاتے ہیں، کاش کہ ہم اس صورتحال کو سمجھ پاتے اور کاش کہ اس بھڑکی

امت کا کوئی مدبر قائم ہوتا جو اسے ہر بے مقصد کام سے یکسو کر کے مقاصد و اہداف کے حصول میں لگائے رکھتا۔

یہ ایک واقعاتی اور قریبی سبب ہے، اس کے علاوہ ایک حقیقی اور مخفی سبب بھی ہے، اور وہ مسلمانوں کا خود اپنے عظیم و محسن پیغمبر، اور ان کی دعوت و تعلیم اور ان کی اداؤں اور سنتوں کی ناقدری کرنا بلکہ عملاً انہیں ازکار رفتہ یا اولڈ ایج قرار دیکر شخصیت و سماج سے علاحدہ کر دینا ہے، جب ہمارے ہی دلوں میں وہ اور ان کی ادائیں محبوب نہیں تو دوسروں کا کیا شکوہ؟ وہ جو کریں کم ہے۔

ان حالات کے سدباب کے لئے بھی ہماری سمجھ میں دو باتیں آتی ہیں، ایک یہ کہ مسلم حکمران، مذہبی قائدین اور سیاسی عمائدان حرکات کے مرتکبین کو سزا دلوانے اور ان حرکتوں کے خلاف عالمی ضابطہ اخلاق مدون کرانے کیلئے متحد ہو جائیں اور مخلصانہ جدوجہد کریں، ان واقعات کو محض اپنی پارٹیوں کو چکانے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں دوسرے یہ کہ عامہ مسلمین مغرب کی اندھی تقلید ترک کرنے اور ”گلوبلائزیشن“ کے دھارے میں بہہ جانے کی حمایت و وکالت کرنے کے بجائے خود بھی اپنے حبیب و محبوب و محسن اعظم نبی ﷺ کی کامل اتباع کی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں، اور یقین رکھیں کہ دنیا و آخرت کی سرخروئی و سر بلندی اپنے آقا کی غلامی میں ہے اور بس!

اللہ پاک توفیق نصیب فرمائے آمین

(اداریہ اکتوبر ۱۲ء)

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَيْنَا اللَّهُ

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں دین حق سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے، جس کو تو فیق الہی سے یہ نعمت میسر آ گئی اس کو پھر کسی نعمت کے نہ ہونے کا کوئی غم نہیں ہونا چاہیے، اور جس کسی کو شامت اعمال سے یہ نعمت نہیں مل سکی اس کو ساری دنیا کی نعمتوں کے مل جانے پر بھی کوئی خوشی نہ ہونی چاہیے، پھر یہ نعمت بعض بندوں کو شروع اور بدء شعور ہی سے حاصل ہو جاتی ہے اور بعض کو عقل و شعور آ جانے اور کسی باطل عقیدہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد اس سے بیزار و علاحدہ کر کے عطا فرمائی جاتی ہے، صحابہ کرامؓ کی اکثریت کا تعلق اس دوسری قسم ہی سے تھا۔ جہاں پیدائشی طور پر مسلمان ہو جانا یعنی دین حق سے وابستہ ہو جانا اللہ تعالیٰ کا کرم پر کرم اور بندوں کی سہولت کا سبب ہے وہیں پر زندگی کے کسی بھی مرحلے میں اپنے خالق و مالک کی طرف دھیان کا ہو جانا اور حق بندگی ادا کرنے اور فریضہ وفاداری پورا کرنے پر دل کا مائل ہو جانا بھی بڑی سعادت و قدر دانی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکرِ نعمت کی اور سچائی کا اظہار کرتے رہنے اور اس کی ادائیگی سے اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہم لا نحصی ثناء علیک انت کما اثنت علی نفسک۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین حق اور مذہب اسلام کی جس وقت بھی توفیق ہو جائے اللہ کا بڑا کرم اور اس کی عظیم نعمت ہے، بندہ کو اس پر ہمیشہ بارگاہ ایزدی میں احسان شناس و شکر گزار رہنا چاہیے، لیکن غیر مسلم گھروں میں پیدا ہو کر ان میں پل بڑھ کر پھر اسلام میں داخل اور دین حق میں شامل ہونا آسان کام نہیں ہے بہت بڑا مجاہدہ اور صبر آزما کام ہے، جو

لوگ تبدیلی مذہب کی اس پُرخطر وادی اور خاردار جھاڑی سے گذر کر آتے ہیں کچھ انہیں ہی کے دل جانتے ہیں کہ یہ کیسا راستہ ہے، پیدائشی مسلمان اگر ان نو مسلموں کی داستانِ غم اور بیانِ حسرت و الم سن لیں۔۔۔ جو وہ عاشقانِ خدا اور مجاہدانِ راہِ حق مزے لے لے کر سناتے ہیں۔۔۔ تو رو نگٹے کھڑے ہو جائیں، ان مجاہدوں سے گذر نے کا تصور تو دور کی بات سننے کی تاب بھی نہیں لاسکتے، مگر افسوس! کہ آج ہم اللہ تعالیٰ کے اس عظیم کرم کے۔۔۔ جو اس نے ہمارے ضعفِ حال پر رحم فرماتے ہوئے ہم پر فرمادیا۔۔۔ کہ مسلم گھرانوں میں پیدا کر کے بنا کسی مجاہدہ و آزمائش کے دینِ حق اور نعمتِ ایمان و اسلام سے سرفراز فرمادیا، بالکل قدر نہیں کر رہے ہیں حد یہ ہے کہ اسے نعمت مان کر اس کا شکر ادا کرتے رہنے کی بھی توفیق نہیں ہو رہی ہے۔ اللہ پاک ہم کو اس کا احساس نصیب کرے۔ آمین

مذہب کے درمیان خالی الذہن ہو کر موازنہ کرنا اور دیانت و انصاف کا چراغ لے کر ان میں سے حق کو منتخب کرنا، پھر جرأت و ہمت سے کام لے کر ضمیر کے فیصلے کو علی الاعلان ظاہر کر دینا کوئی کھیل تماشہ اور آسان کام نہیں ہے، بڑی بڑی شخصیتیں حق کے احقاق کے بعد بھی اظہار سے عاجز ہو کر نامراد و ناکام ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ حالانکہ وہ علم و عقل کے اعتبار سے دنیا کی گنی چنی ہستیوں میں شمار ہوتے تھے، خود ہمارے ملک کے عظیم اسکالر، دستورِ ہند کے معمار اور دلتوں کے مسیحا مسٹر امبیڈکر نے اپنے پیدائشی مذہب کو اس کی نا انصافیوں اور نابرابریوں سے عاجز ہو کر جب ترک کر دیا اور بباغِ دہل دیگر مذہب کے دعاۃ کو اپنا اپنا مذہب ان کے سامنے پیش کرنے کی دعوت دی، بہت سے آسمانی وز مینی مذہب ان کے سامنے رکھے گئے، اسلام بھی مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ جیسی علمی و عبقری شخصیت نے خود دل کر ان کے سامنے پیش کیا، مگر ان کی نظر و فکر نے حق کی راہ نمائی نہیں کی یا پھر ان کا ضمیر اظہارِ حق کی جرأت نہ کر سکا، جو بھی ہوا ہو بہر حال وہ نعمتِ اسلام سے مشرف نہ ہو سکے اور مَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۖ کا مصداق ہو گئے۔

خود عہد رسالت میں بھی حق کے احقاق کے بعد اس کا تسلیم و اظہار کتنا مشکل کام تھا اور جن لوگوں کو فضل الہی سے اس کی توفیق مل گئی ان پر کیا بیتی اس کی ایک جھلک صحابی رسول حضرت مقداد بن اسودؓ کے اس بیان میں دیکھی جاسکتی ہے جو انہوں نے ایک غیر صحابی کی زبان سے ان کی صحابیت پر فخر اور خود کے صحابی نہ بن سکنے پر افسوس کو سن کر ارشاد فرمایا تھا:

”تم لوگوں کو چاہیے کہ ایسی فضول تمنا اور بے مطلب حسرت کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسے گھر میں پیدا کیا ہے جہاں آنکھ کھولنے کے بعد تم نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی رب نہیں سنا، دین اسلام کے علاوہ کوئی دین نہیں معلوم ہوا، اس کی برکت سے تمہیں اللہ تعالیٰ کو معبود برحق ماننے اور اپنے نبی کے دین کو سچا یقین کرنے کے لئے کسی آزمائش میں پڑنا نہیں پڑا، اور اللہ تعالیٰ نے ہر فتنہ سے تم کو بچا لیا۔ سنو! نبی کریم ﷺ ایک ایسی بدترین قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے کہ کوئی نبی اس سے بدترین قوم کی جانب مبعوث نہیں کیے گئے، وہ لوگ بت پرستی سے بہتر کوئی دین نہیں سمجھتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی پر قرآن مجید نازل فرمایا تو قرآن نے جہاں حق و باطل میں تفریق کر دی وہیں خاندانوں کو بھی ایمان لانے اور نہ لانے والوں میں بانٹ دیا، اب ایک باپ ایمان لاتا اور اپنے بیٹے کو بے ایمان دیکھتا، کوئی بیٹا مومن ہوتا اور اپنے باپ کو کفر پر دیکھتا، کوئی بھائی مسلمان ہوتا اور اپنے بھائی کو شرک پر پاتا تو اس کا دل ان کی اس محرومی پر بھر آتا اور اسے یہ ڈر ستا تا رہتا کہ اگر یہ ایمان لائے بغیر ہی مر جائے تو سیدھے جہنم میں جائے گا، پس اس زمانہ میں ہماری صورتحال یہ تھی کہ ہم اپنے عزیزوں اور محبوبوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے بجائے غمزہ ہوتے، ہمارے دل دُکھتے، ہم یہ جانتے ہوئے کہ ہمارا بیٹا یا باپ یا ماں یا بھائی ایمان نہ لا کر جہنمی بن رہا ہے ہم کیسے سکون و سرور سے رہ سکتے تھے۔ ہمارے دل پکار اٹھتے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ“

(تفسیر القرآن العظیم: ۳/۳۱۸)

حاصل یہ ہے کہ آج ہم مسلمان بے مشقت و مجاہدہ ایمان و اسلام کی نعمت مل جانے کی

وجہ سے اس کی قدر نہیں پہچان رہے ہیں، نہ کبھی یہ سوچنے کی توفیق ہو رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص نہ ہوتا وہ ہمیں حق کو پہچان کر اختیار کرنے اور اختیار کرنے کے دشوار گزار راستوں سے گزرنے کی آزمائش میں ڈال دیتا تو نہ معلوم ہم میں سے کتنے ایسے ہوتے جو یا تو حق ہی کو نہ پہچان پاتے یا پہچان بھی لیتے تو اسے اختیار کرنے کی دشوار گزاریوں اور قربانیوں کی تاب نہ لاسک کر ایمان ہی سے محروم رہتے، اللہ اکبر! مالی دولت، جائیداد، جاگیر اور کاروبار ایک طرف رہنے دیجئے کہ وہ پھر بھی حاصل ہو سکتے ہیں مگر ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائیوں کی الفت، بہنوں کا پیار، بیوی کا سہارا، بچوں کی محبت، خاندان کی قوت اور دوستوں کی انسیت یہ وہ دولتیں ہیں جو اگر چھن جائیں تو آدمی اُن کا متبادل نہیں پاسکتا۔ پھر بلوغ اور بد شعور کے بعد اسلام میں داخل ہونے والوں کو کیا ان ساری نعمتوں سے محروم ہونا نہیں پڑتا؟ آج بھی کسی غیر مسلم کا اسلام کو اختیار کر لینا میٹھالڈ نہیں کڑوا گھونٹ ہے، ذرا ان نو مسلموں کی آپ بیتی پڑھئے، حالات سنئے اور عبرت حاصل کیجئے، تاکہ ہمیں بھی نعمت اسلام کی قدر و قیمت کا کچھ پتہ چل سکے۔

(اداریہ نومبر ۱۲ء)

وقف بورڈ سے ائمہ و موزنین کو تنخواہوں کی ادائیگی کا مسئلہ اہل علم کے غور و فکر کے لئے چند معروضات

آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے ضلع پرکاشم سے تعلق رکھنے والے شیخ حسین پیراں، شیخ محبوب باشا اور شیخ قادر باشا کی جانب سے داخل کردہ درخواست کے جواب میں ریاستی وقف بورڈ کو ہدایت دی ہے کہ وہ آج سے بیس سال قبل یعنی یکم دسمبر ۹۳ء کو سپریم کورٹ سے جاری کردہ ہدایت کی روشنی میں ائمہ و موزنین کی تنخواہوں کے وقف بورڈ سے اجراء کو یقینی بنائے اور اس کے لئے اندرون چار ماہ ضروری کارروائی مکمل کر لی جائے۔ وقف بورڈ نے اس سلسلہ میں اب تک کیا کارروائی کی ہے ”منصف نیوز بیورو“ کے مطابق درج ذیل ہے۔

مساجد کے امام و موزنوں کو ماہانہ تنخواہیں ادا کرنے سپریم کورٹ کے 20 سال قبل کے احکام کو رو بہ عمل لانے آندھرا پردیش ہائیکورٹ کی ہدایت پر وقف بورڈ، درج رجسٹر اوقاف مساجد کی نشاندہی میں مصروف ہے۔ چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی بھی مساجد کے اماموں اور موزنوں کو سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے احکامات کی روشنی میں تنخواہوں کی ادائیگی کے مسئلہ کا مثبت حل نکالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ چند دن قبل چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی نے صدر نشین وقف بورڈ سید شاہ افضل بیابانی کو مدعو کرتے ہوئے اماموں و موزنوں کی تنخواہوں کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا تھا، صدر نشین نے چیف منسٹر کو بتایا کہ ریاست میں ۴ ہزار سے زائد مساجد درج رجسٹر ہیں جن کے امام و موزن کو اگر اقل ترین تنخواہ ادا کی جائے گی تو ماہانہ ۴ کروڑ سے زائد رقم کی ضرورت ہوگی اور وقف بورڈ کے پاس اتنی آمدنی نہیں کہ وہ ماہانہ ۴ کروڑ روپے تنخواہیں ادا کر سکے۔ بتایا گیا ہے کہ چیف منسٹر نے ریاست میں درج رجسٹر اوقاف مساجد اور امام و موزنوں کی تعداد اور ان کی تنخواہوں کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرنے صدر نشین وقف بورڈ کو ہدایت دی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ موزن کو کم سے کم ۳ تا ۴ ہزار اور امام کو

۸ تا ۶ ہزار روپے ماہانہ تنخواہیں دینے کی تجویز ہے۔ ریاستی ہائی کورٹ نے بھی اس سلسلہ میں اندرون چار ماہ رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت دی ہے۔ وقف بورڈ ذرائع نے بتایا کہ صرف درج رجسٹر وقف مساجد کے ہی اماموں اور موزنوں کو ماہانہ تنخواہیں ادا کرنے سے متعلق سروے کیا جا رہا ہے۔ جو مساجد درج رجسٹر وقف نہیں ہیں انہیں اس فہرست میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ تاہم یہ پوچھے جانے پر کہ جو مساجد درج رجسٹر وقف نہیں ہیں کیا انہیں اب درج رجسٹر وقف کیا جاسکتا ہے؟ وقف بورڈ ذرائع نے بتایا کہ ان مساجد کو جلد از جلد درج رجسٹر وقف کرا دیا جائے تو بہتر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وقف بورڈ کوئی ایسی درخواستیں وصول ہو رہی ہیں جن میں اماموں اور موزنوں کو حکومت کی جانب سے ماہانہ تنخواہیں ادا کئے جانے کی تجویز پر اعتراضات کئے جا رہے ہیں اور یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ آیا اماموں اور موزنوں کو تنخواہیں ادا کرنے کے بعد مساجد کے امور میں سرکاری مداخلت کی جائے گی اور اماموں اور موزنوں کے تباد لے بھی عمل میں آئیں گے؟ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ امام و موزن سرکاری تنخواہیں حاصل کرنے کے بعد کمیٹیوں کی پروا نہیں کریں گے۔ اس طرح کے کئی اعتراضات کئے جا رہے ہیں لیکن اعتراضات کرنے والے یہ نہیں سوچ رہے ہیں کہ امام و موزن کو اگر اچھی تنخواہ ملے تو وہ خوشحال نہیں تو کم از کم اپنے اور اپنے ارکان کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزار سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں امام و موزن کو اچھی تنخواہ کیلئے انتظامی کمیٹیوں کو ہر جمعہ چندہ وصول کرنا پڑتا ہے اور بڑی مشکل سے امام و موزن کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، چند مساجد ہی ایسی ہیں جہاں مسجد کی آمدنی سے امام و موزن کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، سرکاری تنخواہ حاصل کرنے والے امام و موزن کیلئے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اب تو سپریم کورٹ کا اس سلسلہ میں فیصلہ ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے ریاستی حکومت خود بھی اماموں کو تنخواہ دینا چاہتی ہے تو وہ وقف بورڈ کو سالانہ گرانٹ جاری کرے گی اور وقف بورڈ اس گرانٹ سے اماموں اور موزنوں کو تنخواہیں ادا کرے گا۔ بہر حال اس سلسلہ میں حکومت اور وقف بورڈ کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کو رو بہ عمل لانے کیلئے ریاستی ہائیکورٹ میں اپنا جواب داخل کرنا ہے۔ توقع ہے کہ ۴ ماہ بعد یہ مسئلہ حل کر لیا جائے گا کیونکہ چیف جسٹس بھی اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

(روزنامہ منصف حیدر آباد ۲۶ دسمبر ۱۳ء)

مذکورہ بالا نیوز رپورٹ میں چند باتیں قابل غور ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے اس سلسلہ میں بیس سال قبل ہدایت جاری کی تھی بیس سال سے اس میں کوئی پیش رفت نہیں کی گئی، بیس سال بعد ائمہ و موزنین کے ہمدردوں کو ان کی خوشحالی نہیں تو کم از کم ضروریات زندگی پورے ہونے کا خیال اچانک کیوں پیدا ہو گیا؟

دوسری بات چیف منسٹر صاحب کو اس وقت اس موضوع سے خصوصی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی کہ وقف بورڈ کے چیرمین کو طلب کر کے ان کی مشکلات معلوم کیں اور ماہانہ چار کروڑ کا بجٹ منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے، چیف منسٹر کی اس دلچسپی کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں وہ ان کی موجودہ سیاسی پوزیشن اور پارٹی بحران کے تناظر میں باسانی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو لوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ سپریم کورٹ کی ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی ان سے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا سپریم کورٹ کی تمام ہدایات کیلئے حکومت کی ایسی ہی دلچسپی ہے؟ اور اگر سپریم کورٹ کی ہدایت ایسی ہی سو پر پاور ہے — اور ہونا بھی چاہئے — تو بیس سال سے کورٹ کا یہ احترام سرد خانے میں کیوں ڈال دیا گیا تھا؟ کیا ہائی کورٹ کی تازہ وارنگ سے قبل وقف بورڈ کو سپریم کورٹ کی ہدایت کا علم ہی نہ ہوا تھا؟

چوتھی بات یہ ہے کہ وقف بورڈ چار ماہ کی مہلت کے اختتام پر اگر ائمہ کو تنخوااں جاری کرنا شروع کر دیتا ہے، تب بھی یہ تنخوااں صرف وقف بورڈ میں درج رجسٹر ائمہ و مؤذنین کیلئے جاری ہوں گی تمام ائمہ و مؤذنین کے لئے نہیں، نیز یہ تنخوااں وقف بورڈ اوقاف کی آمدنی سے نہیں دے گا حکومت کی منظورہ گرانٹ سے دے گا، کیوں کہ وقف بورڈ ماہانہ چار کروڑ کے مزید مصارف بڑھانے کا متحمل نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ تنخواہ سرکار سے ملے گی وقف بورڈ سے نہیں، ایسی صورت میں ایک طبقے کو جو خطرات لاحق ہیں ظاہر ہے کہ وہ حق بجانب ہیں نہ کہ لائق تنقید! جہاں تک کورٹ کے احکامات کا معاملہ ہے تو اس پر کوئی اشکال نہیں، اسلئے کہ کورٹ نے تو عرضی پیش کرنے والوں کی فریاد سننے اور دادرسی کرنے کا اپنا فریضہ ادا کیا ہے، خواہ وہ بیس سال قبل کا سپریم کورٹ کا حکم ہو یا زیر بحث اسٹیٹ ہائی کورٹ کی ہدایت ہو! گفتگو عرضی گزاروں سے ہے کہ آیا انہوں نے مسئلے کو اٹھانے سے قبل درپیش خطرات و مسائل کا تجزیہ اور ہمہ پہلو جائزہ کر لیا یا نہیں؟ مثال کے طور پر چند خطرات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

● سب سے پہلا خطرہ تو ائمہ و خطباء کو حاصل احقاق حق کی آزادی کے ختم ہو جانے کا ہے، اسلئے کہ وقف بورڈ تو ان کی تنخواہوں کا بوجھ اٹھانے کے موقف میں نہیں ہے، چیرمین صاحب نے چیف منسٹر صاحب کو صاف بتا دیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مطلب حکومت سے فنڈ طلب کرنا ہے، جب یہ تنخواہیں حکومت کے فنڈ سے ادا کی جائیں گی تو آج نہ سہی آئندہ کبھی بھی ائمہ و موزنین کی حیثیت ملازمین سرکار کی ہو جائے گی، اس کے دور رس نتائج کا اندازہ عالمی و ملکی حالات پر نظر رکھنے والوں کیلئے کچھ مشکل نہیں۔

● امامت و موزنی خالص اسلامی فرائض ہیں، جن کا تعلق اصلاً مسلمانوں سے ہے، جہاں اسلامی حکومت ہوتی ہے وہاں تو مسلمانوں کا امیران شعائر کی حفاظت اور حفاظت کرنے والوں کی کفالت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، جب سے ہندوستان ایک جمہوریہ قرار پایا اور اس کی اسلامی شناخت ختم ہو گئی تب سے مذہبی خدمات کے شعبے حکومت کے ذمے نہ رہے، اس وقت سے ہندوستان کے مسلمان خالص مذہبی خدمات کو اپنا فریضہ سمجھ کر خود ہی ادا کرتے آ رہے ہیں، مدارس، مساجد، اور دینی و دعوتی مراکز یہ سب ملی نظام اور شرعی احکام کے تحت مسلمان خود سنبھال رہے ہیں، اور انشاء اللہ سنبھالتے رہیں گے، ان خدمات میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے کی نہیں، اور ان خدمات کے معیار میں بھی نسبتاً ترقی ہی ہے زوال نہیں، اگرچہ سست رفتار سہی، اس کے برخلاف اکا دکا ذمہ داری جو ضمناً کسی وجہ سے حکومت کے حوالہ ہو گئی، — مثلاً دائرۃ المعارف العثمانیہ — تو اسکی اور اسمیں کام کرنے والوں کی حکومت نے جو گت بنا کے چھوڑی ہے وہ جاننے والوں سے مخفی نہیں، اسلئے زیر بحث اسکیم سے یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں جاری یہ نظام بھی معرض خطر میں نہ پڑ جائے۔

● سابق میں مدارس اسلامیہ کو سرکاریا نے کیلئے جو کوششیں ہوئی ہیں دورانہدیش علماء و قائدین نے تنگ نظری کے طعنوں کے باوجود اس کی بھرپور مخالفت کی تھی، اس مخالفت کے باوجود بعض لوگوں نے اجتماعی یا انفرادی طور پر ان کوششوں کو مخلصانہ کوشش اور اپنا قانونی حق

قرار دے کر قبول کر لیا تھا تو ان کا جو حشر ہوا وہ ہمارے سامنے ہے، آج ان کی توبہ کا دروازہ (رجوع) بھی بند ہو چکا ہے، اس بری طرح پھنسے ہیں کہ اس سرکاری لقمے کو نہ نگلے بن رہی ہے نہ اُگلے، ان کا نظام ہی قابلِ افسوس حد تک معطل ہو کر رہ گیا ہے، اسلئے خطرہ ہے کہ کہیں اس اسکیم کا انجام بھی اسی شکل میں سامنے نہ آ جائے۔

● مذہبی خدمات کے سلسلہ میں سرکاری کے بجائے عوامی سرپرستی کا جو نظام چل رہا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور اس کی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے ہیں، ایک پکچر جوڑنے والا بے نمازی مسلمان بھی مسجد کے نام پر پانچ روپے چندہ دیتا ہے اور اس کا رشتہ خانہ خدا سے کسی طرح جڑا ہوا ہے، اس بہانے مسجد کی جانب سے ہر ماہ کوئی اس سے ملتا ہے، اس طرح ذمہ داریوں کا احساس غیر شعوری طور پر ہی سہی تازہ ہوتا رہتا ہے، بے دینی بلکہ دین بیزاری کے موجودہ ماحول میں دین کے ساتھ عام مسلمانوں کے اس معمولی سے تعلق کو بھی معمولی نہ سمجھنا چاہیے، سرکاری تنخواہیں اس رشتے کو ختم کرنے میں موثر رول ادا کریں گی۔

● دیانت و امانت زوال پذیر ہے، ہوا و ہوس سے کوئی محفوظ نہیں، خدام دین بھی اس زوال سے بہر حال متاثر ہیں، ہوس کی اس ریل پیل میں ان کے خدماتِ دینیہ سے معمولی وظیفوں پر جڑے رہنے میں جہاں ان کے جذبہ خدمت کو دخل ہے وہیں معاشی ضرورت کا بھی اثر ہے، اگر ان کی ضرورت کسی ادارے سے پوری ہو جاتی ہے تو مساجد میں پابندی خدمات کا وہی حشر ہوگا جو سرکاری اسکولوں میں تعلیم و تربیت کے معیار کا نظر آ رہا ہے، مسجد انتظامیہ تنخواہ کے حوالے سے انتظامی گرفت مضبوط رکھتی ہے، زیر بحث صورت میں ائمہ و موزنین کسی کو جوابدہ نہ ہوں گے، مدارس میں ایسا ہو چکا ہے، پہلے تنخواہ ناظم مدرسہ کے توسط سے دی جاتی تھی تو ناظم صاحب دو استاذوں کے نام پر سرکار سے تنخواہ اٹھا کر چار میں تقسیم کر دیا کرتے تھے، ان استاذوں نے شکایت درج کرائی تو ان کے اکاؤنٹ کھلو کر راست

● وقف بورڈ ایک قومی ادارہ ہے جس پر نظر رکھنا اور اس کی شرعی رہنمائی کرنا رہبران اسلام کی ذمہ داری ہے، نیز حکومت بھی عوامی خدمت گزار ہے اس کی بدعنوانیوں کی نشاندہی تمام عوام کی طرح ائمہ و علماء کا بھی حق ہے، سرکاری امداد سے تنخواہیں حاصل کرنے والے ائمہ و علماء حق کی خاطر اپنے محسنوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت باقی رکھ سکیں گے یا نہیں؟

● فی الحال محراب و منبر سے صرف مذہبی و اسلامی پیغام نشر ہوتے ہیں، سیاسی ہنگاموں کے لئے خانہ خدا میں کوئی گنجائش نہیں ہے، سرکاری امداد سے تنخواہیں حاصل کرنے کے بعد بھی محراب و منبر کا یہ تقدس برقرار رہ سکے گا۔

مختصر یہ ہے کہ ائمہ و موزنین کے جن ہمدردوں نے یہ مسئلہ اٹھایا اور عدالت تک پہنچایا اور عدلیہ کی جانب سے انہیں حمایت حاصل بھی ہو گئی — اگرچہ کہ ۱۹۹۳ء سے تاہنوز عملی کامیابی اس میں نہ مل سکی — ان حضرات نے ائمہ کرام کی خوشحالی بھی نہیں صرف ضروریات زندگی فراہم ہو جانے کی اہمیت پر تو نظر فرمائی ہے مگر اس اقدام کے نتیجے میں ملنے والے غیر یقینی منافع کے بمقابلہ یقینی مفاسد پر غالباً نظر نہیں کیا یا انہیں قابل اعتناء نہ سمجھا، اور اب بھی سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اسلئے ہم امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکز دعوت اور مقام امامت کے وارثین و جانشین خوش نصیبوں سے ادباً گزارش کرتے ہیں کہ وہ کم از کم اس اسکیم کے حصے دار بننے سے قبل ہزار بار ان خطرات و خدشات پر نظر فرمائیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ اس منصبِ جلیلہ پر جہاں ہم ان کی ٹوٹی پھوٹی نیابت کو بھی باعثِ صداقت و عزت سمجھتے ہیں، وہیں سادگی پسندی و معاشی تنگی میں بھی ان کے ساتھ اس ادنیٰ مشابہت کو — جو ان کے مقابلے میں سمندر سے قطرہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی — سینکڑوں فراخیوں اور خوشحالیوں پر ترجیح دینے کی ہمت پیدا کریں۔

اس سب کے باوجود ہم خدامِ دین کے لئے وظائف و مشاہرات میں اضافہ و استحکام کی ضرورت کے مخالف نہیں ہیں، جبکہ وہ اوقافی آمدنیوں کے ذریعہ (احکام اوقاف کے مطابق) ہو یا کمیٹیوں کی حسن تدبیر اور حمیت مذہبی کے ذریعے ہو۔ مسلمان الحمد للہ مذہب کے معاملے میں اب بھی غیر متمند ہیں، درج رجسٹر ائمہ و موزنین کیلئے آندھرا پردیش وقف بورڈ بے حساب املاک و اوقاف رکھتے ہوئے بھی ماہانہ چار کروڑ کے بجٹ کو ناقابلِ تحمل قرار دے رہا ہے، جبکہ آندھرا پردیش کے مسلمان درج شدہ اور غیر درج شدہ تمام مساجد کے ائمہ و موزنین، خدام، بجلی پانی، جانمازوں، چاندنیوں اور تعمیر و توسیع کے لئے کم از کم آٹھ کروڑ ماہانہ صرف کر رہے ہیں، اگر مسجد کمیٹیاں وصولی میں اضافہ کریں اور کم ضروری خرچوں میں تخفیف کریں تو وقف بورڈ جس پے اسکیل کی بات کر رہا ہے ان شاء اللہ اس سے زیادہ

نہیں تو اتنی تنخواہیں تو مسجد کمیٹیاں عوامی تعاون سے خود دے سکتی ہیں۔ یہ عاجز بتیس سال سے امامت کی خدمت کا شرف رکھتا ہے، کمیٹیوں اور ان کے طرز عمل کو اچھی طرح جانتا ہے خدام مسجد کے وظائف میں کوتاہی کی چند وجوہات بھی آخر میں اپنے تجربات سے ذکر کرتا ہوں۔

● مسجدوں کی کمیٹی میں شامل ہونے والے عام طور سے عہدہ پسند لوگ ہوتے ہیں جنہیں اقتدار اور دارو گیر سے زیادہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی، بہت رعب سے آتے ہیں اور وقتاً فوقتاً خدام مسجد کو طلب کر کے مواخذہ و مطالبہ کرتے رہتے ہیں، انہیں ان بے چاروں کے دکھ درد سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

● یا پھر تعمیر و توسیع مسجد کے جذبے سے آتے ہیں، وہ آمدنی کی پائی پائی سے بس مسجد بنانے اور سجانے کا منصوبہ بناتے رہتے ہیں، امام و موزن کے مشاہرے و وظیفے کا کوئی خیال دھیان نہیں ہوتا۔

● اکثر کمیٹیوں میں ہمدرد و مخیر لوگ آگے نہیں بڑھتے، وہ ان جھگڑوں میں پڑنے سے بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ ماہانہ چندہ دیدیں نماز ادا کر لیں، گھر میں آرام سے رہیں، یہ لوگ شخصی طور پر امام و موزن کی کچھ نہ کچھ خدمت بھی کرتے رہتے ہیں مگر وہ موقتی ہوتی ہے۔

● کئی مساجد کی آمدنیاں اچھی خاصی ہیں مگر منتظمین کا دل ان آمدنیوں کو خدام مساجد پر خرچ کرنے میں بخیل ہوتا ہے، سب پر وگراموں اور جلسوں کے نام پر سخاوت سے صرف کرتے رہتے ہیں، کئی مساجد کے بینک کھاتوں میں پیسہ پڑا ہوا ہے مگر امام و موزن کی تنخواہ اسی طرح جزوی چل رہی ہے۔

● اکثر مساجد میں تو دو ہی آدمیوں کا عملہ ہے، بڑی مساجد میں تین تا پانچ افراد کا عملہ ہوگا، اگر مسجد کمیٹیاں وصولی سرمایہ کا صحیح نظام بنائیں اور اس میں دلچسپی لینے کو اپنا متا بل جوابدہی فرض سمجھیں تو اس عملے کی مناسب تنخواہوں کے لئے بقدر ضرورت سرمایہ انشاء اللہ

ضرور فراہم ہو سکتا ہے، بشرطیکہ احساس ذمہ داری ہو۔ ماشاء اللہ آج کل شہروں سے لے کر قصبوں تک کئی مساجد ایسی ہیں جن کی کمیٹیاں فرض شناس ہیں جس کی وجہ سے ان مسجدوں کے ائمہ و موزنین کے مشاہرات وقف بورڈ کے ممکنہ مشاہرات سے کہیں زیادہ ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم اس معاملے میں اب بھی غیور ہے، ہمیں مذہبی معاملات میں کسی حکومت کے حوالے ہونے اور ان کے وعدوں پر اعتماد کر کے جاریہ خوددار اور با و تار نظام کو فیل کر لینے کی کوئی ضرورت نہیں، ایک دفعہ قوم ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے گی تو دوبارہ ان میں اس کا شعور پیدا کرنے اور غیرت قومی بیدار کرنے صدیوں کا وقت مطلوب ہوگا جو کارے دارد ہے، اسلئے بہتر یہ ہے کہ مسجد کمیٹیاں اپنی سہولت و راحت کیلئے اس اسکیم کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بجائے اپنی غیرت کو آواز دیں، ضمیر کو جھنجھوڑیں اور خدام مسجد کو خود کفیل بنانے میں اپنا فریضہ ادا کریں، آخر جس گرانی کی وجہ سے آپ کا گھر بیس پچیس ہزار روپے میں بھی مشکل سے چل رہا ہے اسی گرانی کا امام بھی تو شکار ہے، وہ اسی دودھ سے اپنے بچوں کے لئے دودھ لیتا ہے، اسی تیلی سے تیل خریدتا ہے، سلینڈر کی قیمت اس کے لئے بھی بڑھ رہی ہے، ائمہ و موزنین کے لئے کوئی سبسیڈی تو نہیں ہے پھر وہ کس طرح تین چار ہزار میں گذر اوقات کرے گا؟

صلائے عام ہے یا رانِ نکتہ داں کے لئے

(اداریہ جنوری ۱۳ء)

رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ پس منظر اور ضرورت

۶ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ کو بعد نماز مغرب رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا ریاستی اجلاس زیر نگرانی و سرپرستی حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند، حیدرآباد میں منعقد ہوا، اس میں ریاستی صدر رابطہ اور مدیر ماہنامہ ”اشرف الہجراند“ مولانا محمد عبدالقوی صاحب زید مجدہ نے جو استقبالیہ پیش کیا تھا، اس میں رابطے کے قیام کی ضرورت اور پس منظر پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

علماء کرام! آپ کو علم ہے کہ ہمارے مرکز علم اور قبلہ فکر دارالعلوم دیوبند نے آج سے ۱۹ سال قبل مدارس اسلامیہ کے تئیں پیش آمدہ مخصوص احوال کے پس منظر میں ایک کل ہند نمائندہ اجلاس ۲۰/۲۱/۲۲ محرم ۱۴۱۵ھ دارالعلوم ہی کے مہمان خانہ میں اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمہ اللہ کی صدارت میں طلب کیا تھا، جس میں باتفاق رائے درج ذیل عناوین پر پانچ تجاویز پاس کی گئی تھیں۔

۱۔ نصاب تعلیم ۲۔ طریقہ تعلیم ۳۔ نظام تربیت ۴۔ متحدہ نظام ۵۔ مخالف مدارس پروپیگنڈہ کی مذمت

ان میں سے نمبر ۴۔ کے تحت کہا گیا تھا:

”مدارس اسلامیہ کا یہ نمائندہ اجتماع مدارس کے داخلی و خارجی مشکلات کے حل اور تعلیمی معیار کی بلندی کے لئے اس ضرورت کا شدت سے احساس کرتا ہے کہ دارالعلوم کی فکر سے وابستہ تمام مدارس کا ایک مربوط اور متحدہ نظام قائم ہو، جس کے ذریعہ متحدہ طور پر مشکلات کو دفع کرنے کی جدوجہد کی جاتی رہے“ (رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۰)

مگر چونکہ یہ کام نزاکت کا حامل تھا اور اس کے لئے ایک قابل قبول لائحہ عمل مرتب ہونا وقت طلب کام تھا، اسلئے سر دست یہ طے کیا گیا:

”ابتدائی مرحلہ میں یہ اجتماع مناسب سمجھتا ہے کہ دارالعلوم میں ایک ایسا رابطہ کا دفتر قائم کیا جائے جو اپنے سے منتسب دینی اداروں سے تعلیمی رپورٹوں کے حصول کی جدوجہد کرے۔۔۔“ (رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۱)

اس نمائندہ اجتماع نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ”ملک کے تمام علاقوں کے مدارس پر مشتمل ایک کل ہند مدارس اسلامیہ عربیہ اجتماع بلایا جائے، جس کی تعمیل میں ۲۰ تا ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ کو پورے ملک کے ذمہ داران مدارس کا ایک سہ روزہ اجتماع منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے طول و عرض سے دو ہزار دوسو سے زائد مندوب ذمہ داران مدارس نے شرکت کی۔“

اس اجلاس کے فکرائیز خطبہٴ صدارت میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن رحمہ اللہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس کے چند اقتباس پیش خدمت ہیں۔

مدارس کے قیام کے پس منظر اور غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

”مدارس دینیہ کے تاریخی پس منظر سے ان کے اغراض و مقاصد کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے یعنی دینی تعلیمات کے تحفظ، کتاب و سنت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ کی حفاظت و اصلاح کیلئے یہ اسلامی گروکل تعمیر کئے گئے ہیں بالفاظِ دیگر علم و عرفان کی یہ چھاؤنیاں اس غرض سے قائم کی گئی ہیں کہ ان سے دین کے سچے مخلص خادم اور اسلام کے جانباز و جرات مند سپاہی تیار کئے جائیں، جو اسلامی عقائد و شعائر اور دینی اخلاق و روایات کے داعی و نقیب بنیں اور باطل طاقتوں کی فتنہ سامانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کریں، اسی لئے ان مدارس کا نظام تعلیم و تربیت امام الہندؒ کی تحریک دعوت و اصلاح کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور نصاب تعلیم خالص دینی رکھا گیا ہے اور ان کا مقصد تاسیس، نصب العین اور مصلح نظر دین

اور صرف دین ہے، اور وہ اسلامی تعلیمات کی تدریس و ترویج کا اور دینی عقائد و مآثر کے احیاء کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔“

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۵، ۲۶)

ان مدارس کے ارتباط و اتحاد کی ضرورت پر اس طرح روشنی ڈالی:

”ہمارے مدارس دینیہ کے اکثر اساتذہ دارالعلوم دیوبند سے سلسلہ استناد رکھنے کی بناء پر عملی طور پر دارالعلوم سے مربوط ہیں، ہمارا عہد اجتماعیت کا عہد ہے، آج سیاست، تجارت، ملازمت، صنعت وغیرہ سب شعبے تنظیم کے دائرے میں اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں اگر مدارس دینیہ بھی باہم مربوط ہو جائیں تو ان کا یہ باہمی رابطہ (ایک دوسرے سے) اخذ و استفادہ میں مفید ہوگا اور اس رابطہ سے تعاون و تناسر کی فضا ہموار ہوگی، (اگر) مدارس کے اساتذہ میں علمی افادہ و استفادہ کا ماحول بن جائے اور مدارس میں باہمی رقابت کی جگہ ایک دوسرے کی اعانت و نصرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو مدارس کے علمی و انتظامی مسائل کے حل میں بڑی مدد ملے گی۔“

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۲۸)

اس موقع اور ملک گیر اجلاس کے موضوعات میں ایک موضوع ”رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ“ پر غور و خوض بھی تھا، اس موضوع کا تعارف کراتے ہوئے حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی نے یوں ارشاد فرمایا:

”مدارس اسلامیہ ملک کے گوشے گوشے میں دین کو باقی رکھنے اور اسے پھیلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر آج انہیں دہریت پسندوں اور اسلام دشمن عناصر کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑ رہا ہے، مغرب نواز، اسلامی تہذیب و ثقافت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، اس ماحول میں رہ کر دنیا کو دین سے روشناس کرانا انہیں دینی مدارس کا کام ہے، دہریت جس قدر آج کے دور میں پروان چڑھی اور جس طرح آج یورپ اسلام دشمنی پر آمادہ

ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان اسلام مخالف عزائم کا منظم ہو کر مقابلہ کیا جائے، انفرادی کام کے مقابلہ میں جماعتی کام میں برکت و نفع زیادہ ہوتا ہے، پھر باہمی رابطہ سے ایک دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے۔ انہیں مقاصد کے تحت رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔“

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۳۷)

ذیلی کمیٹی نے رابطہ کا جو خاکہ مرتب کر کے پیش کیا تھا اس کی تمہید اس طرح ہے:

”ایک مقصد کے تحت کام کرنے والے مختلف اداروں کے درمیان ربط و تعلق کی اہمیت محتاج دلیل نہیں ہے، خصوصاً دارالعلوم دیوبند اور اس کے نیچ پر کام کرنے والے ادارے کہ ان کا نصب العین محض تعلیم نہیں بلکہ یہ تعلیم کے ساتھ اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی ہمہ جہت اصلاح کیلئے قائم کئے گئے ہیں، اور اسی لئے ماضی میں بھی یہ ادارے ایک دوسرے سے مربوط رہے ہیں۔ البتہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے ابتدائی ایام میں اس ربط کے اظہار میں بڑے خطرات تھے، حکمران انگریز، مسلم علماء کے ساتھ جو وحشت ناک سلوک کر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس ربط کا اظہار نہ ہو۔ اکابر میں ایسی عظیم المرتبت شخصیات موجود تھیں کہ ان کی سرپرستی ہر طرح کے اتحاد اور تعاون کی ضمانت تھی مگر اس کے باوجود کبھی سالانہ امتحان اور کبھی سالانہ اجتماع میں شرکت کے ذریعہ اس ربط کو مستحکم کیا جاتا تھا اور کبھی حساب و کتاب میں یکسانیت کے عمل کے لئے ایک دوسرے سے تعلق مضبوط کیا جاتا تھا، دارالعلوم کی قدیم رودادوں سے ان حقائق کا یقین حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مگر اب صورتحال دونوں اعتبار سے بالکل دگرگوں ہے، اب ہمارے درمیان ایسی شخصیات نہیں ہیں کہ ان کے سایہ میں اتحاد کا یہ عمل خود بخود وجود میں آجائے اور اب اتحاد اور ربط کے اظہار میں بھی کسی طرح کا اندیشہ یا خطرہ نہیں ہے اور یہ کہ ربط و اتحاد کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔“

نمائندہ اجتماع مدارس اسلامیہ منعقدہ یکم و ۲ جولائی ۱۹۹۳ء نے مدارس اسلامیہ عربیہ کے باہمی رابطہ کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے دارالعلوم کو ذمہ دار بنایا تھا، چنانچہ مقررہ کمیٹی نے اس کے لئے ایک خاکہ تجویز کیا جن میں چند باتوں کی خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔

(۱) باہمی رابطہ کی یہ ضرورت اس طرح پوری کی جائے کہ کسی بھی ادارے کی خود مختاری متاثر نہ ہو۔

(۲) رابطہ کے استحکام کے جملہ امور باہمی مشورے سے انجام پائیں۔

(۳) سالانہ اجتماعات میں زیر بحث آنے والے بنیادی نقاط متعین ہو جائیں جو مدارس عربیہ کی ضرورت یا ان کے فرض منصبی سے متعلق ہیں۔

(رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی تیرہ سالہ خدمات ص: ۳۸، ۳۹)

رابطے کے قیام کی اس تجویز کو اجلاس نے نہ صرف یہ کہ منظور کیا بلکہ اسی وقت اکثر ذمہ داران مدارس نے فارم فلپ کر کے دارالعلوم کے ساتھ رشید الحاق قائم کر لیا۔

مرکزی رابطے نے صوبائی رابطوں کے لئے جو دستور پاس کیا ہے اس کی روشنی میں ریاست سے مرکزی رابطہ سے ملحق شدہ مدارس کے ذمہ دار حضرات ہی مجلس عمومی کہلائیں گے، اور انہی میں سے اکیس ارکان عاملہ کا انتخاب ہوگا، ریاستی صدر کا انتخاب مرکزی عاملہ میں ہوتا ہے، نائب صدر و ناظم اعلیٰ ریاستی عاملہ میں سے ہی طے پاتے ہیں، اور اس انتخاب کیلئے مرکزی رابطے سے کسی مبصر کا شریک رہنا ضروری ہے۔

(اداریہ فروری ۱۳ء)

دارالعلوم دیوبند میں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس

۱۳ فروری ۱۳ء کو دارالعلوم دیوبند نے جامعہ کی عظیم الشان مسجد رشید میں ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے علماء کرام کا مشاورتی اجلاس منعقد کیا، جس کی اطلاع اور دعوت کافی پہلے دیدی گئی تھی۔ راقم عاجز بھی ۱۲ تاریخ کو اربجے کی فلائٹ سے روانہ ہو کر ۱۰-۳ کو دہلی پہونچا، حیدرآباد ایرپورٹ پر مولانا عبدالرؤف صاحب قاسمی (شیخ الحدیث جامعۃ الہدیٰ مرادآباد) سے ملاقات ہو گئی تھی جو حیدرآباد میں مجلس تحفظ ختم نبوت آندھرا پردیش کی جانب سے منعقدہ دس روزہ جلسہائے سیرت میں بحیثیت مہمان مقرر تشریف لائے ہوئے تھے اور اسی فلائٹ سے واپس ہو رہے تھے، ماشاء اللہ ان کی رفاقت علم افزاء اور بہتر رہی۔ دہلی ایرپورٹ پر مولانا اقبال صاحب قاسمی (سابق شیخ الحدیث جامعہ باقیات الصالحات ویلور) سے بھی ملاقات ہو گئی، مولانا موصوف دیوبند پہونچنے کے لئے کسی رفیق کے متلاشی تھے، مولانا علمی و تحقیقی مزاج کے آدمی ہیں، ان کی رفاقت بسا غنیمت تھی، انہیں ساتھ لیکر دیوبند کے لئے روانہ ہو گئے، نظام الدین مرکز میں ظہر و عصر ادا کر کے یہیں پرکھانے سے فارغ ہوئے، اس کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب مرادآباد کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے اور ہم لوگ دیوبند کے لئے بذریعہ کار! میرٹھ کے قریب ٹرافک مسدود رہی جسے وہاں کی اصطلاح میں جام لگنا کہتے ہیں۔ مغرب عشاء راستے میں ادا کرتے ہوئے دس بجے

دارالعلوم پہونچے، مہمان خانے کا روم نمبر ۱۵ ہمارے لئے تجویز تھا، اسی میں قیام کیا، علی الصباح برادر محترم مولانا مفتی عبدالغنی صاحب بھی اسی کمرہ میں فروکش ہوئے۔ نماز فجر میں نے مسجد چھتہ میں ادا کی، نماز بعد حضرت قاری عثمان صاحب مدظلہ نے ناشتہ پر مدعو فرمایا، حضرت نے اشرف الجرائد کی مکمل فائلوں کی فرمائش کی تھی وہ بھی دینا تھی، ناشتہ کے بعد تیاری کر کے مسجد رشید پہونچے، جہاں تحفظ سنت کا مشاورتی اجلاس تھا، اجلاس میں تلاوت کلام پاک اور نعت سرور کائنات ﷺ کے بعد ترانہ دارالعلوم پیش کیا گیا، بعد ازاں مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ نے خطبہ صدارت پڑھا، جس میں اجلاس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالنے کے علاوہ مسئلہ تقلید کی حقیقت و اہمیت کو بھی واضح کیا گیا تھا، اس مختصر مگر جامع خطبہ صدارت کے بعد پروگرام کے مطابق اکابر دارالعلوم کے موضوعاتی خطابات تھے، دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری، دارالعلوم کے مؤقر استاد حضرت مولانا ریاست علی بحبسنوری، مدیر ماہنامہ دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی، استاذ حدیث حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم کے خطابات ہوئے، بعد ازاں باہر سے آئے ہوئے مندوبین میں سے مولانا سید اشہد رشیدی (مراد آباد) حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی (لکھنؤ) مفتی عزیز الرحمن صاحب ممبئی، مفتی غیاث الدین رحمانی اور اس عاجز (حیدر آباد) نے اپنی آراء پیش کیں۔ صبح کی نشست حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی دعا پر اختتام پذیر ہوگئی۔ ظہر سے تا مغرب وقفہ تھا ہم نے ظہر بعد حضرت مہتمم صاحب سے اور عصر بعد حضرت مفتی سعید احمد صاحب سے گلبرگہ کے احباب کے ساتھ ملاقات کر کے گلبرگہ میں ماہ اپریل میں منعقد شدنی دوروزہ اجلاس تحفظ شریعت میں شرکت کے لئے ان حضرات کی خدمت میں درخواست پیش کی۔

بعد مغرب پروگرام کے مطابق دوسری نشست کا آغاز ہوا، تلاوت کلام پاک کے بعد حضرت مولانا حبیب احمد صاحب خلف الرشید حضرت قاری صدیق احمد، بحر العلوم حضرت

مولانا نعمت اللہ صاحب، مناظر اسلام علامہ طاہر گیلوی کے بیانات ہوئے، مولانا مفتی راشد صاحب اعظمی نے دارالعلوم میں قائم شعبہ تحفظ سنت کا تعارف اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اجلاس کی تجاویز پاس کی گئیں، اور اعلامیہ کا اجراء کیا گیا، احبہاء تجاویز و اعلامیہ کے بعد ملک بھر سے تشریف لائے مختلف علماء کو یکے بعد دیگرے اس کی تائید اور اظہار خیال کا موقع دیا گیا، حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی، اور مولانا مفتی شوکت صاحب بستوی نے بہت سلیقے سے اجلاس کی کاروائی چلائی، طلبہ و اساتذہ دارالعلوم نے مہمانانِ گرامی کی بھرپور خدمت کی اور قیام و طعام کی سہولت بہم پہنچائی۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ ایک اہم مقصد کے حصول اور ایک خطرناک مفسدہ کے ازالہ کے لئے کی گئی اس سعی کو شرف قبول عطا فرمائے اور منظور کر دہ تجاویز کے باحسن وجوہ تکمیل پانے کے اسباب پیدا فرما کر اس کا نفع عام و تمام فرمائے۔ آمین

تجاویز و اعلامیہ کا متن درج ذیل ہے۔

تجاویز:

دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام، تحفظ سنت کے موضوع پر منعقد ہونے والا سی اہم مشاورتی اجلاس پورے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ امت مسلمہ کے لئے راہ ہدایت، اہل السنۃ والجماعۃ کا وہ راستہ ہے جسے حدیث شریف میں مانا نا علیہ واصحابی کے جامع الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، حضرات ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کی بیان کردہ تفصیلات کی روشنی میں کتاب و سنت پر عمل کرنا اور ائمہ و اسلاف کے راستے پر مضبوطی سے کار بند رہنا، جسے ہر دور میں امت کے سواد اعظم نے اختیار کیا اور جس کی نمائندگی پوری جامعیت کے ساتھ اس دور میں حضرات اکابر دیوبند کے ذریعہ ہوتی ہے۔

اس راہ ہدایت سے امت مسلمہ کو منحرف کرنے کی جو نارا واکوششیں گذشتہ تقریباً دیر ۷۰
صدی سے جاری ہیں، ان کا جھنڈا موجودہ دور میں جماعت غیر مقلدین نے اٹھا رکھا ہے،
اور علماء سے امت کا رابطہ منقطع کرنے اور علماء پر اعتماد کمزور کرنے کی مسلسل محنت کے نتیجے
میں مسلمانوں کا ایک طبقہ اس نئی فکر سے متاثر ہو رہا ہے، اس لئے علماء کرام اور مدارس
اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اس فکری گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے اٹھ
کھڑے ہوں اور بھرپور جدوجہد سے کام لیں۔

اس مقصد کے لئے یہ اجلاس درج ذیل اقدامات تجویز کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ
حضرات علماء، ارباب مدارس اور ملت کے تمام ذمہ دار حضرات ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے
کی کوشش کریں گے۔

- (۱) بڑے مدارس طلبہ کو اس موضوع پر تیار کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے طرز
پر محاضرات کا نظام قائم کریں اور جن میں تکمیلات اور منتهی جماعتوں کے طلبہ شریک ہوں۔
- (۲) منتخب اساتذہ کرام کو اس موضوع پر تربیت دی جائے۔
- (۳) بڑے مدارس اپنے یہاں ایسے مبلغین کا تقرر کریں جو اس موضوع پر بھرپور
تیاری کے ساتھ کام کر سکیں۔

(۴) اس موضوع پر اساتذہ مدارس، ائمہ مساجد اور مقامی علماء کی تدریب کے لئے
علاقائی سطح پر تربیتی کیمپ منعقد کئے جائیں۔

(۵) جو مسائل غیر مقلدین اٹھاتے ہیں ان کے بارے میں مختصر اور حساب مع و مدلل
کتاچے تیار کر کے عام کئے جائیں۔

(۶) مختلف شہروں میں ”مجلس تحفظ شریعت“ کے نام سے کمیٹیاں قائم کی جائیں، جو
غیر مقلدین اور دیگر فرق باطلہ کے تعاقب کا کام کریں۔

(۷) جو سادہ لوح عوام یا عصری تعلیم یافتہ لوگ غیر مقلدین سے متاثر ہوتے ہیں ان

کو، انفرادی محنت اور عمومی جلسوں کے ذریعہ صحیح فکر سے روشناس کرایا جائے۔

(۸) ائمہ مساجد حسب ضرورت اس موضوع پر گفتگو کریں اور ذمہ داران مساجد اس میں ان کا تعاون کریں۔

(۹) طلبہ کو احادیث یا دکرانے کا سلسلہ جاری کیا جائے اور ان میں بھرپور مسلکی شعور پیدا کیا جائے۔

(۱۰) یہ اجلاس، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سے اپیل کرتا ہے کہ وہ دارالعلوم میں سرگرم عمل شعبہ تحفظ سنت کے دائرہ کار کو وسعت دے تاکہ اس کے ذریعہ افراد سازی کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاسکے۔

(۱۱) سعودی حکومت اور علماء و مشائخ کو صحیح صورت حال سے واقف کرانے کے لئے، دارالعلوم دیوبند کی قیادت میں موقر علماء کا ایک وفد وہاں کا دورہ کرے۔ اور اعلامیہ کے مطابق اجلاس کے اندیشوں اور جذبات سے حکومت سعودیہ کو واقف کرائے کہ غنیمت مقلدین، سعودی علماء و مشائخ کا نام لے کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں، وہاں سے حاصل شدہ وسائل کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اہل حق سے سعودی عرب کی حکومت اور علماء کو دور کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈے کا سہارا لیتے ہیں، اور جالیات کے شعبہ تبلیغ کا بھی غلط استعمال کرتے ہیں، اس طرح وہ سعودی حکومت کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں اور امت میں تفریق پیدا کر رہے ہیں، لہذا حکومت سعودیہ کو چاہیے کہ وہ راہ اسلاف سے منحرف اس فرقے کی تائید و تقویت کے بجائے اس پر قدغن لگائے۔

اعلامیہ:

علمائے ہند کا یہ نمائندہ اجلاس ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اپنے اس اذعان و یقین کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نجوم ہدایت ہے، ان کی روایت تو حجت ہے ہی ان کی درایت بھی امت کے لئے نمونہ عمل ہے، عہد صحابہؓ میں جن احکام و مسائل کے بارے میں اجماع ہو گیا ہے وہ دین میں حجت ہیں، ان سے انحراف

جائز نہیں۔ اور جن مسائل میں ان کی آراء مختلف رہی ہیں ہمارے نزدیک حق و صواب انھیں میں منحصر ہوگا، ان سے خروج درست نہیں، اسی طرح وہ مسائل جن پر ائمہ اربعہ: امام ابوحنیفہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا اتفاق ہے اب ان سے خروج بے دینی ہے۔

یہ اجلاس اس بات کا بھی اعلان ضروری سمجھتا ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء و محدثین کی علمی و دینی خدمات اہل اسلام کا ایک عظیم سرمایہ ہے، جن پر مکمل اعتماد ہمارے لئے خیر و فلاح اور سعادت کا باعث ہے، علمائے ہند کے اس اجلاس کا یہ احساس ہے کہ معاندین اسلام، بالخصوص یورپ اور امریکہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے دائرہ حدود و نفوذ کو تنگ سے تنگ کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ تحریک چلا رہے ہیں، ایسے پر آشوب وقت میں پورے عالم اسلام کو متحد ہو کر ان کی اس منفی جارحانہ تحریک کا مقابلہ کرنا چاہئے، لیکن جماعت غیر مقلدین نے نہ جانے کن تحفظات کے تحت ان کے مقابلے کے بجائے خود مسلمانوں کے خلاف چوطرفہ محاذ کھول رکھا ہے اور مسلمانوں کے سوا اِعظم کو بزعم خود دین سے خارج کرنے کی جدوجہد میں مبتلا ہیں، اور افسوس و حیرت تو اس بات پر ہے کہ سعودی حکومت ان غیر مقلدین کی ہر طرح سے ہم نوائی کر رہی ہے، اور ”وزارة الشؤون الاسلامیہ“ کے شعبہ ”توعیۃ الجالیات“ نے مقلد مسلمانوں، بالخصوص احناف کے اکابر علماء کے خلاف مہم چلا رکھی ہے، سعودی حکومت جو اتفاق بین المسلمین کی سب سے بڑی داعی ہے، اور ماضی میں اس سلسلہ میں اس نے قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں وہی آج افستراق بین المسلمین کا سبب بنی ہوئی ہے، اس کا یہ رویہ جہاں عام مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہے وہیں خود سعودی حکومت کے لئے بھی اس کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔

یہ اجلاس حکومت سعودی عرب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ پر روک لگائے اور اس کے لئے عملی اقدامات کرے، ورنہ امت کا سوا اِعظم ہندو بیرون ہند میں سعودی حکومت کے اس طرز عمل پر اپنی بے چینی کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگا۔

دو گھنٹے حکیم جسم و جاں کی صحبت میں

دارالعلوم میں تحفظ سنت کے مشاورتی اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد علی الصبح علی گڑھ کیلئے روانگی عمل میں آئی، حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ سے حاضری کی اجازت پہلے ہی حاصل کر لی تھی، صبح کی نماز خادم الاسلام ہاپوڑ کی مسجد میں ادا کر کے ۹ بجے علی گڑھ پہنچ گئے، حضرت کے خادم عزیزم مولوی عبدالمقسط سلمہ نے چاء پلائی اور بتلایا کہ تھوڑی دیر میں ناشتے کا انتظام ہوگا اور ناشتے ہی پر حضرت سے ملاقات ہو جائے گی۔

چاء آنے تک میز پر رکھی ہوئی کتاب ”قافلہ اہل دل“ اٹھا کر حضرت خواجہ غلام علیؒ کے ملفوظات دیکھنے لگا تو ان ملفوظات پر نظر پڑی:

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا نام حق تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے کہ کھانا قوتِ شہوانی و نفسانی پیدا نہ کرے، بلکہ ایسی طاقت دے جو اطاعت و عبادت میں صرف ہو، فقراء ہر لقمہ کے اول میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ پڑھتے ہیں، مجتمع ہو کر کھانا بہت برکت رکھتا ہے لیکن ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کرے، کھانے پینے کے بعد حدیث میں جو دعا آئی ہے اس میں وجعلنا من المسلمین سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام اللہ کی نعمتوں میں ایک عظیم نعمت ہے، اس نعمت کا شکر بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔

دل میں آیا اہل اللہ کی باتوں میں بھی عجیب تاثیر ہوتی ہے، دو سو سال گزرنے کے بعد بھی ان باتوں میں بلا کی تازگی اور غضب کی تاثیر محسوس ہوتی ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کلام نبوی اور کلام الہی کا کیا مقام ہوگا۔ اللہ اکبر!

ساڑھے نو بجے دسترخوان لگا اور حضرت حجرہ سے باہر آئے ملاقات ہوئی، بہت ہی شفقت و محبت سے معاف فرمایا، چند اور مہمان تھے جو پہلے سے مقیم تھے ان سب کے ساتھ ناشتہ ہوا۔ گرم گرم پوری، آلو کی سبزی، آملیٹ، بریڈ مکھن، ناشتے میں شامل تھے۔

حضرت نے ناشتے کے دوران دیگر مہمانوں کا مجھ سے اور میرا ان سے تعارف کروایا، مجھے وسوسہ بھی کبھی نہ آیا کہ حضرت کو اپنی شہد جو دینی خدمات چل رہی ہیں ان کا تفصیلی علم ہوگا، مگر حضرت حکیم صاحب مدظلہ نے مدرسے کا، لکھنے پڑھنے کی مشغولیت کا، اور فرق باطلہ سے متعلق جن خدمات کا موقع ملا تھا ان کتابوں کا تذکرہ بھی تعارف میں فرمایا، جس سے اپنے چھوٹوں کے کام سے ان کی باخبری و آگہی کا اندازہ ہوا۔

تحفظ سنت کا نفرنس سے متعلق اس عاجز سے پوچھا کہ کیسی رہی؟ اور خود ہی فرمایا: تقابل و تفاضل اور اہانت و تنقیص کے بغیر اپنی بات پھیلائی جاتی رہے اس سے کام ہوگا اور انشاء اللہ نفع ہوگا۔

ناشتے کے بعد چاء آئی تو میں نے چاء کی پیالی اپنی پلیٹ میں رکھ لی، فرمایا: پلیٹ سے علاحدہ رکھو پلیٹ کی چکنائی لگ جاتی ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اس سے چاء میں سالن کے مہک شامل ہو کر دوسروں کے لئے تکدر کا سبب بن جاتی ہے، یہ غایت سلیقہ کی بات ہے۔)

میں نے مولانا یحییٰ نعمانی صاحب زید مجدہ کی کتاب ”تقلید اور مسلکی اختلاف کی حقیقت“ جو مجلس علمیہ آندھرا پردیش سے شائع ہوئی تھی پیش خدمت کی تو قبول فرما کر اپنے خادم کو سرہانے رکھ دینے کے لئے حوالہ کیا، پھر فرمایا: دیکھو کتنا میں خواہ کتنی ہی لکھ دی جائیں کافی نہیں ہیں، عام مسلمانوں کو ان کے فہم کے مطابق تنہیم کی ضرورت ہے، مختصر مضامین اور عام فہم بات بہت مفید ہوتی ہے، مناظرہ و مباحثہ کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں، خود حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اخیر میں یہی تاثر ظاہر فرمایا تھا۔

میں نے حضرت محی السنہ سے متعلق اپنا لکھا ہوا ایک مضمون ملاحظے کیلئے پیش کیا تو فرمایا:

یہاں رکھ کر جائیں، بعد میں دیکھوں گا، پھر فرمایا: بزرگوں کی سوانح عمریاں پہلے تو اس لئے لکھی جاتی تھیں کہ ان بزرگوں کے احوال و سیرت کو نکھارا اور دکھایا جائے لیکن ادھر میں دیکھ رہا ہوں کہ عام طور سے جو بزرگوں کے تذکرے اور سوانح لکھے جا رہے ہیں تو ان میں لکھنے والے اُن بزرگوں کے ساتھ اپنے تعلق اور اپنی شان و مقام کو واضح کرنے کی زیادہ فکر کرتے ہیں کہ میرا ایسا تعلق تھا اور میرا یوں اکرام فرماتے تھے اور خصوصی معاملہ ہوتا تھا وغیرہ یعنی ان مضامین میں زیادہ زور تو اپنے کو نمایاں کرنے پر دکھائی دیتا ہے، حضرت والا کے سلسلہ میں بھی بعض ایسے مضامین نظر سے گزرے، افسوس ہوتا ہے سوانح عمریوں میں ان کی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہیے جن کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، ان کی صفات و کمالات کو امت کے سامنے لانا چاہیے تاکہ چھوٹوں کو اور نہ جاننے والوں کو ان سے سبق لینے اور اپنے اخلاق سنوارنے میں مدد ملے۔

اخلاص کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بہت تاکید سے فرمایا: دیکھو بیٹا! ہر کام اخلاص سے کیا کرو، حضرت والا فرمایا کرتے تھے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں ہے اور مثال دیتے تھے کہ جو کام تم کر رہے ہو کوئی اور بھی کرنے لگے تو تمہیں غم ہوتا ہے یا خوشی؟ خوشی ہوتی ہے تو یہ اخلاص ہے، کیوں کہ دین کا کام مقصود تھا، وہ مزید ہونے لگے تو مخلص کا دل خوش ہوتا ہے۔

اشرف الجرائد کے حوالہ سے فرمایا: یہاں پہنچتا ہے، میں دیکھتا ہوں، شیعیت سے متعلق جو مضمون (مدوح الحربی کے مضمون کا ترجمہ) تھا پسند آیا، سنجیدہ آدمی کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔

مدرسہ کی خیر خیریت دریافت کی، حاضرین سے فرمایا: ان کا بڑا مدرسہ ہے کافی طلبہ پڑھتے ہیں، مجھ سے فرمایا: طلبہ سے گفتگو کا جب موقع ملے تو ان سے کہیں کہ علم کا مقصد تقوی اللہ ہے، تقوی کا عام فہم موٹا موٹا مفہوم یہ بتلا دو کہ تقویٰ نام ہے اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے

بچنے کا طلبہ سے کہو کہ علم کے حصول کے ساتھ گناہوں سے بچنے کا بہت اہتمام کریں، اور گناہوں سے بچنے کی ہمت و توفیق ملتی ہے اہل اللہ کی صحبت سے، اتقوا کے بعد کونوا مع الصادقین ہے، اس کی مدرسہ میں طلبہ کو یاد دہانی کراؤ اور بار بار بتلاتے رہو۔

خدا م دین اور اہل مدارس کے درمیان مناقشات کے حوالہ سے فرمایا: اس قسم کے واقعات جن علماء کے بھی سامنے آتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علم تو حاصل کیا مگر اہل اللہ کی صحبت نہیں پائی، کوئی ان کا بڑا نہیں، خود رائی سے کام کرتے ہیں، یہ سب حالات اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں، بزرگوں نے ہمیشہ اپنے کو کسی کا پابند رکھا ہے، حضرت والاؒ خود اتنے بڑے مقام پر تھے مگر انہوں نے کبھی اپنے کو شیخ سے مستغنی نہیں سمجھا، حضرت حکیم الامتؒ کے بعد سے آخر تک ہمیشہ کسی نہ کسی سے وابستہ رہے۔ مدارس میں بھی جو حالات ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اساتذہ عام طور سے غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں، اسی لئے حضرت والا نے اشرف المدارس میں تقرر کیلئے اس کو شرائط میں رکھا کہ کسی شیخ سے اصلاحی تعلق ہونا چاہیے۔

فرمایا: کسی مرحلے پر آدمی اپنے کو اصلاح کی ضرورت سے مستغنی نہ سمجھے، حضرت والاؒ اگرچہ حضرت حکیم الامتؒ کے خلیفہ تھے، خود ایک مقبول و محبوب شیخ بن گئے تھے، مگر آخر تک انہوں نے کسی نہ کسی کو اپنا بڑا بنائے رکھا، حضرت تھانویؒ نے جب اپنے خلفاء کو ہدایت دی تھی کہ آپس میں کسی کو اپنا شیخ بنالیں اور اس کی اطلاع مجھے کریں تو حضرت والاؒ نے اپنے لئے خواجہ صاحبؒ کو منتخب کر لینے کی اطلاع دی، اس پر حضرت حکیم الامتؒ نے جواب لکھا ”لا جواب انتخاب ہے“۔ بعد میں بھی حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ، حضرت مولانا عبد الرحمن کیمل پوریؒ، حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کو اور آخر میں حضرت شاہ پر تاب گڑھیؒ کو اپنا بڑا مانتے رہے۔

ایک عبرت و نصیحت کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا: کہ حضرت والاؒ خود ایک عالم اور شیخ

طریقت ہونے کے باوجود ان کے عجز و کسرتی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ کسی بات پر حضرت مفتی محمود صاحبؒ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں یہاں نہیں رہوں گا، حضرت والاؒ نے اشکبار ہو کر اپنی غلطی سے معذرت کی، پھر بھی حضرت مفتی صاحب چلے گئے تو حضرت والا نے نائب صاحب سے فرمایا: میرا بستر باندھ دیجئے، میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں، چنانچہ اپنا بستر لیکر اسٹیشن پہنچ گئے کہ اگر آپ خفا ہو کر چلے جائیں گے تو میں بھی آپ ہی کے ساتھ جاؤں گا، یہ کیفیت دیکھ کر حضرت مفتی صاحب واپسی کے لئے راضی ہو گئے، اس طرح اپنے استاذ کو واپس مدرسہ لے کر آئے، یہ کوئی معمولی بات ہے؟ کس قدر عجز و تواضع کی بات تھی، ہمیں سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

بعض لوگوں کی مالی بے دیانتی اور خیانت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: آج کل لوگ دین کے نام پر دین کو بدنام کر رہے ہیں چندہ میں جائز ناجائز کا کچھ خیال نہیں ہے، دوسرے مدرسوں کی یا فرضی ناموں کی رسیدیں چھاپ کر چندہ وصول کر رہے ہیں، ایک صاحب پریس میں پہنچ کر اشرف المدارس ہردوئی کی رسید چھپوانا چاہتے تھے، اتفاق سے پریس کے ذمہ دار مدرسہ سے واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اس مدرسہ میں آج تک رسید نہیں چھپی، چندہ کا نظام ہی نہیں ہے، انہوں نے ربط کر کے ہمیں اطلاع دی۔ یہ حرکتیں ہو رہی ہیں، ایک صاحب نے چندہ کے پیسے سے اپنا مکان بنالیا، بعض لوگوں کے پوچھنے پر جواب دیتے ہیں کہ دینے والے نے مناسب جگہ لگانے کا اختیار دیا تھا، یہ حال ہو رہا ہے دیانت کا، ذرا اپنے اکابر کا طریقہ دیکھو کس قدر محتاط تھے اور کیسا خوفِ خدا تھا۔

طلبہ کے سلسلہ میں فرمایا: آج کل طلبہ کے پاس قیمتی گھڑیاں ہیں، موبائیل فون ہیں، اس کے باوجود مدرسہ سے امداد بھی لیتے ہیں، انہیں اس پر غور کرنا چاہیے، جب تک امداد کے مستحق نہ ہوں مدرسہ سے امداد نہ لیں، اس سے علم میں برکت نہیں ہوتی اور موبائیل تو طلبہ رکھے ہی نہیں، اس سے آج کل بہت نقصان ہو رہا ہے، اخلاق خراب ہو رہے ہیں، وقت

کاضیاع ہے، طلبہ کو بار بار تاکید کی جائے فہمائش کی جائے۔ اسی طرح طلبہ کو تاکید کی جاتی رہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ مدرسہ کی روشنی کا استعمال نہ کریں، ضرورت ختم ہونے کے بعد بجلی گل کر دیں، اسی طرح پانی کے استعمال میں اسراف سے بچیں، جب سمندر پر بھی وضو کر رہے ہوں تو پانی میں اسراف کی اجازت نہیں دی گئی تو مدرسہ کے پانی کا بے ضرورت ضیاع کیسے درست ہو سکتا ہے؟

مسلمانوں کے اردو زبان سے دوری کے حوالہ سے فرمایا: مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں جب فارسی زبان رائج ہو گئی تھی، وہی پڑھی لکھی جاتی تھی تو غیر مسلموں نے نوکریاں حاصل کرنے کے لئے خود تو فارسی پڑھی مگر اپنے گھر کی عورتوں کو نہیں سکھائی، ان کو خاندانی اور مادری زبان سکھاتے تھے، ان کی گود میں مذہبی کتابیں لا کر ڈال دیتے تھے، تاکہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب ضائع نہ ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان ان کی نسلوں میں محفوظ اور منتقل ہوتی رہی، یاد رکھو: زبان، مانگنے سے نہیں ملتی، زبان اپنانے اور اختیار کر لینے سے ملتی ہے۔

یہ عاجز سوچتا رہا کہ انگریزوں کے غلبے کے بعد جب انہوں نے انگریزی زبان کو ہندوستان میں رواج دیا اور تعلیم کو اس سے وابستہ کر دیا تو اس وقت مسلمان بھی اگر ایسا کرتے کہ مرد لوگ تو ذریعہ معاش کے درجے میں اسے سیکھ لیتے مگر گھر کی عورتوں کو اردو زبان ہی کا عادی بنا کر رکھتے تو ان کی نسلیں آج اپنی تہذیب اور مذہب کے انمول اور قیمتی سرمایہ سے محروم نہ ہوتیں، مسلمان گھرانوں میں اردو زبان سے غفلت اور انگریزی کی طرف رجحان کے نتیجے میں انہیں فائدہ تو دو کوڑی کا نہ ہوا نقصان ناقابل تلافی ہو گیا کہ اپنی تاریخ، تہذیب اور مذہب سب کچھ سے کنگھال ہو کر بھکاریوں کی طرح کا سہ گدائی لئے پھر رہے ہیں، دردر سے ملی تہذیبوں اور غیروں سے سنی تاریخوں کے درمیان چوں چوں کا مرہ بنے ہوئے ہیں، کمال یہ ہے کہ محروموں کا یہ قافلہ محرومی ہی کو حاصل حیات مانتا اور اسی پر نازاں

دکھائی دیتا ہے ۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

پونے گیارہ بجے فرمایا: اب مطب کا وقت ہو رہا ہے، اس وقت ناشتے میں اور عصر بعد تھوڑا سا وقت مل جاتا ہے ملاقات کا نظام بنا ہوا ہے۔ اب جاسکتے ہو، دیکھو! جب بھی سفر کرنا ہو دو رکعت نفل نماز پڑھ کے اور دعا کر کے سفر میں نکلا کرو، اس کا اہتمام رکھو، پھر مصافحہ کر کے رخصت فرمادیا۔

دو گھنٹے کی اس ملاقات میں جسمانی اور روحانی دونوں ناشتے ہوئے اور دونوں بہت ہی لذیذ و مفید، اللہ پاک اہل اللہ کی ان کرم فرمائیوں کی قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

یہ بھی عرض کر دوں کہ اس وقت حضرت مدظلہ مسلسل فرماتے رہے، آواز پست تھی، غور سے سنتا رہا، نہ لکھنے کا موقع تھا نہ ریکارڈ کرنے کی طرف دھیان گیا، جو باتیں حافظے میں محفوظ رہ گئیں تھیں میں نے اطمینان و اعتماد کی بناء پر قارئین کے نفع کے لئے نقل کر دی ہیں۔ (اداریہ مارچ ۱۳ء)

قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

مدیر محترم نے ادارہ ہذا کے اساتذہ کرام کو چند دن قبل ناشتے پر مدعو کر کے خصوصی خطاب فرمایا تھا، جو فکر انگیز و نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اس خطاب کو مولانا عبدالرحمن محمد میاں قاسمی، استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد نے ریکارڈر کی مدد سے ضبط تحریر میں لایا، جسے نفع عام کے مد نظر شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔
از: مرتب غفرلہ

حمد و صلوة کے بعد فرمایا:

حضرات اساتذہ کرام! اس وقت آپ سے تین باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عام آدمیوں کے مقابلہ میں کسی کو اللہ تعالیٰ کوئی خصوصی نسبت اور کوئی خاص مقام عطا فرمائے تو اس نسبت اور مقام کا احترام ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، اس منصب اور نسبت کا خیال اور دھیان ہمیشہ رہنا چاہیے، آپ یہ کبھی فراموش نہ کریں کہ آپ عامی نہیں عالم ہیں، یہود کے بگڑنے اور قبولیت کے بعد مردود ہونے کا سبب یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی حیثیت کو فراموش کر دیا اور ان کے علماء اپنی ذات کے بارے میں بھی اور قوم کے بارے میں بھی اپنی ذمہ داریوں کو بھول گئے۔

اس وقت ہماری قوم میں بہت سے منکرات جاری و ساری ہیں، جن کو آپ علماء ہی روک سکتے ہیں، یہ آپ کی ذمہ داری ہے، آپ حضرات ماشاء اللہ علماء ہیں، حدیثیں

پڑھی ہیں، یہ حدیث بھی پڑھی ہوگی کہ ایک مرتبہ اللہ کے نبی ﷺ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوئی، آپ حزن و ملال فکر و اہتمام سے اپنے گھر سے اٹھ کر مسجد تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ۔۔۔ مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ آخر کیا بات پیش آگئی ہے، تو میں دروازہ کے پاس کان لگا کر کھڑی ہو گئی تاکہ میں بھی سنوں کہ آپ کیا اہم اعلان فرمانے والے ہیں، آپ ممبر پر چڑھے، اور اعلان کیا کہ لتأمرن بالمعروف ولتنہون عن المنکر اولیو شکن اللہ عذاباً من عندہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ کے پاس سے عذاب آنے کا انتظار کرو۔ عذاباً یعنی ایک خاص قسم کا عذاب جو من جانب اللہ ہوگا، خاص اس لئے کہا کہ اس امت پر مسخ کا فسخ کا ایسا عمومی عذاب تو نہیں آئے گا جیسا پچھلی امتوں پر آتا تھا۔ خاص عذاب کی توجیہ اہل اللہ نے فکر کے مسخ ہو جانے، دل کے سخت ہو جانے سے کی ہے، یہ عذاب غیر مرنی عذاب ہے، انسان کی فکر منحرف ہو جاتی ہے، اس کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے، بعض لوگ ایسے گمراہ ہوئے کہ ان کا دل سخت پتھر ہو گیا۔۔۔ معوذ باللہ۔۔۔ یہ عذاب ہزار عذابوں کا مجموعہ ہے۔ ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک بستی کو گناہوں کی کثرت کی وجہ سے پلٹ دینے کا حکم دیا تو جبرئیلؑ نے کہا: پروردگار! اس میں آپ کا ایک ایسا خاص بندہ ہے کہ اس نے پل جھپکنے کے بقدر بھی کوئی گناہ نہیں کیا لم یعصک طرفۃ عین تو جواب دیا گیا پہلے اسی کو گراؤ اور اس کے اوپر بستی کو گراؤ، کیوں کہ اس نے قوم کو برائی سے نہیں روکا، اللہ کی نافرمانیوں پر اس کو ناگواری تک نہ ہوئی۔^۲

آپ حضرات میں سے چونکہ بعض خطبا ہیں اور ہفتہ میں ایک بار ہی سہی قوم کو کچھ سنا نے کا موقع مل جاتا ہے، اس لئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وعظ و نصیحت پوری تیاری اور اہتمام کے ساتھ ایک ذمہ داری سمجھ کر کریں۔ کیونکہ بہت سے خطباء کو یہ دیکھا گیا کہ وہ ایک

دو گھنٹے قبل خطبات کی کوئی کتاب کا سرسری مطالعہ کر کے کچھ سنا دیتے ہیں، گویا بس ضابطے کی تکمیل کر دیتے ہیں، ایسا نہ کریں بلکہ ہفتہ بھر اچھی طرح مطالعہ کر کے مواد جمع کر کے ایک ضروری اور اہم عنوان پر بیان کریں تاکہ عوام الناس کو کوئی علمی فائدہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آپ وعظ میں بس جوشِ خطابت دکھا کر اور زور دار تقریر کر کے ضابطہ کی تکمیل نہ کریں بلکہ معاشرہ میں تیزی سے بڑھتی بے راہ روی اور اخلاقی و اعتقادی اغلاط پر کڑی نظر رکھ کر اپنے خطابات و بیانات میں ان کی اصلاح کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلاتے رہیں۔ علمی و عملی طور پر اپنے کو گھلائیں مٹائیں تب جا کے انشاء اللہ نفع ہوگا۔

غرض یہ ہے کہ جو خاص لوگ ہیں ان کو اپنی خصوصیت برقرار رکھنی چاہئے خصوصیت کے معنی شان بگھارنا نہیں بلکہ منصب کا احترام کرنا ہے، حقوق کی ادائیگی ہے، عالم ہونا، داعی ہونا، مصلح ہونا ایک آسمانی منصب ہے یہ دنیوی عہدے نہیں ہیں۔ دنیا میں بھی خواص کا عوام کے مقابلے میں زیادہ مواخذہ ہوتا ہے، کوئی آدمی سرکاری عہدے پر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً پہلے اس کو معطل کر دیا جاتا ہے کیونکہ سرکاری عہدہ پر رہ کر اس نے ایسا ناروا کام کیا، اپنے منصب کا خیال کیوں نہ کیا؟۔ اب بتائیے کہ دنیا کے ادنیٰ عہدار کی بے اصولی اور منصب کی توہین تعطل کا سبب بن سکتی ہے تو ہم دینی منصب والوں کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوگا؟، اگر ہم بھی اپنے منصب و مقام کی توہین کریں اور حق تعالیٰ ہم سے کام لینے کا ارادہ ختم کر دیں، ہمیں معزول کر دیں تو ہم کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ دنیا کے مناصب کی معزولی تو معلوم ہو جاتی ہے، اخباروں میں آ جاتی ہے لیکن حق تعالیٰ ایسی صورتیں اختیار کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کام سے معزول کر دیا اور ہم کو پتہ بھی نہیں چلا، ہم ابھی پڑھا ہی رہے ہیں۔ معزولی کبھی کام سے محروم کر کے ہوتی ہے اور کبھی فیضان بند کر کے ہوتی ہے۔

دوسری بات جو عرض کرنی ہے وہ تدریس کی ذمہ داری کو ذمہ دارانہ طرے پر پورا کرنے کی بات ہے، میں حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ کا ایک مضمون پڑھ رہا تھا اس میں

اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اردو شروحات نہ دیکھیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر آپ عالم ہو کر بھی اردو شروحات پر اکتفا کریں گے تو آپ کے شاگردوں کی کیا استعداد بنے گی ان کا کیا ہوگا؟۔ آپ ہدایہ پڑھاتے ہیں اور اشرف الہدایہ دیکھ کر پڑھا دیتے ہیں تو آپ خود غور کریں کہ آپ کو مکمل عالم ہو کر بھی ہدایہ کی عبارت کا ترجمہ کرنا نہیں آیا تو پھر آپ کی قابلیت اور استعداد کا کیا حال ہے؟ آپ کو خود ترجمہ اور حل عبارت کرنا کیوں نہیں آتا؟۔ ہاں! بعض مسائل تحقیق طلب ہوتے ہیں، مراد معلوم نہیں ہوتی یا عبارت سخت ہوتی ہے تو ایسے وقت دیکھ لیں کہ مترجم نے کیا ترجمہ کیا ہے، یہ ثانوی درجہ کی چیز ہے، اصل تو یہ ہے کہ آپ کو کتاب متن اور حاشیہ سے ہی حل کرنا آجائے، آپ ہر سبق کا براہ راست ترجمہ کر سکیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ آپ بھی اردو شرح دیکھ کر پڑھا رہے ہیں اور آپ کا شاگرد بھی وہی شرح دیکھ کر آ رہا ہے اور بعض اوقات یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ استاذ صحیح سمجھ کر نہیں آئے ہیں، شرح میں تو ایسا لکھا ہے، یہ کتنا بڑا نقصان ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استعداد کو بڑھانے کی فکر جو نیر اساتذہ بھی کریں اور سینئر بھی کریں، اگر آپ میں جستجو و طلب نہیں، علم بڑھانے کی فکر نہیں تو کیسے کام ہوگا؟

یہاں مدرسہ میں چند دن قبل مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ دودن تھے، عظمت صحابہؓ کے جلسے میں آئے ہوئے تھے، میں آتے جاتے دیکھتا رہا کہ وہ کت میں مسگوا کر مراجعت کر کے بیان کی تیاری کر رہے تھے، حالانکہ عظمت صحابہؓ کے جلسہ میں تقریر کرنا کیا مشکل کام ہے؟ وہ بھی ایک ایسے آدمی کے لئے جو گھنٹوں تقریر کر سکتا ہو، مسگروہ برابر مراجع کے مطالعے میں لگے رہے، کوئی ملنے آیا تو ملاقات کی پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے، چونکہ آدمی کے اندر جتنی جستجو ہوتی ہے جتنا مطالعہ اور مراجعت ہوتی ہے اتنا ہی اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی اثناء میں حضرت قاری عثمان صاحب مدظلہ بھی تشریف لے آئے، میں نے طلباء کو کچھ نصیحت کرنے کی درخواست کی تو آپ نے ایک

حدیث پڑھی اور تفصیل سے اس کی وضاحت کی، میں بھی اس مجلس میں بیٹھا تھا، الحمد للہ بہت سی ایسی باتیں سامنے آئیں جو میں نے کبھی نہیں سنی تھیں، جب حضرت قاری صاحب کمرہ میں گئے تو مولانا سلمان صاحب نے ان سے دو باتوں کی تحقیق کر لی، مولانا نے قاری صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ جو بات کہی کہ یہ عبارت راوی کی شرح ہے ہم تو اس کو اب تک متن سمجھتے تھے، قاری صاحب نے کہا کہ ہاں وہ شرح ہی ہے، اس کے بعد مشکوٰۃ منگوا کر متعلقہ باب اور حدیث نکلوائی اور پڑھ کر بتلایا تو مولانا سلمان صاحب نے فرمایا کہ اب ہماری غلط فہمی دور ہو گئی۔ علماء اور اہل اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ عالم عالم سے فائدہ اٹھالیتا ہے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی فوراً تحقیق اور اطمینان کر لیتے ہیں، اس کو علمی مشغولیت کہتے ہیں، یہ ہم کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ ہم علم کی خدمت کر رہے ہیں، علم ایک پیشہ تھوڑا ہی ہے کہ آئے پڑھائے اور چلے گئے، علم تو ایک پیاس ہے ایک حرص ہے، جو بھانے سے بجھتی نہیں بڑھتی چلی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ نے ایک دفعہ علماء اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”دیکھو آپ لوگوں کا علم تازہ ہے اور میرے بال سفید ہو گئے ہیں، یعنی آپ ابھی فارغ ہوئے ہیں سب علم ذہن میں تازہ ہوگا، لیکن تجربہ جو ہم کو حاصل ہوا ہے وہ آپ کو نہیں ہے، اگر آپ ہم سے مستغنی ہو گئے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ اس لئے آپ اساتذہ کرام سے بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے اساتذہ اور بڑے علماء سے مستغنی نہ ہوں۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ، آپ نابین رسول ہیں، ایک نائب رسول کو اپنی ذمہ داری سے لرزاں و سوزاں رہنا چاہیے اور اس کا علم تازہ ہونا چاہئے، اس کو آرام پسند نہیں ہونا چاہئے۔ اس کیلئے آپ مسلسل مطالعہ و جستجو کیا کریں، جب تک کسی بات پر خود کو اطمینان نہ ہو وہ بات دوسروں کے سامنے نہ لائیں۔ اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ علی وجہ البصیرت دعوت دیتی ہے، قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ط

اور وَمَنْ اتَّبَعْنِي طو آپ ہی لوگ ہیں، آپ مسئلہ بتائیں تو علی وجہ البصیرت بتائیں، فتویٰ دیں تو علی وجہ البصیرت، بیان کریں تو علی وجہ البصیرت، سبق پڑھائیں تو علی وجہ البصیرت۔ کیونکہ آپ کی خصوصیت بصیرت ہے۔ کچھلی امتوں میں بصیرت نہ تھی نقل محض ان کا دین تھا وہ بڑوں سے جو سنتے اس پر عمل کر لیتے تھے، اس کی کوئی تحقیق نہیں کرتے کہ یہ روایت کہاں سے آئی، کیسے آئی، اس کا مفہوم و مدلول کیا ہے؟ لیکن اس امت کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا ہر کام علی وجہ البصیرت ہوتا ہے، جیسے حضرت قاری صاحب نے (مذکورہ واقعہ میں) صرف زبانی بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کتاب منگوائی اور دکھایا، مطمئن کرنا اس کو کہتے ہیں، انھیں اتنا اطمینان تھا کہ میں نے جو بات کہی اس کو ثابت کر سکتا ہوں۔

حضرت تھانویؒ نے حضرت کشمیریؒ کو لکھا کہ اس مسئلہ میں اپنی تحقیق سے تسلی نہیں ہو پارہی ہے، آپ اپنی تحقیق سے مطلع کریں، باوجود یہ کہ حضرت کشمیریؒ چھوٹے تھے، لیکن حضرت تھانویؒ نے بہت ملتسمانہ اور عاجزانہ خط لکھا کہ میری نظر بس آپ پر ہی لگی ہوئی ہے آپ اگر اس مسئلہ میں رائے دے دیں تو پھر مجھے کچھ طے کرنے میں مدد مل جائیگی۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ ہمارے اکابر دیوبند ضرورت پر درس میں سے اٹھ کر کسی دوسرے عالم سے پوچھ آتے تھے، اور بعض دفعہ تو کوئی شاگرد مل گیا اسی سے پوچھ لیا اور واپس آ کر طالب علم کے اشکال کا جواب دیدیا، اس قدر تواضع، عاجزی اور دیانت تھی کہ شاگرد سے معلوم کر لینے میں بھی عار نہ ہوا، آج ہمارے پاس اتنا غرور ہے کہ ہم اپنے بڑوں سے پوچھنے کو تیار نہیں ساتھیوں سے شاگردوں سے کیا پوچھیں گے۔ حال یہ ہے کہ جو میری سمجھ میں آ گیا وہی صحیح ہے، ظاہر ہے کہ ایسا آدمی ایک دن گمراہ ہوتا ہے کم از کم اس مسئلہ میں تو عمر بھر گمراہ ہی رہے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اپنی معلومات کی بناء پر بلا تحقیق ہی بڑوں پر تنقید کرنا شروع کر دیتے ہیں، تحقیق کے لئے تیار نہیں ہوتے حالاں کہ تحقیق میں طرفین کا فائدہ ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ علم اللہ ہی کے پاس سے آتا ہے، اللہ ہی کے پاس علم کے

خزانی ہیں۔ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا ۱۵ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۱۶ عَلَّمَ
الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۱۷ کتنی آیات موجود ہیں، یہ اس علم کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے
فیضان سے حاصل ہوا اور جو علم معلومات محض ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی
طرف سے جو علم کا فیضان ہوتا ہے وہ ہمارے لئے نافع ہے، اس میں نور ہدایت پوشیدہ ہوتا
ہے، جو علم ہم کتابیں رٹ رٹ کر پاتے ہیں وہ صرف علم کے الفاظ ہیں اس میں علم کے انوار
نہیں ہیں، اللہ سے لو لگا کر علم حاصل کرنا اور دل میں اپنی اور امت کی آخرت کا غم ہونا چاہیے،
اس لئے اقراء کے ساتھ باسم ربك بھی فرمایا گیا ہے۔

جو آپ کے سامنے طلبہ ہیں یہ بھی امت ہی ہیں، آپ لوگ (شعبہ عالمیت میں)
ساڑھے پانچ سو بچوں کو پڑھا رہے ہیں، معصوم اور بے علم بچوں نے اپنے سینے کی تختیاں
آپ کے حوالہ کردی ہیں، اپنی دماغ کی کاپیاں آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں کہ آپ
اس پر جو لکھنا چاہتے ہیں لکھ دیجئے، جو نقش کرنا چاہتے ہیں نقش کر دیجئے۔ مثلاً اول میں آنے
سے پہلے اس کو اول کی کتابوں کا علم نہیں تھا، دوم میں آنے سے پہلے اس کو دوم کی کتابوں کا علم
نہیں تھا، وہ لاعلم خالی الذہن آپ کے سامنے آرہا ہے اس اعتماد پر کہ ہمارے استاذ یہ کتاب
پڑھا رہے ہیں اس کتاب سے جو علم آنا چاہیے وہ ہمیں بھی حاصل ہو جائے گا، اور اس فن سے
ہمارا جہل دور ہو جائے گا۔ لیکن میرے دوستو! یہ اس وقت ہوگا جب آپ پہلے کتاب کو سمجھنے
کا، مطالعہ کا، تحقیق کا، تفصیل کا حق ادا کریں پھر پڑھائیں، تب ان کی امید اور ان کا اعتماد
پورا ہوگا، آج آپ سبق بغیر سمجھے پڑھا دیتے ہیں، سستی ہو رہی ہو تو سو جاتے ہیں، وقت پر
کلاس میں نہیں جاتے، وقت سے قبل اٹھ جاتے ہیں تو کیا یہ ان طلبہ کی امانت میں خیانت
نہیں ہے؟ یقیناً ہے اور اس کو اللہ دیکھ رہا ہے، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۳۱ يَعْلَمُ
خَائِنَةَ الْآعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۱۹ وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی اور دل میں چھپی
ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے چاہے کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، پس طالب علم کا دل دماغ آپ کے

پاس امانت ہے، اگر آپ مقدور بھر سعی کر کے اطمینان بخش علم نہیں دے رہے ہیں تو آپ امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم ازدیادِ علم کی جستجو کے ساتھ ساتھ اصلاحِ اخلاق اور تصفیۂ باطن کی بھی فکر کریں۔ عزیز ساتھیو! عمر گزرتی جا رہی ہے، موت کا کچھ پتہ نہیں کہ کب آجائے، ہم اپنی فکر کب کریں گے؟ کیا دین ایسی بے قیمت چیز ہے جس میں قناعت کر لی جائے، کیا تعلق مع اللہ ایسی حقیر شئی ہے جس میں کسی مقدار سے راضی ہو جایا حبائے؟۔ ہمارے نبی کو تو مقصودِ حیاتِ زندگی ہی میں حاصل ہو گیا تھا لَیْ غُفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَبُيَّتَهُ نِعْمَتُهُ عَلَيْكَ نازل کر کے اللہ نے انہیں صد فیصد مطمئن کر دیا تھا، اس کے باوجود آپ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا؟ اس کو جاننے کے لئے وہ واقعہ یاد کیجئے! جب ایک صبح کو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرہ پیلا ہو گیا تھا، پیروں پر درم تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے آج رات آپ سوئے نہیں، شاید رات بھر روتے رہے تو پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ آپ اتنا ایثار کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو اللہ کے وعدے پر اطمینان نہیں کہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ سب کچھ بخش دیا ہے بلکہ بڑے بڑے مرتبے آپ کے لئے خاص کر دیئے ہیں، آخر اس کے بعد آپ کو کس چیز کی پریشانی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا افلا اكون عبداً شکوراً، یعنی بے شک اس کے وعدوں پر یقین کامل ہے اس کے باوجود اب جو عبادت ہو رہی ہے اور جو رونا دھونا ہو رہا ہے، وہ اس بات کے شکرانے میں ہے کہ بلا استحقاق میرے مالک نے مجھے یہ نعمت عطا کر دی، سب کو اپنی کامیابی کا علم قیامت کے دن ہوگا اور مجھے اس کا یہیں اطمینان دلادیا گیا، ذرا غور کیجئے! نبی تو اپنے نیک انجام کے شکرانے میں عبادت کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ہمارے انجام کا تو کوئی اتہ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے، بڑے بڑے لوگ حیران و پریشان ہیں لیکن ہم کو کوئی پریشانی نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم میں

بہت کم ایسے ہیں جو پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہوں گے کہ وہ آخرت کی تیاری میں مصروف ہیں، ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہمارے ذمہ امامتیں نہ ہوں تو ہم میں سے بہت سے منسراضِ خمسہ کی بھی پابندی نہیں کر پاتے، بس مسجد کے صدر اور مصلیوں کے ڈر سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھا لیتے ہیں، کبھی ہم ایک مہینہ امامت سے چھٹی لیکر اپنے گھر پر ہی رہیں، اپنے کاموں میں مصروف رہیں، اور پھر نوٹ کریں کہ ہم لوگ کتنی نمازیں اس اہتمام سے پڑھ رہے ہیں جتنی امامت کی ذمہ داری کی وجہ سے پڑھتے تھے، تو پھر خود ہی آپ کا ضمیر فیصلہ کریگا کہ یہ نماز کا اہتمام نہیں ہے یہ نوکری کا اہتمام ہے، نماز کا اہتمام تو آپ کے مصلیوں اور مقتدیوں کو ہے کیونکہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے پھر بھی وہ وقت پر آ رہے ہیں، سنتوں کا اہتمام کر رہے ہیں، خشوع خضوع سے نماز پڑھ رہے ہیں، ہمیں سنن موکدہ کا بھی اہتمام نہیں رہا۔ پہلے لوگ اپنا تجزیہ خود کر لیا کرتے تھے، خاص طور پر نماز کے سلسلہ میں کیونکہ نماز افضل العبادات ہے، حضرت عمرؓ کے بقول جس کی نماز صحیح نہیں اسکے دین کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لئے ہم کو نماز کی کسوٹی پر اپنے آپ کو دیکھنا چاہئے، جہلاء کتنا اہتمام کرتے ہیں اور ہم علماء ہو کر کتنا کرتے ہیں؟۔

ایک بات یہ بھی کہنی ہے کہ ہم اپنی شخصی زندگی کے ساتھ ازدواجی اور معاشرتی زندگی کی طرف بھی دھیان دیں کہ وہ بھی دیندارانہ ہونی چاہئے، جب ہم مدرسہ فیض العلوم میں پڑھاتے تھے محی السنہ حضرت ہر دوئیؒ سال میں ایک مرتبہ ضرور تشریف لاتے تھے اور اساتذہ کرام کے ساتھ بھی بیٹھک ہوتی تھی، ایک بات بار بار فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو آپ لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھو کہ اگر ان کی سہلیاں جو غیر علماء و صلحاء کے ہاں ہوں وہ سنیں تو ان کے دل میں یہ حسرت پیدا ہو کہ کاش ہم بھی کسی مولوی کی بیوی ہوتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے طرزِ عمل کو جان کر خیر منائیں کہ اچھا ہوا ہم کسی مولوی کے ہاتھ نہ لگے۔ بعضوں کا معاملہ اہل وعیال کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ

کھلاتے پلاتے سب کچھ ہیں، لیکن ان کی زبان میں تلخی اور کڑواہٹ ہوتی ہے، جب بولتے ہیں تو کوئی ایسی بات بول دیتے ہیں کہ اس کا زخم ہمیشہ رہ جاتا ہے۔ زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے، بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جنتیوں کو بھی جنت کے دروازہ پر روک کر رضوانِ جنت پہلے دل سے کینا کپٹ کے داغ دھبے نکال دیں گے کیونکہ یہ زخم اس وقت تک رہیں گے، لیکن جنت میں جانے سے پہلے وہ زخم مندمل کر دیئے جائیں گے تاکہ جنت میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تو زبان کا اتنا گہرا زخم ہوتا ہے، آپ نے بیوی کے دل پر زخم لگا تو دیا اب اس کے بعد آپ کچھ بھی کھلائیں پہنائیں کچھ بھی بھلائی کریں، یہ زخم بھولے گی نہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ سوچنا چاہیے کہ اگر بیوی آپ کے بھائی کو یا باپ کو کچھ کھدے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ پھر اس کا بھی تو دل ہے کوئی پتھر نہیں، وہ تو عورت ہے اگر جہالت سے ایسی حرکت کرے تو اس کا تحمل کیا جاسکتا ہے لیکن آپ عالم ہو کر، دیندار ہو کر، واعظ ہو کر ایسا کریں تو آپ کو کیوں کر زیب دے گا۔

بعض کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ زبان سے تو محبت اور ہمدردی کی باتیں کرتے ہیں لیکن عملی طور پر اس کے تقاضے حیات کو پورا کرنے میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی چادر کے بقدر پاؤں پھیلا نا چاہیے، آپ کے پاس بے شک اتنی آمدنی نہیں ہے کہ اہل دنیا کی طرح عیش کریں، یہ تو ٹھیک ہے، عیش و عشرت کی بات نہیں ہے بات ضرور یا ستِ زندگی فراہم کرنے کی ہے۔ ہر عورت کی اپنی نفسیات ہوتی ہیں، اس کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں، ان کو اپنی حیثیت کے مطابق پورا کیجئے، یہ ضروری نہیں ہے کہ سونے ہی سے کریں، سونا نہیں ہے تو چاندی سے کیجئے، وہ نہیں تو اس سے کم سے کیجئے۔

ایک واقعہ یاد آیا، اللہ کے نبی ﷺ جب سفر میں تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملتے تھے اور واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں نماز پڑھ کر انہی کے گھر جاتے تھے، ایک مرتبہ غالباً تبوک سے واپس تشریف لائے، یہ بڑا المبا اور

کٹھن سفر تھا تو حسب معمول آپ مسجد گئے، نماز پڑھی پھر بیٹی کے گھر تک آئے لیکن سواری سے اترے بغیر ہی اپنے گھر چلے گئے، بچے نانا کے استقبال کے لئے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے مگر کسی سے نہیں ملے اور گھر چلے گئے۔ اب ظاہر ہے یہ معمول کے خلاف معاملہ حضرت فاطمہؓ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا، تڑپ گئیں، سوچنے لگیں، ابا جان گھر کیوں نہیں آئے مجھ سے کیا تکلیف ہوگئی پھر خود ہی سمجھ گئیں کہ بچوں کے ہاتھ میں جو کڑے ہیں اس کو دیکھ کر ناراض ہو گئے ہوں گے، کیونکہ ان کو معلوم تھا ابا کس چیز سے خوش ہوتے ہیں اور کس سے ناراض! حضرت فاطمہؓ نے دونوں بیٹیوں کے ہاتھوں سے کڑے نکالے اور ان کو توڑ دیا، یا اس کی ہیئت و شکل بدل کر ان بچوں کے ہی ہاتھ میں دے دیا اور کہا: حسبِ اویہ نانا جان کو دید کہ بیت المال میں داخل کر دیں، بچے چھوٹے تھے، دونوں نوا سے ان ٹوٹے ہوئے کڑوں کو لے کر نانا کے پاس آئے ان بچوں کا بھی دل دکھا ہوگا، بچوں کے پاس سے ان کی پسندیدہ چیز چھین لی جائے تو ان کا دل بہت دکھتا ہے، حضور ﷺ نے وہ کڑے لے لئے اور حضرت بلالؓ کے حوالہ کر کے فرمایا: بلال! اس کو لے جا کر بازار میں بیچ دو اور اس سے جو رقم ملے، اس سے ہاتھی دانت کا یا سیپی سے بنا ہوا ہار خرید کر لاؤ، حضرت بلالؓ ایسا کوئی ہار خرید کر لے آئے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ فاطمہؓ کو دید و اور اس سے کہو کہ دنیا میں اسی پر قناعت کر لے، آخرت میں اللہ پاک بہت دیں گے، دیکھا آپ نے؟ نبی عورت کی نفسیات کی کیسی رعایت فرما رہے ہیں۔ ہم مولویوں کو اس کی کچھ بھی رعایت نہیں، حسبِ حیثیت ان کے نفسیاتی تقاضوں کی تکمیل کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

بعض لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ خود تو ٹھٹ سے رہتے ہیں اور بیویوں کو صحابہؓ کی عورتوں کی طرح سادگی سے رہنے کو کہتے ہیں، کیوں صاحب! آپ صحابہؓ جیسے مرد کیوں نہیں بنتے؟ بیوی ہی کو صحابہؓ کی عورتیں کیوں بناتے ہو۔ میرے عزیزو! اپنے گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرو ان کو خوش رکھنے ان کے جذبات کی رعایت کرنے کی

عادت ڈالو، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت دھیان میں رکھو کہ ہر کسی کو موافق مزاج عورت نہیں ملتی بلکہ شاید ہی کسی کو موافق مزاج ملی ہو، جب ایسا ہے تو اس کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اللہ تعالیٰ کے لئے گوارا کر لینا اور صبر سے کام لینا چاہیے کہ وہ بھی کسی کی بیٹی کسی کی بہن ہے، آپ کی بیٹی، بہن کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کرے تو کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر آپ کی بیوی بھی تو کسی کی بہن یا بیٹی ہے، اس پر ظلم و زیادتی کیسے ہو سکتی ہے؟ چند دن کی کلفت ہے پھر مزے ہی مزے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آدمی کی بیوی تمام حورانِ جنت کی سردار ہوگی اور حسن و جمال میں بھی حوریں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی، اگرچہ دنیا میں کتنی ہی کالی کلوٹی کیوں نہ ہو لیکن آخرت میں اس کے حسن و جمال کا مقابلہ حور بھی نہیں کر سکتی، اللہ پاک اس کو ایسا بنا دیں گے، اس لئے اگر بیوی حسبِ منشاء نہیں ہے تب بھی چند دن اللہ کی تقدیر سے راضی رہ کر اسی بیوی سے کام چلا لو۔ تسلی کی بہت باتیں ہیں، ایک بزرگ عرب کے ایک گاؤں سے گزرے، وہاں ایک کالا کلوٹا جھنشی آدمی بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ آؤ کچھ کھجور پانی لے لو، دیہاتوں میں لوگ آنے والے مہمان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے، اتنے میں ایک نہایت خوبصورت عورت پانی لے کر آئی تو ان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس شخص کی بیٹی ہے یا کون ہے؟ کیونکہ دونوں میں کوئی جوڑ نہیں معلوم ہوتا تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ انہی صاحب کی بیوی ہے۔ اس عورت سے انہوں نے پوچھا کہ اس جوڑ کے ساتھ آپ کیسے راضی اور خوش ہیں؟ اس نے کہا: ہم دونوں بہت مطمئن ہیں اور اللہ کے فضل سے ہم لوگ جنتی بھی ہیں، اللہ رب العزت نے خلافِ توقع ان صاحب سے میرا رشتہ جوڑا، یہ جوڑا اگرچہ مجھے اپنے معیار کا سمجھ میں نہیں آتا لیکن میں اللہ کی تقدیر سے راضی ہوں صبر کرتی ہوں، والصبر ثوابہ الجنة اور میرے شوہر کو چونکہ توقع نہیں تھی کہ میری جیسی حسین بیوی مل جائے گی، لیکن اللہ نے ان کو اپنے کرم سے ایسی بیوی دیدی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تیرا شکر ہے، تیرا کرم ہے، ظاہر ہے شکر کا ثواب بھی جنت ہے، پس شکر کے

عوض ان کو جنت مل رہی ہے اور صبر کے عوض مجھ کو جنت مل رہی ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی والدہ خیر النساء صاحبہؒ نے خود لکھا ہے، ہمارے گھر میں یہ بات چل رہی تھی کہ ہمارے ایک عزیز کے بیٹے سے میرا رشتہ ہو جائے، ان کی غربت کا یہ حال تھا ہم ہی لوگ ان کا خیال کر لیتے تھے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں، میرے والدین متفکر ہو رہے تھے کہ ہم کھاتی پستی بچی کو ایسے گھرانے میں کیسے بیاہ دیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں جب رات کو سو گئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خاص منظر تھا اس میں سے آواز آرہی تھی فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ صبح میں نے والدین سے کہہ دیا کہ اللہ نے وہیں پر میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی ہے مجھے وہیں پر بیاہ دیجئے، چنانچہ وہیں شادی کر دی گئی، فرماتی ہیں کہ اللہ پاک نے مجھے یہ دو بیٹے عطا فرمائے اور انہی میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ نے چھپا رکھی تھی۔ ایک مولانا ڈاکٹر عبدالعلیؒ اور ایک مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ان سب باتوں سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر گھر والی موافق مزاج نہ ہو اور دل ٹوٹتا ہو تب بھی ایک تو کسی کی بیٹی اور لاڈلی ہونے کا خیال کر کے اس پر کوئی زیادتی کرنے سے بچیں، دوسرے اللہ تعالیٰ سے اس صبر و تحمل پر اجر و ثواب کی امید کر کے دل مضبوط رکھیں، چار دن نباہ لیں پھر ہمیشہ کی زندگی میں یہ سب کچھ نہ ہوگا، مزے ہی مزے ہوں گے۔

اسی کے ساتھ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں دین کی خدمت میں لگایا، اہل حق میں سے بنایا، ہمیں علم دین سے جوڑ کر رکھا، اس کے لئے ہماری روٹی بھی اللہ نے اس سے جوڑ دی۔ شکر کی تینوں قسموں کو زندہ رکھیں، شکرِ عملی، شکرِ قلبی، شکرِ لسانی۔ گھر کے ماحول کو لڑائی جھگڑے کا ماحول نہ بنائیں صبر و تحمل کا ماحول بنائیں۔ گھر میں کتاب کی تعلیم ہو اور صحابہؓ و صحابیاتؓ کے حالات سنائے جائیں، اگر ان کے حالات ہمارے سامنے آئیں گے تو گھر میں خود بخود تہذیب آئے گی۔ اپنی بچیوں اور چھوٹے بچوں کے لباس کا بھی خاص

میں سفر کرتا رہتا ہوں اکثر جگہ لوگ پوچھتے ہیں مولانا! ہمارے گھر کی عورتیں پوچھتی ہیں کہ آپ لوگ تو مرد ہیں کہیں پر بھی جا کر دین سیکھ لیتے ہیں، ہم عورتیں کس کے پاس جائیں؟ کس کی صحبت میں رہیں؟ ہم بھی کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، اس سوال سے اتنی شرمندگی اور ندامت ہوتی ہے کہ کیسے ہم کہہ دیں اور کس منہ سے کہہ دیں کہ ہمارے گھر بھیج دو، چپار دن رہیں گی تو اللہ والی بن کے جائیں گی۔ ہم لوگ اپنے گھروں کا ایسا ماحول بنانے کی کوشش کریں کہ عوام الناس اگر اپنی عورتوں کو دیندار بنانا چاہیں تو ہمارے گھروں میں بھیجا کریں کہ جاؤ، دن بھر رہو، دیکھو کہ مولوی صاحب کے گھر میں کیسا دین کا ماحول ہے، امام صاحب کے گھر سے دین سیکھ کر آؤ۔ ایسا ماحول بنانے کے لئے ہمیں کچھ قربانیاں دینی پڑیں گی، کچھ ایثار کرنا پڑے گا، کچھ صبر اور حلم سے کام لینا پڑے گا، اپنے گھر میں ہر چیز ایسی ہو کہ لوگ اس کو دیکھ کر اگر اختیار کر لیں تو نقصان نہ ہو، فائدہ ہو۔

دیکھئے! ہماری کوتاہیوں پر بعض لوگ تو تنقید کرتے ہیں کہ علماء کے گھر میں ایسا ہو رہا ہے؟ اور بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ مولانا کے گھر میں یہ کام ہو رہا ہے تو غلط تھوڑا ہی ہوگا، ان کے بچے ایسا کر رہے ہیں اگر غلط ہوتا تو ایسا کرتے؟ تو ایک تو ایسا عقیدت مند ہے کہ اسی کو دین سمجھ کر بلا تحقیق ہماری نقل کر لیتا ہے اور ایک ایسا حاسد ہے جو بلا تحقیق ہم کو بدنام کر دیتا ہے، کم لوگ ایسے ہیں جو پوچھ کر عمل کرتے ہیں، اب ان عقیدت مندوں کو بچانا بھی ہماری ذمہ داری ہے، خاص کر لباس نسوانی کے معاملے میں بالکل لاپرواہی نہ کریں آج کل بازار میں کپڑے ایسے آرہے ہیں جو کسی طرح اسلامی تقاضوں پر پورے نہیں اُترتے، اسلئے گھر میں اپنی عورتوں کو سمجھایا جائے کہ **يٰۤاَيُّهَا النِّسَاءُ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ** اے نبی کی عورتو! تم عام مسلمانوں کی عورتوں کی طرح نہیں ہو، یہ خصوصیت ہے کہ تم ہمارے

دین کے خادموں کی عورتیں ہو۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب حجاز کے امیر تھے، ان سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ کی آخری زوجہ محترمہ دنیا سے رحلت کر گئیں تو اسکے بعد **يُنْسَاء النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ** کہہ کر قرآن کس کو مخاطب کر رہا ہے؟ کس مصلحت سے اس کو قیامت تک باقی رکھا گیا؟ مولانا نے فرمایا کہ نبی تو نہیں ہیں، نابینا انبیاء موجود ہیں یہ آیت انھیں کی عورتوں کو مخاطب کر رہی ہے۔ مشائخ کی عورتوں کو علماء کی عورتوں کو داعیوں کی عورتوں کو مخاطب کر رہی ہے۔ **يُنْسَاء النَّبِيِّ** اے نبی! (کی طرح جو لوگ دین کے داعی اور معلم ہیں ان) کی عورتو! **لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ** تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اللہ تمہارے مردوں سے دین کی خدمت لے رہا ہے، چونکہ وہ داعی ہیں، اسلئے تم کو ان کے مقام کے مطابق رہنا پڑے گا۔ تو آج اپنی عورتوں کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اللہ نے تمہارے مردوں کو علم دین کی خدمت میں لگایا ہے۔ لہذا تم اس مقام کی نزاکت کا لحاظ رکھو، بہت سے کام جائز ہیں تب بھی تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ آج عورتوں کو منکر ہم ان سے اپنے کام تو نکال لیتے ہیں لیکن دین کے کام نہیں نکال رہے ہیں۔

حضرت شاہ حکیم اختر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ بیوی اگر ٹی وی یا کسی ناجائز چیز کا مطالبہ کرے تو ہرگز مت دلاؤ یہ کہہ دو کہ اللہ کا غضب نازل ہوگا، بڑی قدرت والے اللہ کو ناراض کر کے خود بھی چین سے نہیں رہو گی، مجھے بھی چین سے رہنے نہ دو گی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ اگر بچیں ہزار میں ٹی وی آتا ہے تو ٹی وی تو مت لاؤ لیکن اس کو بچیں ہزار روپیے دے کر اس سے کہہ دو کہ قالین لالو، کپڑے، زیور وغیرہ خرید لو، میں تمہارے ساتھ کوئی بخل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اللہ کی ناراضگی سے بچانے کے لئے کہہ رہا ہوں یہ پیسے رکھ لو، کوئی جائز چیز لے لو۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تم پیسے بھی نہیں دو گے، متبادل بھی نہیں دو گے اور اس کے مطالبہ کو بھی پورا نہیں کرو گے تو اس کے اندر دھڑ دھڑی آسکی، وہ کہے گی کہ اصل میں آپ

پیسے بچانے کے لئے میری خواہش کو پورا نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے اس کو بہتادو، میں سخی ہوں بخیل نہیں ہوں، میں تم پر خرچ کرونگا مگر جائز امور میں کروں گا، ناجائز امور میں نہیں کرونگا۔ الخیر! یہ باتیں میں نے اسلئے بتادیں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم لوگوں کے اپنے گھروں میں دین سے بڑی غفلت ہو رہی ہے۔ دوسرے لوگ ہماری باتیں سن کر دیندار بن رہے ہیں، رسوم و رواج ختم ہو رہے ہیں، شادی بیاہ کے خرچ میں احتیاط کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں بس ایک جواب ہے کہ صاحب! ہماری عورت مانتی نہیں ہے، یہ تو کوئی عذر نہیں ہے بھئی! ہم لوگوں کو ان امور کی اصلاح کرنی چاہئے، اور یاد رکھئے! گھر والوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خود اپنی اصلاح نہ ہو جائے، کیوں کہ اگر خود اپنے اخلاق خراب ہوں بیوی سے مطالبہ اچھے اخلاق کا کریں، اپنی زبان کڑوی ہو بیوی سے مطالبہ اچھی بولی بولنے کا کریں اور ہم ہر روز اپنے رشتہ داروں سے، نامحرموں سے ملتے رہیں اور بیوی سے مطالبہ پردہ کا کریں تو وہ ہرگز نہیں مانے گی۔ وہ تو برابری کا دعویٰ کرتی ہے، وہ کہے گی کہ آپ کے لئے کوئی قانون نہیں سب قانون میرے لئے ہیں؟ اگر آپ متقی ہیں تو میرا دل آپ سے زیادہ پاک ہے۔ اس لئے اپنی اصلاح سے کام شروع ہو، قوا انفسکم و اہلیکم ناراً فرمایا گیا ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنا کوئی رہنما بنا لے، کسی بڑے رہنما کا انتظار نہ کرے اسکے ملنے ملنے تک عمر گزر جائے گی، جب اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا تب کوئی عالمی شیخ ملے تو اس وقت تک اپنے بننے کا وقت بھی ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے سر دست جو مہیا ہے اسی پر اتکا کرو، اسی کو اپنا شیخ بنا لو، رہنما بنا لو، ایسا رہنما جس کے ساتھ آپ کا تعلق صداقت و دیانت کا ہو، یہ نہیں کہ اچھے کاموں کی اطلاع کرتے رہیں اور گڑ بڑ کی کوئی اطلاع نہیں۔ یہ نفاق ہے اس لئے ہر چیز کی اطلاع کرو وہ دعا کریگا، کوئی تدبیر بنائے گا۔ تمام مشائخ جو مخلص ہیں راتوں کو اٹھ کر اپنے مریدوں کی اصلاح کے لئے روتے ہیں، گڑ گڑاتے ہیں تب ہی

ہمارے کام بنتے ہیں، ہمیں اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر رکھنا چاہئے اور شیخ سے تعلق صحیح رکھنا چاہئے اس زمانے میں اولاً تو ہماری اس طرف توجہ نہیں ہے اگر کسی کو ہے بھی تو رسمی قسم کی ہے۔ کیوں کہ محض کسی کو شیخ بنا رکھنا کافی نہیں، مجالس میں پابندی سے جاؤ، بات غور سے سنو اور نوٹ کرنے کا اہتمام کرو، تدبیر سے کام نہ بنے تو شیخ سے مشورہ کرو کہ کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک یہ صفت پیدا نہیں ہوئی، ابھی تک اصلاح نہیں ہوئی۔ یہ سلسلہ اطلاع حالات اور اتباع ہدایات کا جاری رہے گا تو ایک دن منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے یعنی تقوی اللہ اور تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے گی۔

بس اب دعا کر لیجئے کہ اللہ پاک ہم سب کو اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اداریہ اپریل ۱۳ء)

ادھر بھی تو دیکھئے!

ملک میں لڑکیوں کی عصمت دری اور بے آبروئی کا مسئلہ اخبارات کی سرخیوں کا موضوع بنا ہوا ہے کہ نوجوان صنفِ نازک کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اب تو معصوم بچیاں بھی ہوس کے پجاریوں کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس مسئلے کو لے کر شدید اور طویل احتجاج کا سلسلہ بھی جاری ہے، عوامی جلسے جلوس سے لے کر وفاقی ایوانوں تک ہر طرف اسی کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ ہے بھی مسئلہ ایسا ہی اہم اور نازک! کون عقل مند عورت کی اس ذلت کو گوارا کر سکتا ہے اور کون باضمیر حیا کی اس دیوی کو لٹتا جلتا اور اُجڑتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ مگر میں آج آپ کو ایک دوسرا منظر دکھانا چاہتا ہوں کہ جس عورت کی عزت و عصمت کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے خود وہ کیا کر رہی ہے؟ گذشتہ ہفتے مقامی اخبار ”منصف“ کے صفحہ جرائم و حادثات پر پولیس کا ایک پریس نوٹ ایک برقعہ پوش لڑکی اور دو خوبرو نوجوانوں کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا، نیوز کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

”ذی شان نامی ایک نوجوان کے ساتھ ثانیہ نامی ایک لڑکی کام کرتی تھی، دونوں میں تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ بات معاشقے کی حد تک پہنچ گئی، ثانیہ کے والد بیرون ملک کام کرتے ہیں اور وہ خود ایونٹ میئنجر کی حیثیت سے تقریبات میں کلچرل پروگراموں کا کام کرتی ہے، ایک اور لڑکی حسنیٰ — جو شادی شدہ ہے اور اس کا شوہر بھی بیرون ملک کام کرتا ہے — کا تعلق بھی ذی شان سے ہو گیا اور حد سے بڑھ گیا، حسنیٰ نے جب دیکھا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے کوئی اور لڑکی بھی اس کو چاہتی ہے تو اسے اپنے عاشق کے ساتھ اس کی

شرکت گوارا نہ ہوئی اس لئے اسے راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی، ایک دن حُسنیٰ ایک منصوبے کے تحت ملک اور دیگر چند دوستوں کو ایک کار میں لے کر ثانیہ کے گھر پہونچی اور اسے کسی پروگرام میں ساتھ چلنے کے لئے کہا وہ تیار ہو کر ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی، یہ لوگ سیدھے ایک ہوٹل پہونچے جہاں اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اس کے بعد پٹرول پمپ پر رک کر گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، ساتھ ہی ایک بوتل میں بھی پٹرول لے لیا، اس کے بعد شہر سے باہر نکل کر کسی تاریک مقام پر انہوں نے گاڑی روکی، حُسنیٰ کے دونوں دوستوں نے ثانیہ کے ہاتھ پیر پکڑ لئے اور حُسنیٰ نے ثانیہ کے منہ میں ڈوپٹہ ٹھونس کر اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ اس کا دم نکل نہ گیا، پھر تینوں نے مل کر اس کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا، پھر حُسنیٰ نے اس پر ساتھ لایا ہوا پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تاکہ لاش ناقابل شناخت ہو جائے، اس کاروائی کے بعد یہ لوگ اطمینان سے اپنے گھر لوٹ آئے، اس جگہ اتفاق سے پولیس کی گاڑی پہونچی آگ جلتی دیکھ کر پولیس والوں نے تفقد کیا، آگ بجھا کر ثانیہ کی لاش دو خانہ عثمانیہ میں منتقل کر دی،

کیا آپ کسی لڑکی — وہ بھی تین بچوں کی ممتا سے بھرے دل والی لڑکی — سے اس کی توقع کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! مگر یہ حقیقت ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اخبارات میں تو ایک آدھ واقعہ آجاتا ہے ورنہ یہ روز روز کے قصے ہیں، جن کو پڑھتے پڑھتے ان کی اہمیت ختم ہو گئی ہے، اب ہم ایسے واقعات پر ایک اچھٹی اور سرسری نظر ڈال کر اور ایک آدھ فقرہ کس کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اس لئے کہ برائی شروع میں برائی محسوس ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے اس کی شاعت دلوں میں گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اس واقعے کو بھی بس اس طرح دیکھ لیا اور پڑھ لیا گیا ہوگا۔

غور کرنا یہ ہے کہ یہ ایک حُسنیٰ اور ثانیہ کی بات نہیں ہے ہر گھر میں کوئی حُسنیٰ کوئی ثانیہ موجود ہے، یہ ایک ذی شان اور ملک کی بات نہیں ہے ہمارے ہر گھر میں ذی شان اور ملک

موجود ہے، سوال یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کے اخلاق اس حد تک نازل کیسے ہو گئے؟ اس کے اسباب کیا ہیں اور ان کے تدارک کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔ ہمارے نزدیک اس کے چند واضح اسباب ہیں جن کا کوئی صاحب خبر انکار نہیں کر سکتا مثلاً:

نوجوان بیویوں کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا جانا:

جب سے روزی روٹی کی دشواریاں دور کرنے کے لئے باپ بچوں کو چھوڑ کر یا شوہر جوان بیوی کو چھوڑ کر بیرون ملک جانے لگے ہیں تب سے ان بچوں اور بیویوں کا حال ناقابل بیان ہو گیا ہے، فطری بات ہے کہ شریف سے شریف عورت بھی ازدواجی رشتے کی حقیقت سے واقف ہو جانے کے بعد طویل مدت تک تقاضہ نفس کو برداشت نہیں کر سکتی، بالخصوص کھڑی جوانی میں اور اخس الخصوص آج کے ماحول میں۔ پھر جب بھوکے کو حلال کھانا نہ ملے اور پیاسے کو حلال مشروب نہ ملے تو سوائے اس کے کہ وہ حرام تک پہنچ کر اپنی بھوک پیاس مٹائے کیا راستہ باقی رہتا ہے؟ لازماً شریف عورت گھٹ گھٹ کر دق کی مریض ہو جاتی ہے اور جنہیں شرافت کا پاس و لحاظ نہیں وہ خاندانی یا بیرونی مردوں سے دل بہلائیاں کرنے لگتی ہیں جس کا انجام بدکاری تک پہنچ جاتا ہے۔

چند دن قبل سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان کچھ مشورہ کرنے کیلئے وقت لے کر میرے پاس آیا، مشورہ یہ تھا کہ ”ابا چودہ پندرہ برس سے باہر رہتے ہیں، دو تین سال میں ایک دفعہ آتے ہیں، والدہ شروع ہی سے چچا کے ساتھ تعلقات رکھی ہوئی ہیں، جب تک میں چھوٹا تھا صرف کھٹک ہوتی تھی اب تو یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ ان لوگوں کے تعلقات ازدواجی ہو گئے ہیں، چچا جب چاہتے ہیں آکر شب باشی کر کے چلے جاتے ہیں، والدہ بھی راضی ہیں والد بھی اپنے بھائی کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتے، اب مجھے والدین سے چچا سے اور اپنے آپ سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ کھانا پینا بھی اچھا نہیں لگتا، بار بار خودکشی کر لینے کا داعیہ پیدا ہوتا رہتا ہے، ایک آدھ دفعہ کوشش بھی کیا مگر ناکام ہو گیا، ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ یہ ایک مثال ہے ان عورتوں کی بے راہ روی اور بدکرداری کی جن کے شوہر چارنگوں کی

کمائے کے لئے اپنے گھر سے بے خبر دوسرے ملکوں میں پڑے ہوئے ہیں! یہ خلیج میں پڑے ہوئے لوگ تو خیر پھر بھی کبھی کبھی گھر کا چکر لگا جاتے ہیں جو لوگ مغربی ملکوں میں غیرت انونی طور پر برسوں پڑے رہتے ہیں وہ ڈالر تو خوب کما رہے ہیں مگر انہی ڈالر کے بل بوتے پر وہاں شوہر غیر عورتوں میں مست ہے اور یہاں بیوی غیر مردوں میں مگن! حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے عورتوں کی بے حیائی و بدکرداری کو گوارا کر لینے والے کو ”دیوث“ کا خطاب دے کر اس پر لعنت فرمائی ہے۔ واقعی جس عورت کے سر پر شوہر کا سائبان یا باپ جیسا نگہبان نہ ہو، وہ شہوت کے بھوکے بھیڑیوں سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتی، شاید اسی لئے اسلام نے بے جوڑ رہنے والے مرد اور عورت کو ملفس و محتاج قرار دیا ہے۔

باپ کی نگرانی اور تربیت سے بچوں کا محروم ہونا:

اس کا سبب بھی اکثر بیرون ملک ملازمت ہے، اگرچہ باپ انہی بیوی بچوں کی راحت و آرام خوشحالی اور اعلیٰ تعلیم کو مقصود بنا کر پردیس کی کلفتیں اور صعوبتیں برداشت کرتا ہے مگر اس کا منفی اور مضر پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ یہاں بچے اسی مال کے غرہ میں آکر آوارہ گردی کر رہے ہیں، ضدی ہو رہے ہیں، یہ لوگ ماں کو خادمہ سے زیادہ نہیں سمجھتے، تعلیم سے قطعاً دلچسپی نہیں لیتے، موٹر سائیکلوں پر یاروں دوستوں کے گروہ میں مٹر گشت کرنے ہوٹلوں میں کھانے، سگریٹ نوشی، نشہ خوری، فلم بینی اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں ٹائم پاس کر رہے ہیں، انہیں تہذیب و اخلاق کا پتہ نہیں، بڑوں چھوٹوں کی تمیز نہیں، دین و ایمان کا احساس نہیں، بس انہیں پیسہ چاہیے اور دوست احباب کا مجمع! یہ لڑکوں کا حال ہے اور لڑکیاں بھی ان امور میں ان سے کچھ کم نہیں ہیں، کالجس میں تعلیم حاصل کرنے کے نام پر جو حرکات کر رہی ہیں اور جن ناقابل تصور اعمال کی مرتکب ہو رہی ہیں ان کی تفصیل کیلئے قلم کو یارائے تحریر نہیں ہے، ان لڑکیوں کو اس قدر بے محابانہ و بے باکانہ حالت میں دیکھ کر یہ ماننا مشکل ہے کہ ان کا کسی مسلم گھرانے سے تعلق ہے۔ کالج میں زیر تعلیم ایک نوجوان کا کہنا ہے کہ ”ہم

اگر لڑکیوں سے کچھ احتیاط بھی کرنا چاہیں تو وہ خود ہمیں چھیڑتی ہیں، اور بے اعتنائی کریں تو موضوع مذاق بنا کر ہمارا جینا مشکل کر دیتی ہیں، کسی نوجوان کا کہنا ہے کہ ”کالجس میں مسلم لڑکیوں کی جو صورتحال ہم دیکھ رہے ہیں اس کی روشنی میں اپنی بیوی بنانے کے لئے کسی لڑکی پر یہ اعتماد کرنا مشکل ہے کہ وہ کسی سے دوستی کی ہوئی نہیں“

دو ہی چار دن قبل کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتلایا ”ان کے بچے نے باہر سے آکر جب اپنی شادی کی تو سنت کا پورا اہتمام کیا، لڑکی والوں پر ایک روپیہ کا بوجھ نہیں ڈالا، سب کچھ ساز و سامان اپنے خرچ سے تیار کیا، مہر نقد ادا کیا، کیوں کہ وہ اچھی زندگی اور اچھی اولاد کا متمنی تھا مگر اس وقت اس کا دل ٹوٹ کے رہ گیا جب شادی ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بیوی کو پندرہ دن کا حمل ہے، اس نے اقرار کیا کہ کلاس فیلو سے اس کے تعلقات تھے، اب ان صاحب کا بچہ کسی قیمت پر اس لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے تیار نہیں ہے، ادھر لڑکی کے والدین بھی حیرت زدہ اور پریشان ہیں کہ ہماری بچی نے ایسی حرکت کیسے کی اور کب کی؟“

تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کی بے حسی اور غیرت ملی سے محرومی:

آج ہمارے دانشوروں کو ملت سے ہمدردی اور ان کی ترقی و خوشحالی کے دعوے تو بہت ہیں اور کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں مگر افسوس کہ وہ انہی تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ ہیں جہاں تعلیم کے عمدہ ہونے کے لئے اختلاط جنسی، بے حجابی و بے باکی اور دین بیزاری کو لازم سمجھا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پرائمری سے لے کر ڈگری تک تمام مراحل تعلیم میں دین و ایمان اور اخلاق و تہذیب کا کوئی گز نہیں ہے۔ بلکہ کالج کلچر میں تو ایمان و احلاق کا تذکرہ بھی انہیں اچھا نہیں لگتا، وہ ایسی باتوں کو دقیا نوسی اور گزرے ہوئے وقتوں کی باتیں سمجھتے ہیں، ایسے مشورے دینے والوں کو بیک بینی و دو گوش برطرف کر دینے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، اس لئے اب تدریس کا پیشہ تہذیب و تربیت کا ذریعہ ہونے کے بجائے دولت اندوزی کا

وسیلہ بن کر رہ گیا ہے، مینجمنٹ کا سطح نظر آمدنی اور عملے کا مبلغ طلب آمدنی! قوم کے بچے بد تہذیبی کی کس جہنم میں جاتے ہیں ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں، بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان تعلیم گاہوں میں اگر کوئی دین پسند اور باحیاط طالب علم پہنچ جاتا ہے تو وہ ساتھیوں ہی کا نہیں لکچرر ز اور مینجمنٹ کا بھی اس وقت تک معتبور رہتا ہے جب تک کہ کامن کلچر کا حصہ نہیں بن جاتا، اس سلسلے میں بعض باخبر دانشوروں ہی سے میں نے سنا ہے کہ غیر مسلم کالجس کا تہذیبی ماحول مسلم کالجس کے ماحول سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے، جبکہ جہاں تک تعلیم گاہوں کو بطور مشن اور تحریک کے استعمال کرنے کا معاملہ ہے تو اس وقت سوائے مسلمانوں کے تمام مذاہب والے اس میں سرگرم عمل ہیں، مسلمانوں کو ایسا کرنے میں شرم سی محسوس ہوتی ہے یا آمدنی متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادھر کچھ عرصے سے عصری تعلیم گاہوں کو اسلامیانے کا شعور بیدار ہو رہا اور احساس جاگ رہا ہے مگر اس کام میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جو یا تو متشدد غیر مقلد ہیں یا پھر اسلام کا ناقص تصور رکھنے والے مخلص ہیں۔

گھروں میں حجاب شرعی کا اہتمام نہ ہونا:

آج کل والدین عام طور سے دینی احکام اور شرعی مطالبات سے بالکل بے خبر ہیں، گھروں میں نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کا ذکر ہے نہ صحابہؓ و صحابیاتؓ اور اسلاف امت کے واقعات کا مذاکرہ! بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ، اس کے حبیب ﷺ اور اس کی کتاب کے کیا حقوق ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ عقیدہ آخرت کیا مطالبہ کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے مسلمان گھرانوں میں جواب تو کیا مل سکتے ہیں ان سوالات کیلئے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس لئے حلال و حرام کی تمیز پاکی ناپاکی کا فرق، ایمان داری و بے ایمانی کی اہمیت حتیٰ کہ توحید و شرک اور ایمان و کفر کے مفاہیم سے بھی نا بلد ہیں، نہ قرآن صحیح پڑھنا آتا ہے نہ ضروریات دین سے آشنائی

ہوتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ گھروں میں شرعی پردہ کا اہتمام بھی نہیں ہے، رسی پردہ تو ہے وہ بھی دیندار کہلائے جانے والے گھرانوں میں، یعنی باہر نکلتے وقت باحجاب ہوتی ہیں، باقی چچا زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد، ماموں زاد بھائی بہنوں کے درمیان اسی طرح سالی اور بہنوئی کے درمیان نیز بھابھ اور دیور کے درمیان، ممانی اور بھانجوں کے درمیان، خالو اور بھانجیوں کے درمیان شریعت نے پردہ کا جو حکم دیا ہے، دینداروں کے ہاں بھی اس کا اہتمام نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے گھروں کا ماحول بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ حجاب شرعی کے احکامات باقاعدہ قرآن کریم میں نازل ہوئے، احادیث صحیحہ میں موجود ہیں، سلف صالحین بلکہ خود ہمارے گھرانوں کے بڑوں بزرگوں میں اس کا نہایت اہتمام تھا، مگر آج یہ احکامات تہذیب جدید کی نذر ہو گئے مسلمانوں کی تہذیب کی جو صورت حال ہوتی جا رہی ہے وہ مغرب کی حیوانیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

ایک نوجوان کا کہنا ہے کہ انہیں تعلیمی سلسلہ میں دوسرے شہر جانا پڑا، انہوں نے وہاں مسجد کا حجرہ کرایہ پر لے لیا اور تعلیم شروع کر دی، چچا جو بیرون ملک رہتے ہیں انہیں پتہ چلا تو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ شہر میں میرا گھر رہتے ہوئے بھتیجا مسجد کے حجرہ میں کیوں رہ رہا ہے، میرے گھر پر کیوں نہیں رہتا، ایسی غیریت کیوں برت رہا ہے؟ چچا کی ناراضگی دور کرنے کے لئے اس کے والد نے چچا کے گھر منتقل کر دیا، اس کا بیان ہے کہ اب میرے گھر پر رہنے کے بھروسے پر چچا نے اپنے بچے کو ہاسٹل میں شریک کر دیا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گرما کی سخت رات تھی میں پیاس کی شدت کی وجہ سے نیند سے بیدار ہوا، پانی پینے کے لئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو چچی دالان میں سو رہی تھیں، میرے جذبات قابو سے باہر ہو گئے میں ان کی چار پائی پر لیٹ گیا، وہ بیدار ہوئیں تو گھونسنے اور لاتیں مار مار کر گھر سے باہر کر دیا، کہنے لگا: میں تو نمازوں کا پابند تھا اور نیک زندگی کا عادی تھا مگر چچا کی اس مہربانی نے مجھے ذلیل و رسوا کر دیا کہ اب اپنی موت کو ڈھونڈھتا اور مخلوق سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ پردے کے معاملے میں اچھے

خاصے لوگوں کو توجہ نہیں ہے بلکہ توجہ دلانے والا ان کو دشمن سا محسوس ہوتا ہے، آخر اللہ رسول کی خیر خواہیوں پر اعتماد نہ کر کے اپنی پاکبازیوں پر ناز کرنے والوں کا یہی حشر نہ ہو تو اور کیا ہو؟

موبائیل فون اور حزب اخلاق آلات کا شیوع:

ایک اہم اور بڑا سبب جدید مصنوعات کا تیزی سے پھیلنا بھی ہے، موبائیل، انٹرنیٹ کی مختلف سائٹس، اور دن بہ دن متعارف ہوتے جا رہے آلات لہو و لعب نے صرف تہذیب اسلامی ہی پر اثر نہیں ڈالا شرافت انسانی کا بھی حلیہ بگاڑ دیا ہے، جاسوسی ڈراموں اور ٹیو فلموں کے ذریعے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کار جحان دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے، اور جنسی بے راہ روی روز افزوں ہے، ان آلات کے ذریعے گھر بیٹھے دنیا بھر سے روابط کا قیام اور تبادلہ کھیاالات و جذبات عام عادت بن گئی ہے، صلحاء و شرفاء بھی دھیرے دھیرے ایسی خرافات و واہیات میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، نیز ان آلات کے بے محل استعمال سے آپسی تعلقات اور ازدواجی اعتماد و مجروح ہو کر ناخوشگواری و طلاق تک نوبتیں پہنچ رہی ہیں، صاحب اولاد عورتیں تک موبائیل فون اور چیپٹائنگ وغیرہ کے ذریعہ اجنبی مردوں کے ساتھ معاشرے میں مشغول ہیں جس کے بھیا نک نتائج آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔

یہ اور ان جیسے مزید اسباب ہیں جو ادنیٰ تا عل سے سمجھ میں آسکتے ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان ہر پہلو اور ہر ذریعے سے ان خوفناک اور ناپائیدار یقین مگر سماج میں تیزی سے بڑھتے ہوئے احوال کو بدلنے کے لئے غور و فکر کریں، سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ان اسباب کے تدارک کے لئے آگے آئیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، علماء اپنا فریضہ ادا کریں، سماجی خدمت گزار اپنی ذمہ داری نبھائیں، سیاسی قائدین اپنا حصہ ادا کریں، تعلیمی ادارے اپنا فرض ادا کریں، سب مل کر ملت اسلام کو اسلام پر جمے رہنے اور اسی پر مرنے میں مدد فراہم کریں، تب جا کر ہم کچھ اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوری ملت کی حفاظت فرمائے۔ آمین (اداریہ مئی ۱۳)

اختلاف سے کہاں مفر ہے؟

اتحاد کے داعیوں سے مودبانہ التماس

اختلاف انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے، زبانوں میں اختلاف، زمانوں میں اختلاف، شکل و شباہت میں اختلاف، قد و قامت میں اختلاف، رنگ و نسل میں اختلاف، ہر چیز میں اختلاف ہے، بلکہ یہ اختلاف حق تعالیٰ کی حکمت نے خود رکھا ہے اور اسے اپنی قدرت کی علامت بتایا ہے، ارشادِ باری ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَالْوَاوَانِكُمْ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ارض و سماء کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ اختلاف اگر وسعت و سہولت اور بندوں کی ضرورت و راحت کا سبب ہے تو وہ قدرتِ خداوندی اور رحمتِ الہی کا مظہر ہے۔ یہ اختلاف جہاں غیر اختیاری امور میں تکوینی طور پر پایا جاتا ہے وہیں اختیاری امور میں بھی تشریعی طور پر موجود ہوتا ہے، بلکہ غیر اختیاری اختلاف سے یہ اختیاری اختلاف کہیں زیادہ ہوتا ہے، پھر اختلافِ علوم دنیویہ و عقلیہ میں جس طرح مسلم ہے اسی طرح علوم دینیہ و عقلیہ میں بھی معتبر و مستند ہے، کیوں کہ کوئی نقل عقل سے مستغنی نہیں ہو سکتی اور کوئی عقل نقل سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، دونوں کا جوڑ ہے بلکہ نقل کی مشروعیت ہی عقل والوں کے لئے ہوئی ہے، مجاہدین اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

اگر کوئی شخص نقل صحیح کو کافی سمجھ لے، اس میں عقل کے استعمال کو ضروری نہ جانے تو اس کا صحیح ہونا خود ذرائع عقل پر موقوف ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جس کے انتہائی معتبر اور قدیم نوکر نے اطلاع دی کہ آپ کی بیوی بیوہ ہو گئی ہیں تو یہ شخص سر پکڑ کر بیٹھ

گیا اور غم سے نڈھال اور اشکبار ہو گیا، کسی نے توجہ دلائی کہ آپ کے ہوتے ہوئے آپ کی بیوی بیوہ کیوں کر ہو سکتی ہے تو موصوف فرمانے لگے وہ تو صحیح ہے مگر ہمارا یہ نوکر کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور کبھی ہم سے بے وفائی نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کا اس نامعقول خبر کو محض صحت نقل کی بنیاد پر اختیار کر کے مغموم و محزون ہونا عقل و شعور سے محرومی اور نقل کی مخاطبت سے نااہلی کی دلیل ہے۔ اسی طرح حقائق کی تلاش — بالخصوص مغیبات و ایمانیات — میں عقل محض پر بھروسہ کافی نہیں نقل صحیح پر اعتماد بھی ضروری ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ ایک بچے کو اپنے والد کا والد ہونا اگر کسی عقلی دلیل سے معلوم کرنا ہے تو اس کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، جو صورت بھی اختیار کی جائے گی وہ مشکوک و مشتبہ ہی ہوگی سوائے اس کے کہ وہ نقل صحیح پر اعتماد کر لے یعنی ماں کے یادائی کے یا اہل محلہ و اعزہ کے یہ کہنے کو کہ تم فلاں صاحب ہی کی اولاد ہو صحیح مان کر تسلیم کر لے۔

مختصر یہ کہ عقل اور نقل دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، ادھر یہ بھی طے ہے کہ عقل اور عقل میں کافی تفاوت ہوتا ہے، یکسانیت نہیں ہوتی، چنانچہ احکام نقلیہ کے سمجھنے میں خود اسلام کے عہد اول یعنی عہد صحابہؓ میں بھی اختلاف ہوا، بلکہ نبی کی موجودگی میں بھی ہوا، یہ اختلاف اگر قدر تحمل سے زیادہ ہو یعنی حق و باطل یا حلال و حرام تک پہنچ گیا تو نبی ﷺ نے اس کی نشاندہی فرماتے ہوئے ان کے علم کو درست کیا اور حق کو حق، باطل کو باطل بتلادیا۔ مثلاً ایک صحابیؓ کے احکام صوم کے سلسلہ میں نص قرآنی حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ سے معروف دھاگوں کے رنگ مراد لینے کو غلط قرار دیتے ہوئے صحیح مفہوم کی نشاندہی فرمادی، اور اگر یہ اختلاف قابل تحمل تھا، اس سے امت کو سہولت و راحت مل سکتی تھی مگر اس کی وجہ سے مقاصد شریعت متاثر ہونے کا اندیشہ نہیں تھا تو آپ نے اس اختلاف میں کسی طرف کی تصویب اور طرف آخر کی تغلیط کو ضروری نہ سمجھا، کیونکہ اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ تھیں، اور وہ اختلاف نظام تکوینی کا ایک حصہ تھا،

جیسے عزوہ اُحد میں درہ پر کھڑے کئے گئے صحابہ کرامؓ کا اختلاف کہ ان لوگوں کے درمیان حکم نبی کی مراد سمجھنے میں اختلاف ہوا اور وہ لوگ دو علاحدہ نتائج پر پہونچے اور اپنے اپنے اجتہاد پر ہی عمل کیا مگر نبی ﷺ نے کسی جانب کو غلط اور کسی کو صحیح قرار نہیں دیا، اسی طرح نماز مغرب ذوالحلیفہ میں پہونچ کر پڑھنے کے حکم کو سمجھنے میں دو صحابہؓ کے درمیان اختلاف ہوا اور دونوں نے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کیا مگر نبی ﷺ نے دونوں میں سے کسی کی بھی تصویب و تغلیط نہیں فرمائی، کیوں کہ یہ ایسا ناگزیر اختلاف تھا کہ اس سے مفر نہ تھا۔

بلکہ اس سے بھی آگے دیکھئے کہ آپ ﷺ نے جب اپنے بعد دین کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے اختلافات کی صحابہ کرامؓ کو خبر دی تو اس وقت نہ ان کی مذمت فرمائی اور نہ انہیں ایسا نہ ہونے دینے کا حکم فرمایا بلکہ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ کے مطابق اکابر صحابہؓ — خلفاء راشدین — پر اعتماد کر کے ان کی اتباع کر لینے کا حکم دیا، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف کے ناگزیر اور فطری حصے کا قتل ہی تو تھا، کیوں کہ ایسا اختلاف امت کے حق میں یُسْر و وسعت کا سبب تو ہو سکتا ہے مگر مقاصد کی خلاف ورزی کا ذریعہ نہیں بن پاتا۔ اس سلسلہ میں کتب احادیث میں بہت مثالیں ملتی ہیں، ان سب کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، امت کے اسلاف و اخلاف نے اس موضوع پر اس قدر لکھ دیا ہے کہ مزید اضافے کی کوئی ضرورت نہیں، یہاں صرف یہ یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اخلاص پر مبنی اختلاف — میں (جو مقاصد کو پانے کی جدوجہد میں پیدا ہو جاتا ہے) تشدد و تعصب اور تنگی و زبردستی کا کوئی جواز نہیں ہے، اور اسی وجہ سے عہد صحابہؓ میں اختلاف تو بہت ملے گا مگر اس کی وجہ سے افتراق کہیں نظر نہ آئے گا۔

وفات نبی ﷺ سے پچیس برس بعد جب قصاص عثمانی کے مسئلے کو لیکر دو جلیل القدر صحابہ کی آراء میں اختلاف ہوا تو وہ اختلاف بھی اگرچہ اخلاص و للہیت کی مضبوط بنیادوں پر ہوا تھا اور اسی وجہ سے قتال تک پہونچنے کے باوجود ان میں بغض و عناد پیدا نہ کر سکا تھا مگر

بدقسمتی سے اس وقت تک ہوا و ہوس اغراض نفسانی کے پروردوں کا ایک ٹولہ تیار ہو گیا تھا جس نے اس مخلصانہ و مومنانہ اختلاف کی آڑ میں دنی اغراض کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام میں سب سے پہلے نفسانی و شیطانی اختلاف کی بنیاد ڈالی، اور جو رفض و خروج کے دو مکروہ و منحوس شکلوں میں ڈھل کر ظاہر ہوئی، صحابہؓ تو سب کے سب اس سے بری ہیں کہ وہ یا تو اس میں مبتلا ہی نہ ہوئے تھے یا کچھ دیر کیلئے التباس میں پڑ گئے تھے، باقی ان منافقوں نے یہیں سے فرقہ بندی کرنے اور اختلاف کو انتشار بنانے میں کامیابی حاصل کی، اس وقت سے اب تک جتنے فرقے اسلام کی تاریخ میں دکھائی دیتے ہیں ان سب کا سلسلہ نسب انہی اجداد منافقت و مخالفت سے جاملتا ہے، یعنی ان کے افکار و نظریات یا رد و افض سے مشابہ ہوتے ہیں یا خوارج سے۔

خوارج اعمال و اخلاق میں مضبوط مگر فہم نصوص میں کوتاہ تھے، اور رد و افض علم و عمل دونوں سے کورے اور مسلمانوں کے بدخواہ تھے، ہر دو کا بنیادی مشن شیرازہ امت کو بکھیرنا اور اتحاد امت کو تار تار کرنا تھا اسی طرح آج بھی ان کے پیروکار اسی ڈگر پر چل رہے ہیں، اور کمال یہ ہے کہ اتحاد کا نعرہ لگا کر اتحاد امت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ خوارج کے یادگار علمی موشگافیاں اور دین میں احتمال و اشکال پیدا کر کے امت میں انتشار پھیلا رہے ہیں اور رد و افض کے پیروکار علمی سازشوں اور بغلی گھونسوں کے ذریعہ امت کا ناسور بنے ہوئے اور امت کشی میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اتحاد اتحاد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں اور بڑے حسین عنوانات و تعبیرات کا سہارا لیتے ہیں، مگر اتحاد سے ان کی مراد اپنی اپنی تحقیق اور رائے کو ترک کر کے ان کے خیال کو قبول کر لینا یا ان کی جماعت میں شامل ہو جانا ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف ہی ختم کر دیا جائے، جبکہ ایسا ہونہیں سکتا اور اگر ہو جائے تو اس کا نام اتحاد نہیں ہوتا وحدت ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اتحاد کے لئے اختلاف ضروری ہے، اتحاد میں ہر فریق اپنی فرعی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے اصولی طور پر

ایک دوسرے سے جڑ جاتا ہے جب کہ وحدت کو اتحاد کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ خود ایک اکائی اور اصل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دین نام ہے نقل کو عقل سے یا روایت کو درایت کی روشنی میں مقبول کرنے کا، پس نقل یعنی دین واحد ہونے کے باوجود عقل یعنی فہم دین میں تفاوت ہونے کی وجہ سے امور دنیا کی طرح امور دین میں بھی اختلاف ایک ناگزیر امر ہے، اور جب تک وہ اخلاص اور دیانت پر مبنی ہے سراپا رحمت اور فضل خداوندی ہے، نیز یہ کہ جب تک دین میں اس کی گنجائش تسلیم نہیں کی جائے گی اتحاد ملت کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ایسا ہونا فطرتاً محال ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں میں اسی وقت اتحاد ہوا جب ان کے اختلاف کو تسلیم کیا گیا اور جب کبھی حق اختلاف کا انکار کیا گیا ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ اس لئے اتحاد کے داعیوں اور ملت کے دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ اختلاف اور مخالفت و عناد کے درمیان فرق کو محسوس کریں کہ پہلا محمود ہے دوسرا مذموم! محمود کو اس کا حق ملنا چاہیے کہ آپس میں اس کا تحمل کیا جائے اور مذموم کو اس کا حق ملنا چاہیے کہ دلوں سے نکال باہر کیا جائے ورنہ جس اتحاد کی آپ دعوت دیتے ہیں کہ سب لوگ ایک ہی مسلک پر جمع ہو جائیں سو وہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ واللہ اعلم

(اداریہ جون ۱۳ء)

چند معروضات علماء کرام کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ!*

علماء کرام! آپ کا بہت اونچا مقام ہے، اللہ پاک نے آپ کو ملتِ اسلامیہ کی کشتی ہدایت کا ناخدا اور نسلوں کی صحیح راہنمائی کے لئے راہ نما بنایا ہے، جو کام ہمارے نبی ﷺ سے قبل انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لیا جاتا تھا وہ ان کے بعد علماء کے ذریعہ لیا جا رہا ہے اور لیا جاتا رہے گا۔ علم اور علماء کے فضائل میں بے شمار احادیث موجود ہیں اور آپ کے علم میں ہیں، یہاں صرف دو حدیثوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے علماء کے بارے میں ارشاد فرمایا: ان مثل العلماء فی الارض کمثل النجوم فی السماء یہتدی بہ فی ظلمات البر والبحر فاذا انطمست النجوم او شک ان تضل الہدایۃ۔ (مسند احمد: ۲/۱۵۷) زمین پر علماء کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستارے، جن کے ذریعہ بحر و بر کے اندھیروں میں روشنی حاصل کی جاتی ہے، جب تارے ڈوب جاتے ہیں تو راہ گیروں کے بھٹک جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

علماء کرام غور فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادِ مبارک میں کس قدر جامعیت کے ساتھ علماء امت کے مقامِ بلند کی تعریف فرمائی ہے اور ساتھ ہی ان کی نازک اور حساس ذمہ داری کی جانب بھی کس قدر لطیف اشارہ فرما دیا ہے۔ یعنی علماء کی بلندی مقام

کا حال تو یہ ہے کہ گویا وہ آسمان کے ستارے ہیں اور منصب کی نوعیت یہ ہے کہ ان کے علم و عمل کی روشنی عوام الناس کے جہل کی تاریکیوں کو کافور کر دیتی ہے، نیز جس طرح عرب کے لوگ خشکی اور تری کے سفروں میں آسمان کے روشن ستاروں کی مدد سے اپنی منزلوں کے راستے پہچان لیتے تھے اسی طرح عامہ مسلمین اُخروی نجات و کامیابی کی منزلیں علماء دین کی روشنی و راہنمائی ہی میں طے کر پاتے ہیں، حدیث کے آخر میں یہ وضاحت بھی فرمادی کہ اگر ستارے ڈوب جائیں گے یعنی علماء کرام بگڑ جائیں گے تو پھر پوری امت بے راہ اور بے یار و مددگار ہو کر رہ جائے گی۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے علماء کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے: ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب۔ (ترمذی: ۳۱۲/۴) بے شک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ چودھویں رات کے چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔

اس روایت میں بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ نے بہت ہی حسین انداز میں علماء اسلام کو متنبہ فرمایا ہے کہ ان کا خود روشن ہونا کافی نہیں ہے، ان کی خصوصیت تو چودھویں کے چاند کی طرح اپنی چمک سے عالم کو منور اور روشن کر دینے کی ہونی چاہئے۔

سبحان اللہ! اگر انہی دور وایات پر ہم بار بار غور کر لیں تو ہمیں جہاں اپنے مرتبہ بلند کا اندازہ ہوگا وہیں اپنی ذمہ داریوں کی نزاکت کا پتہ بھی چل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں اپنے نبی کی ان توقعات کو پورا کرنے والے علماء کرام میں شامل فرمائے۔ آمین

قارئین کرام! جب ہم اپنے اکابر پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کی روشن و تابناک زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے اندر اپنی ذات کے سدھار و نکھار کی فکر کے علاوہ امت کی ہدایت و نجات کا درد و غم بھی نظر آتا ہے، آہ سحرگاہی کے ساتھ بصیرت درس گاہی بھی دکھائی دیتی ہے، وہ ایک طرف شب بیدار اور تہجد گزار تھے تو دوسری جانب علم

و تحقیق کے بحرِ ناپیدا کنار بھی تھے، وہ عابد تھے تو داعی و مبلغ بھی تھے، مختصر یہ کہ رہبان فی اللیل بھی تھے فرسان فی النہار بھی تھے۔ بالخصوص ہمارے اکابر علماء دیوبند کی زندگیاں قریب العہد ہونے کی وجہ سے ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں اور وزیرِ روشن کی طرح تاباں ہیں۔ یہ حضرات ذکر و شغل اور اُردو و وظائف کی حد درجہ پابندی اور تصوف و سلوک کی مستی و لطف اندوزی کے دلدادہ ہونے کے باوجود علوم اسلامیہ تفسیر و حدیث، فقہ و فتاویٰ، بلاغت و ادب، تاریخ و سیرت کی فلسفہ و منطق میں بھی کسی سے کم نہ تھے اور کسی کے آگے غم بھی نہ تھے۔ یہی نہیں کہ وہ کسی جگہ بیٹھ کر چین سے حفاظتِ دین کی خدماتِ انجہام دے رہے ہوں بلکہ آگے بڑھ کر اشاعتِ دین کا فریضہ بھی پوری ذمہ داری سے ادا کر رہے ہوتے تھے۔ مدارسِ دینیہ کا جال پھیلانے کی بات ہو یا دعوت و تبلیغ کی عالم گیر تحریک کا مسئلہ، تزکیہٴ نفس و تصفیہٴ باطن کا کام ہو یا فرقِ ضالہ و افکارِ باطلہ کے تعاقب و تردید کی جدوجہد، وطن عزیز کو بیرونی دشمنوں سے آزاد کرانے کی جنگ ہو یا ملک کے باشندگان کو حکمرانوں سے حقوقِ دلوانے اور ان کی نادانیوں سے بچانے کی ضرورت! جس میدان پر نظر ڈالو اور جس طرف پلٹ کے دیکھو بلا مبالغہ آپ کو ہر میدان کی صفِ اوّل میں علماء دیوبند ہی نظر آئیں گے۔ ہمارے اسلاف نے امت کے دین کی فکریں بھی اوڑھیں اور ان کی دنیا کے غم بھی کھائے تب کہیں جا کر ہم اس ملک میں اپنے دین و ایمان اور مساجد و مراکزِ اسلامیہ کی سلامتی کے ساتھ چینے کا پھل کھا رہے ہیں۔ ورنہ یہ ملک جن بیرونی و اندرونی سازشوں کا شکار تھا اور اب تک ہے، اگر اسلافِ کرام کی بصیرت و دوراندیشی اور حکمت و معاملہ فہمی نیز ایثار و قربانی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہندوستانی مسلمانوں کے شامل حال نہ رہتی تو ہمارا دین و ایمان تو بڑی بات ہے جسم و جان کا تحفظ بھی ممکن نہ ہوتا۔ تقبل اللہ اعمالہم و کثر امثالہم و جزا ہم عنا خیر الجزاء و احسنہا

علماءِ ذی احترام! یہ ان کا کام تھا اور اب ہماری باری ہے، مغرب کا جبر و استبداد،

امریکہ کی بُری نظریں اور ہندوستان کی بدلتی ہوئی قدریں مسلمانانِ ہند کی جانب اٹھ رہی ہیں اور اسرائیل کے دستِ خونیں اس ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کا سکون مغربی آقاؤں کے سکون کو غارت کر رہا ہے، اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آزادی دشمنانِ اسلام کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ ہمارے حکمران اسرائیل و امریکہ کی کاسہ لیسے ڈھکے چھپے تو پہلے ہی سے کر رہے تھے اب تو اخبارات مشترک منصوبہ بندی کی خبریں بھی دے رہے ہیں، آئے دن نئے نئے قوانین بنائے جا رہے ہیں، کبھی یکساں سول کوڈ کی بات ہے تو کبھی وقف بورڈ میں ترمیم کی وکالت! کبھی دینی مدرسہ بورڈ کی تجویز ہے تو کبھی رائٹ ٹو ایجوکیشن کی تحریک! ظاہر ہے کہ یہ اور ان جیسے مسائل کا تعلق مسلم امت سے ہے اور امت کو ان تجاویز کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حالات سے باخبر رہنا اور قانونی و جمہوری جدوجہد جاری رکھنا ہمارا آئینی حق اور اسلامی فرض ہے۔

ملت کے مسائل کا یہ خارجی رُخ ہے، اس کا داخلی رُخ بھی ہے، جو اس سے کچھ کم اہم نہیں ہے، وہ ہمارے درمیان ہمارے دشمنوں کے رحم و کرم پر پنپ رہے اور دولت و دھن کی بیساکھیوں پر بڑھ رہے فتنے ہیں، قادیانیت و عیسائیت، انکارِ حدیث و انکارِ تقلید، شیعیت و بریلویت جیسی مختلف گمراہیاں پھر ان سے جنم لینے والے تازہ بہ تازہ فرقے اور حدیث الوجود جماعتیں اسلاف کے مقابلے میں ہماری بے توجہی و چشم پوشی اور آرام طلبی و کم کوشی کا خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور سرچڑھ کے بول رہے ہیں، ان کے مقابلے کے لئے افسوس کہ اب ہمارے پاس نہ آہِ سحر گاہی کا سرمایہ ہے اور نہ ہی عزم و حوصلے کا مستاعِ گراں مایہ! نہ تحقیق و مطالعہ کا ذوق نہ تردید و مقابلے کا شوق۔ ہاں! اس صورتحال کی خطرناکی کا احساس اور کسی مردِ غیب کے ظہور کا انتظار سب ہی کو ہے کہ ۔

مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند

برادرانِ گرامی! ہو سکتا ہے کہ وہ مردِ غیب ہمارے سینے میں سو رہا ہو، وہ مردِ غیب کون

ہے؟ حوصلہ و ہمت کا فوراً اور خالق سے نسبت کا نور ہے، حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

رستم خفتہ ہے تو، کس بل نہیں ہے کم ترا

جاگنے کی دیر ہے، پھر ہے وہی دم حنم ترا

یہ اگر ہو حبا ئے زائل نیند کا عالم ترا

چار سود نیا میں لہرا نے لگے پر چم ترا

کہتے ہیں کہ انگریزوں کے ہاتھ اسپین کا سودا کر لینے والے آخری مسلم تاجدار جب اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ ملک بدر ہو رہے تھے تو ایک پہاڑی پر سے اپنے محل کی طرف دیکھ کر زار و قطار رونے لگے، ان کی والدہ جو اپنے بیٹے کی سہل انگاری و سہولت پسندی سے سخت ناراض تھیں اس کا روناد دیکھ کر فرمانے لگیں:

”بیٹا! تو نے جب مردوں کی طرح دشمن کا مقابلہ نہیں کیا تو اب عورتوں کی طرح رونے

سے کیا فائدہ؟“

بہر حال! ہندوستانی مسلمانوں کو آج فتنوں کے ابھرنے پر شکوہ و شکایت اور رنج و ملال سے کہیں زیادہ ہمارے حوصلہ و ہمت اور ہمارے عزم و حرکت کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ! ہمارے علماء میں بے پناہ صلاحیتیں اور غیر معمولی قوتِ عمل موجود ہے جو اس گئے گذرے زمانے میں اور بہت کوتاہیوں کے باوجود بسا غنیمت ہے، بلکہ معاصر تحریکوں میں بھی کم یا ب ہے مگر مشکل یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے اکثر جگہوں پر یہ صلاحیتیں باہمی رنجشوں اور آپسی خصامتوں کی نذر ہو جا رہی ہیں۔ جماعتوں میں سے جماعتیں بن رہی ہیں، مدرسوں سے مدرسے نکل رہے ہیں، کام کام سے ٹکرا رہا ہے، افراد افراد سے متصادم ہیں، اس نفسی اور کشاکشی نے ہمارے شیرازہ اتحاد کو بکھیر دیا ہے، جو وقت مطالعے اور تحقیق میں لگنا چاہیے تھا، وہ تذکروں اور تبصروں میں لگ رہا ہے، جو صلاحیت امت کی خدمت میں صرف ہو سکتی تھی وہ ساتھیوں کو کمزور کرنے میں کھپ رہی ہے۔ شہروں سے لے کر قصبوں

تک خدام دین کے درمیان نا اتفاقیوں اور تلخیوں کی اطلاعات ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ اور کہیں حلم و وقار کے پردوں میں مستور ہے تو کہیں نادانی و بے صبری کے ہاتھوں میں مجبور!

اس لئے سب سے پہلے ہم کو حلم و تحمل، عفو و درگزر اور صبر و شکیب کی صفات سے متصف رہنے کی عادت ڈال لینا ہوگا، یہ صحیح ہے کہ سب کے خیال و آراء اور سب کے مزاج و مذاق ایک نہیں ہوتے لیکن ہم سب کا مسلک ایک ہے اور جماعت ایک ہے، جماعت کو مستحکم رکھنے کی فکر ہم کو تمام مصالح پر مقدم رکھنی ہوگی، قابل اصلاح امور میں ایک دوسرے کی خیر خواہی ضرور کریں مگر آداب اختلاف میں اپنے بزرگوں کی روش ملحوظ رکھیں۔

علماء ذی احترام! اتحاد و اتفاق کا شیرازہ جمع کر لینے کے بعد ہمیں دو کام کرنے ہیں، ایک تو اسلام اور اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف جتنی تحریکیں ہمارے علاقے میں کام کر رہی ہیں ان کی نشاندہی کر کے ان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان کے نظریات و خیالات کی تحقیق کریں، ہم سے پہلے علماء کرام اس پر کام کر چکے ہیں تو ہم اس کو فہم و فراہم کر کے خوب اچھی طرح سمجھیں، نفس اختلاف، وجوہ اختلاف، قوت اختلاف، اس اختلاف کے اثرات و نتائج اور ان کی تردید کے دلائل کی خوب تحقیق کر کے انہیں ذہن نشین کر لیں، تاکہ خود کو اطمینان ہو جائے اور دوسروں کو پوری ہمت اور کامل بصیرت کے ساتھ دعوت حق دے سکیں۔ دوسرے یہ کہ عوام میں سے ہر عمر اور ہر طبقے کے کچھ افراد منتخب کر کے ان کے لئے تربیتی ورکشاپ رکھیں، ہفتہ میں ایک دن ایک گھنٹے کی کلاس میں پوری وضاحت و صراحت اور دلائل کے ساتھ ان باطل تحریکات کی حقیقت بیان کریں، جب وہ مطمئن ہو جائیں تو ان سے کہیں کہ آپ کے حلقہ تعلق میں جو اس فتنے سے متاثر ہیں انہیں سمجھا کر حق کی طرف واپس لانے کی کوشش کریں، کیوں کہ اہل باطل کا کام عوام سے عوام میں چل رہا ہے اور عالمانہ انداز کے مقابلے میں عامیانہ طریق پر ذہن سازی کی جا رہی ہے، عالم اگر

عوام سے الجھتا رہے گا تو اس کا مقام باقی نہیں رہے گا۔ اس کے برخلاف علماء عوام کو تیار کر کے عوام کو کام پر لگائیں تو شاید بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔ خود اہل باطل کی طرف سے بھی آج کل جلسے کم اور افراد میں ذہن سازی کی محنت زیادہ ہو رہی ہے، اس میں نہ شور و شر ہے نہ خرچ و صرف، دیکھتے دیکھتے ان کے ہم نوا ایک سے دو ہو رہے ہیں اور دوسے چار، جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تب ہم کو پتہ چلتا ہے اور ہم ایک بڑا جلسہ کر کے ان کا حکم بیان کر دیتے ہیں اور کام ختم۔ ضرورت پر بڑوں کے مشورہ سے جلسہ بھی کر سکتے ہیں لیکن انفرادی دعوت مسلسل جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے بعض نوجوان علماء نے شہر میں اس طریقے کو اختیار کیا تو اس کے خوش آئند نتائج پائے ہیں۔

شرکاء اجلاس! ایک اور مسئلے کی جانب اس وقت توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ یہ ملک جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں اس میں دیگر اقوام بھی رہتی ہیں، ادھر مسلمانوں کے نام سے بہت سے ایسے مذاہب موجود ہیں جو فی الحقیقت مسلمان نہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو اصولی اعتبار سے مسلمان ہونے کے باوجود فروعی اعتبار سے فکری و عملی گمراہیوں کے شکار ہیں یا بدعات و خرافات میں مبتلا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم ان سے الگ ہو سکتے ہیں اور ان کو اپنے سے جدا کر سکتے ہیں، ایسی صورت میں ہمارے ان کے ساتھ روابط و تعلقات کیسے ہوں؟ کس حد تک اختلاف کیا جائے اور کس حد تک اتفاق؟ اس مسئلے میں ہمارے بہت سے ساتھی افراط و تفریط کے شکار ہیں اور حفظ مراتب کا لحاظ نہیں کر پارہے ہیں۔ میں یہاں ملک کی عظیم علمی شخصیت، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور آپ میں سے اکثر کے استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا وہ ارشاد جو آپ نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا تھا نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ مفتی صاحب مدظلہ نے فرمایا تھا:

”ہم ملکی اور سیاسی معاملات میں تمام مذاہب کے ساتھ اتحاد کر سکتے ہیں، ملی اور قومی

معاملات میں تمام مسلک اور مسلم جماعتوں کے ساتھ اتحاد کر سکتے ہیں، مسلکی معاملات میں سوائے اپنے مسلک والوں کے اور کسی جماعت و مسلک سے ہم جڑ نہیں سکتے۔“ تاکہ امتیاز برقرار رہے اور لوگوں کو اشتباہ نہ ہو۔

اس لئے وسعت قلبی اور عالی ظرفی جیسے لیبیلوں سے دھوکہ کھا کر ہمارے علماء کرام کا بلا کسی خاص ضرورت و داعیہ ملی کے ہر کسی اسٹیج پر رونق افروز ہو جانا اور محض مادی منفعتوں کے لئے ہر کسی کو اپنے جلسوں اور پروگراموں میں بلانا اور ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اپنے مسلک کو کمزور کرنے اور غلط مسلک کو مضبوط کرنے کے مترادف ہے، اس سلسلہ میں اکابر کے تصلب و پختگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ وہ نہ خواہ مخواہ کسی کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور نہ ہی بلا ضرورت اپنے مخالفین سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ آخر ہر کوئی اپنی شناخت بنائے رکھتا ہے، اس میں کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتا، ہم ہی لوگ کیوں دو غلے ہو جائیں؟؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں حدود و اختلاف کی فہم نصیب فرمائے، ہمارے اتحاد کو مضبوط تر فرمائے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
(اداریہ جولائی ۱۳۷۱ء)

ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں!

امام احمدؒ نے مسند (۱۵۳/۳) میں اور امام بیہقی نے سنن (۷۸/۴) میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ ”جس شخص کے پاس امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کے پاس وفاداری نہیں اس کا دین نہیں“ اسی طرح بحسناری و مسلم رحمہما اللہ (بخاری: ۱۸۵/۶) نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ قیامت کے دن اپنے سروں پر خیانتوں کے اموال اٹھا کر لائیں گے، اس بوجھ سے نجات کیلئے انہیں سوائے نبی کریم ﷺ کے اور کوئی مددگار نظر نہ آئے گا، مگر جب وہ آپ ﷺ سے مدد طلب کریں گے کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلادیجئے تو آپ ﷺ اس کے جواب میں صاف ارشاد فرمائیں گے: حقوق العباد کے معاملے میں ”میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا، خیانتوں کے اس انجام کے بارے میں تو میں نے دنیا ہی میں تمہیں بتلادیا اور تبلیغ کا حق ادا کر چکا تھا“۔ کل قیامت کے ہولناک دن پیش آنے والی اس صورتحال کی اللہ تعالیٰ سے علم پا کر نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو نہ صرف خبر دی بلکہ تاکید فرمائی کہ ”خبردار! میں تم میں سے کسی کو اس صورتحال میں نہ دیکھوں“۔ ایک اور حدیث (بخاری: ۵۹۲/۱۱) میں ہے کہ کسی سفر میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا جا رہا تھا، لوگ سوار یوں پر سے سامان اتار رہے تھے، آپ ﷺ کے خادم مدعم آپ کی اونٹنی کا سامان کھول رہے تھے کہ اچانک کسی دشمن اسلام نے انہیں اپنے تیر کا نشانہ بنایا، وار اتنا طاقتور تھا کہ وہ اپنی زندگی

بچانہ سکے، مگر صحابہ کرامؓ نے جب نبی ﷺ کو اس کی شہادت کا مشرودہ سنایا تو آپؐ نے فرمایا ”اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس شخص کے عمامے پر — جو اس نے خیر کی غنیمت میں سے تقسیم سے قبل بلا اجازت لے لیا تھا — آگ بھڑک رہی ہے“۔ صحابہ کرامؓ اس سچی خبر اور خیانت کے اس خوفناک انجام سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اموال میں غور کرنا شروع کیا، کوئی معمولی سے معمولی چیز میں بھی شبہ ہوا تو لا کر خدمت اقدس میں پیش کر دی، یہاں تک کہ ایک جوتے کا تسمہ لانے والا — مفتوحہ علاقے سے اٹھا کر اپنے جوتے میں لگا لیا تھا — وہ بھی لا کر خدمت والا میں پیش کر دیا، آپؐ نے لوگوں سے فرمایا ”یہ جہنم کی آگ کے تسمے ہیں“۔ یعنی تقسیم سے قبل جو مال بھی مالِ غنیمت میں سے کوئی لیتا ہے تو اسے اس کا حق نہیں ہے، یہ عمل عند اللہ خیانت شمار ہوتا ہے جو نارِ جہنم میں لے جانے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بے شمار صاف و صریح روایات اور آیات ایسی ہیں جن سے دینِ اسلام میں ”امانت و خیانت“ کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جب بے امانت شخص کو بے ایمان تک کہہ دیا گیا تو اور کس وعید کی ضرورت ہے؟ اسی لئے ہمارے سماج کے عام بول چال میں بے ایمانی کا لفظ بددیانتی کا مترادف بن گیا ہے، ایک کافر بھی کہتا ہے ”بے ایمانی مت کرو، ایمان داری کی بات کرو، وغیرہ“ جب امانت اور ایمان کا اتنا قریبی رشتہ ہے تو صحابہ کرامؓ اور اولیاءِ عظام اس کی اہمیت سے غفلت کیوں کر برت سکتے تھے؟ چنانچہ صحابہؓ کے ہاں دین کا پیمانہ دیانت ہی قرار پا گیا تھا، امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے سامنے کسی شخص کی دیانت داری کی شہادت دی گئی، آپؓ نے شہادت دینے والے سے پوچھا: کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملت کی؟ اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی؟ اس کے ساتھ کبھی سفر کیا؟ جب اس نے نفی میں جواب دیا تو آپؓ نے پوچھا: پھر کس چیز سے اس کی دیانت کا پتہ چلا یا؟

۱۔ لایمان کا ظاہری مفہوم

بس مسجد میں راتوں کو لمبی لمبی نفلیں پڑھتا ہوا دیکھ لیا ہوگا اور سمجھ لیا کہ یہ بہت دیندار و دیانتدار آدمی ہے، یعنی زہد و طاعت اور کثرتِ عبادت سے کسی کی دین و دیانت پر کھی نہیں جاتی، بلکہ معاملات کی صفائی، وعدہ و فائی اور حقوق کی ادائی کے ذریعہ دین و دیانت کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ جو اس میں خوفِ خدا اور حساب کا احساس رکھتا ہے حقیقت میں وہ ایمان دار و دیانتدار کہلانے کا مستحق ہے۔ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ (اور جو کوئی اللہ سے نہیں ڈرتا، ہرچہ آمد در گھسیٹ کا مصداق بنا رہتا ہے اس کا دین اور ایمان مشکوک اور غیر محفوظ رہتا ہے، فَأَمَّا مَنْ ظَنَّىٰ ۖ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ) مختصر یہ کہ اسلام نے امانت و دیانت کو معیارِ ایمان اور بدعہدی و خیانت کو معیارِ نفاق بتلایا ہے، حدیث (بخاری: ۸۹/۱) میں ہے: أَرْبَعٌ مِّنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا كَامِلًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنَ التَّقَىٰ - اہل علم و صلاح کیلئے یہ احادیث مشتے از خروارے ہے ورنہ وہ خود اس سلسلے کی آیات و احادیث سے خود ہی بہت واقف ہیں۔

ان آیات شریفہ و احادیث مبارکہ کا جو اثر صحابہ کرامؓ کے اخلاق پر پڑا، اہی امت کے علماء اور اولیاء پر بھی اس کا غیر معمولی اثر پڑا، بالخصوص ہمارے اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ و کثر امثالہم دیگر صفات کی طرح اس معاملے میں بھی اپنا ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں، تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے جو معاملات و مالیات میں ان کی خدا ترسی و خشیتِ الہی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

● امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے بصارت سے محرومی کے بعد تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تو یہ معمول بنالیا کہ جو رقومات و ہدایا خانقاہ کو پہنچتیں انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے تھے کہ اب یہاں درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہے، لوگوں نے کہا بھی کہ کسی اور مصرف میں استعمال کی اجازت لے لی جائے،

مگر آپ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا، یہ دیانت و امانت ہی کی بات ہے کہ عقیدت مند تو بھیجے گا سلسلہ موقوف نہیں کرتے مگر حضرت لے گئے اس سلسلہ بند کر دیتے ہیں، حالانکہ کسی اور مصرف میں صرف فرما سکتے تھے، سب کا رخیہ تو بند نہیں ہوئے تھے، مگر ان کے اندر موجود دیانت اور روز قیامت حساب و کتاب کی نزاکت انہیں مجبور کرتی تھی کہ باسانی خطیر قسمیں اور کثیر آمدنیاں واپس فرمادیں۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ جو کام ختم ہو گئے یا کم ہو گئے ان کے حوالے سے ملنے والی رقومات واپس کر دیں؟ ہم تو اشارۃً کنایہً حتیٰ کہ دلی زبان ہی سے سہی اس کو اطلاع دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ اب ہمارے ہاں یہ مصرف نہیں رہا آپ کہیں اور صرف کر دیں۔

● حضرت مولانا احمد علی سہارن پورؒ کو تعمیر مدرسہ کے سلسلہ میں کلکتہ بھیجا گیا، کافی بڑی رقم اپنے تعلقات کی وجہ سے مدرسہ کے لئے لے کر آئے، جب حسابات پیش کئے تو اخراجات سفر میں ایک مقام پر جانے آنے کا کرایہ اپنی تنخواہ میں سے یہ کہہ کر وضع فرمایا کہ وہاں اگرچہ چندہ بہت ہوا مگر جانے کی نیت ایک دوست سے ملنے کی تھی چندہ کرنے کی نہ تھی۔ سوچئے کہ یہ کیا احتیاط ہے اور کیسی پرہیزگاری ہے؟ کیا آج سفراء حضرات بلکہ وہ علماء جو تعطیلات میں یا خصوصی مواقع پر فراہمی سرمایہ کیلئے مدرسوں اور دینی اداروں سے بھیجے جاتے ہیں وہ حساب و کتاب کے پیش کرتے وقت ایسی دیانت داری و پرہیزگاری کا ثبوت دے سکتے ہیں؟ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ دوست نے کھانا کھلا دیا تو بھی خرچہ میں لکھواتے ہیں، چائے نہیں پی تھی تو بھی خرچہ میں ڈال دیتے ہیں، پیدل گئے تھے تو بھی کرایہ شمار کر دیتے ہیں، اور بھی ایسی ایسی خیانتیں علم میں آئی ہیں کہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا، کمیشن کی نحوست نے تو اس عظیم خدمت کو ایسا کاروبار بنا دیا ہے کہ ڈوب مریں تو بہتر ہے۔

● مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت حکیم الامتؒ سے معلوم کروایا کہ مدرسہ میں مہمان آتے رہتے ہیں، کیا مدرسہ کی جانب سے ان کی ضیافت کی جاسکتی ہے؟ حضرت نے

جواب دیا: اگر اس مہمان کے آنے سے مدرسہ کا معتد بہ نفع ہے تو مدرسہ سے ضیافت کر دی جائے ورنہ خدام مدرسہ میں سے کوئی انہیں اپنا مہمان بنالے۔ یعنی اکرام ضیف سے پہلو تہی بھی نہ کی جائے اور مدرسہ کے مالے کا استعمال بھی مشکوک نہ ہونے پائے۔

● شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے ساتھ بہت سے علماء و صلحاء مظاہر کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے ان میں بہت سے امراء بھی ہوتے تھے، ان کا آنا ملک بھر میں مدرسہ کے تعارف اور آمدنی کا مؤثر ذریعہ بھی تھا، مگر شیخؒ نہ صرف یہ کہ ان سب کو شخصی مہمان بناتے تھے بلکہ ایک مہینے کا کرنٹ کابل بھی خود ادا کرتے تھے کہ میرے مہمانوں کی وجہ سے بحسبلی زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

● قریب زمانے میں عارف باللہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ گذرے ہیں، مقبولیت عامہ کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی، حضرت ان کو اپنا مہمان سمجھتے تھے، کبھی مدرسہ سے کھلا بھی دیتے تو اپنے جیب سے اس کی قیمت جمع فرما دیا کرتے تھے۔ کیا آج ہم بھی مدارس میں ایسی احتیاط برت رہے ہیں؟ ہم تو اپنے مہمانوں کا بار بھی کسی بہانے مدرسہ کے مطبخ پر ڈال دینے میں پیچھے ہٹنے والے نہیں رہے۔

● محی السنۃ حضرت ہر دوئیؒ اپنے زیر انتظام مدارس کے حسابات خود جانچتے تھے اور کسی صرفے میں ذرا بھی کھٹک ہوتی تو اسے مدرسہ سے منظور نہیں فرماتے تھے، ایک مرتبہ ایک مدرسہ والوں نے رسید کا مضمون اور ڈیزائن تبدیل کر کے معروف کاتب سے اچھی کتابت کروالی تھی، جس پر سو روپے کا صرفہ آیا، جب حضرتؒ نے حسابات میں اس کو دیکھا تو فرمایا: اس تبدیلی کی کوئی ضرورت نہ تھی، ایک تو عوام میں رسید کی وضع بدلنے سے شبہ پیدا ہوگا، دوسرے کام تو اس سابقہ وضع کی رسیدوں سے بھی چل رہا تھا، اس لئے یہ مصارف بلا ضرورت ہوئے، پہلے خلیجان کا حل یہ نکالا کہ ان رسائد کو اندرون مدرسہ استعمال کر کے ختم کر لیا جائے اور عام استعمال کے لئے رسیدیں سابقہ وضع ہی پر چھپتی رہیں، دوسرے خلیجان کا مداوا اس

طرح فرمایا کہ: جن مقامی ذمہ داروں نے ایسا کرنا طے کیا تھا وہ اپنے جیب سے اس زائد خرچ کا بوجھ اٹھالیں یہ رقم مدرسہ جاری نہیں کرے گا، چنانچہ تین آدمیوں نے مساوی طور پر اس خرچ کو تقسیم کر کے مدرسہ میں جمع کروادیا۔

یہ چند واقعات میں نے بعض اکابر کے بطور مذاکرہ و یاد دہانی کے یہاں رقم کر دئے ہیں جو آپ حضرات کے علم میں پہلے سے ہیں اور ان کے علاوہ بھی آپ بہت کچھ جانتے ہیں اصل وجہ ان کے ذکر کی اس امر کی جانب اپنی اور احباب کرام کی توجہ مبذول کرنا ہے کہ فی زمانہ مدارس کے مالیات کا استعمال دن بہ دن نامناسب شکل اختیار کرتا جا رہا ہے، تعلیم سے زیادہ تعمیر کی فکر ہے اور کام کی توسیع سے زیادہ وصولی کی تکثیر پر نظر ہے، عمارات میں تقابل و تفاضل دیکھنے میں آ رہا ہے، مصارف میں قدر ضرورت پر اکتفا کیا جاتا ہے نہ محل صرف کی واجبیہ کا اندازہ کیا جاتا ہے، صدقات واجبہ کی تملیک یا تو مد نظر ہی نہیں یا نہایت استخفاف کے ساتھ کر لی جاتی ہے، حیلہ تملیک مواقع خاصہ تک محدود ہونے کے بجائے عام کر لی گئی ہے، وصولی سرمایہ میں بھی احتیاط نہیں ہے، کمیشن کے جواز اور رواج نے اس کام میں اخلاص و للہیت کو ختم کر دیا ہے، ان جگہوں پر جہاں اس پر عمل ہے بہت ہی افسوس ناک صورتحال ہو گئی ہے۔ بہت سی جگہ ذمہ داروں کے مصارف متعین نہیں، وہ جو کچھ خرچ کریں سب مدرسہ کا بوجھ ہے، طلبہ کی ضروریات اور حاجات کی فکر بہت کم ہے حالانکہ زکوٰۃ و صدقات کی رقومات نہ استعمال ہو سکنے کی وجہ سے انہیں سے تملیک کرا کے دوسرے کاموں میں صرف کی جا رہی ہے، مگر ان کے لباس خوراک اور شخصی ضروریات پر مستحق ہونے کے باوجود کم احقہ توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ علاقائی مدارس میں طلبہ کی تعداد مختلف معلوم اسباب کے تحت گھٹتی جا رہی ہے، اہل مدارس اس کا رونا تو رو رہے ہیں مگر اپنی توجہات اور سرگرمیاں مکاتب کی طرف مبذول کرنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ اس سے خوشگوار اور مثبت تبدیلیوں کی توقع ہے، اس کے برخلاف موجودہ صورتحال یوں ہی زوال پذیر رہی اور اہل مدارس اس اپنے

اطراف و اکناف مکاتب کا جال نہ پھیلا سکیں تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یورپ میں عدم استعمال کی وجہ سے چرچ فروخت کئے جا رہے ہیں ہمارے مدارس کی یہ بڑی بڑی عمارتیں بیچ دینے کی نوبت نہ آجائے، بعض علمائے کرام بھی جن کے پاس وسائل مالیہ ہیں وہ ان کے صرف میں علاقے کی ضرورت کا پورے طور پر سروے نہیں کر پارہے ہیں، بس پیچھے لگے رہنے والوں کے اصرار پر کروڑوں روپے خرچ کر کے ایکروں زمین پر وسیع و عریض عمارات کا ایک دارالعلوم بنوا دیتے ہیں، چھوٹی جگہوں پر اچانک اتنی بڑی مسلم پراپرٹی کو دیکھ کر حاسد اور دشمن الگ جلنے لگتے ہیں اور کام کی مقدار اس عمارت کے اعتبار سے افسوس ناک حد تک قلیل ہوتی ہے، ابھی اس ادارہ کی مقبولیت و مرجعیت تو کیا تعارف بھی پورا نہیں مگر مہمان خانہ عظیم الشان اور باقاعدہ ایک مدرسہ کے برابر ہوتا ہے، جس میں شاید و باید مہمانوں کے قیام کی نوبت آتی ہے۔ ان کے مقابلے میں کئی مدارس ضرورت کے مقنا پر قائم ہیں، خوب کام کر رہے ہیں مگر اسباب ظاہری سے محروم ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کی شوکت پر شکوہ عمارتوں ہی سے ہے تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے جس کی ہمارے طبقے سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔

انبیاء کرام کی تاریخ تو کھلی کتاب ہے ہی اولیاء کرام اور اسلاف عظام کے احوال بھی ذہنوں سے اوجھل نہیں کہ اصل چیز جہد و عمل اور امت کے غم میں گھلنا مرنا ہے۔ سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ وہ جو اسلامی دنیا کی عظیم الشان عمارات ہیں بخارا و سمرقند کے مدارس اور عالم اسلام کی تاریخی مساجد یہ علماء کرام کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہیں، خلفاء و امراء کی خواہشات کی دین ہیں، علماء نے ہمیشہ کام اور کاموں کی فکر پر توجہ مرکوز کی، وسائل کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اہل خیر کے قلوب کو متوجہ کیا تو وسائل بھی بقدر ضرورت انجام پاتے گئے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مخلص علماء وسائل کی بہتات کو آواز نہ سمجھتے اور اس سے گھبراتے رہے، اور اب صورتحال یہ ہے کہ بہت سے ذمہ دار حضرات نے مدرسہ

کو چند معلموں کے حوالے کر کے اپنی ساری تنگ و دو وسائل ظاہرہ کے پیچھے وقف کر رکھی ہے، اس کی وجہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نو فارغ اور غیر تربیت یافتہ علماء جو ماتحتی کا داغ اپنے دامن پر دیکھنا نہیں چاہتے اور ضرورت ہونے نہ ہونے کا اندازہ کئے بغیر نیسز بڑوں سے مشورے لئے بغیر مدرسہ سے قائم کرتے چلے جا رہے ہیں، ذرا ناظم سے اختلاف ہوا مستعفی ہو کر دوسرا مدرسہ کھول لیا، جگہ خریدنے اور عمارت بنانے میں لگ گئے، ابھی فارغ ہو کے آئے، کوئی تجربہ کام کا نہیں مدرسہ شروع کر دیا، دس بیس بچوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ کام برائے نام اور جلسے عظیم الشان ہو رہے ہیں۔

ایک علاقہ کے ذمہ دار مدرسہ نے مجھے جلسے میں بہت اصرار سے دعوت دی، مجھے ایسا لگا کہ دو چار علماء ہوں گے، بہت دور کا سفر تھا تو میں ہوائی جہاز سے پہونچا اور اس کے لئے بہت کام آگے پیچھے کرنے پڑے، جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ بہت بڑا جلسہ ہے اور پوری ریاست اور اطراف و اکناف سے ۴۲/۱۰۰ اکابر علماء بلائے گئے ہیں (سب کو ایسا ہی اندھیرے میں رکھ کر بلایا ہوگا) لاکھوں روپیہ تو صرف کرایوں پر صرف کیا، معلوم ہوا کہ ساؤتھ آفریقہ سے چندہ لاتے ہیں اور یوں کھپاتے ہیں، اس گاؤں میں ذرا ذرا سے فاصلے سے کئی مدارس ہیں، میں نے خود تین دیکھے مگر طلبہ کی تعداد برائے نام، تینوں مدرسوں کے بچے ایک مدرسہ میں بہ سہولت پڑھ سکتے ہیں، تعدد مدارس بقدر ضرورت میں کوئی حرج نہیں بلکہ ہونا چاہئے مگر اس طرح نہیں ہونا چاہیے جیسے وہاں دیکھا کہ بیچ میں ایک مکان ہے اس جانب ایک مدرسہ مسجد اور اُس جانب ایک مدرسہ مسجد، دونوں دیوبندی الفکر عالم ہیں، دونوں مدرسوں میں سب سے شاندار جگہ مہمان خانہ ہے، کارپیٹس، بیڈس، کولرز، ہیٹرز، قیمتی ٹائیلٹ اور باتھ روم عالی شان صوفہ سیٹ وغیرہ۔

مدارس میں مہمان خانہ بھی بے شک ایک ضرورت ہے مگر شریعت میں ضرورت کی بھی کوئی تعریف ہوتی ہے؟ اسی گاؤں کے ایک مدرسہ میں تو معلوم ہوا کہ جو مسجد زیر تعمیر ہے ناظم

صاحب کی خواہش ہے کہ وہ مسجد رشید کی طرح لگے، اس کے لئے ہر ممکن صرفہ فرمایا حبار ہا ہے، بعض لوگ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسی جامعات کی تعمیروں کا حوالہ دیتے ہیں مگر ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ تاریخی مقامات اور عالمی مراکز ہیں، متعدد اور متنوع کام وہاں سے ہوتے ہیں، دنیا بھر سے لوگ ان کی زیارت کیلئے پہنچتے ہیں ان مراکز سے تقابل کوئی معنی نہیں رکھتا، پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ آج دیڑھ صدی کے بعد ان کو یہ حیثیت حاصل ہوئی ہے، آغاز جس طرح ہوا اور کام جن جانفشانیوں اور قربانیوں سے سرانجام ہوتے رہے، ان کو کیوں نہیں دیکھا جاتا؟

دارالعلوم دیوبند کے ایک ذمہ دار استاذ نے بتلایا کہ کسی صاحب کے شدید اصرار پر وہ مدرسہ کے جلسے میں گئے، کچھ لوگ جمع تھے بیان ہوا، بعد میں مقامی لوگوں نے بتلایا کہ یہ سب لوگ دوسری جگہ سے جمع کئے گئے ہیں، مقامی کوئی نہیں اس لئے کہ سب ان کی حرکتوں سے نالاں ہیں، آپ ذرا مدرسہ کی تحقیق کر لیجئے، انہوں نے مدرسہ دیکھنا چاہا تو رات ہو جانے کا بہانہ کر کے ٹال مٹول کرتے رہے، پھر جب دکھانا ہی پڑا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے اسی کے دروازے پر ایک شعبہ کا بورڈ تھا، کھڑکی پر ایک شعبے کا بورڈ تھا، کسی اور جگہ ایک شعبے کا بورڈ تھا۔ ایک اور مدرسہ میں خود میراجانا ہوا دو کمرے اور آٹھ شعبے ہیں، خوب اشتہار ہوتا ہے اور خوب وصولی کی جاتی ہے، پیسہ جو آ رہا ہے انہی کاغذی تشہیرات پر صرف ہو رہا ہے، کام ہر شعبے میں برائے نام ہے، جبکہ بڑے بڑے کام کرنے والے اداروں میں بھی تشہیر پر اتنا صرفہ نہیں کیا جاتا، ظاہر ہے کہ جب آدمی کا مقصود شہرت و دولت ہو تو اسے کام سے کیا لینا دینا؟

یہ چند متفرق باتیں مدراس اسلامیہ میں مالیات کے بے ڈھنگے استعمال کی جو میں نے لکھی ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ بہت سے مدارس جو غیر ذمہ دار علماء نے کھول رکھے ہیں جن کی کوئی شوریٰ ہے نہ ہی کوئی موثر سرپرست ہے جو ذمہ دار پر اپنا اثر رکھتا ہو، ان کی

وجہ سے ایک طرف مدارس کی بدنامی و بے اعتمادی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، دوسری جانب قوم کا سرمایہ بے محل صرف ہوتا جا رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تحریک مدارس کی برکتیں اٹھتی چلی جا رہی ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب مدارس ان امور پر غور کریں اور مالیات میں امانت و دیانت کی اہمیت کو نظر انداز نہ کریں، بلکہ اپنے اکابر کے مزاج و منہاج پر مستقیم رہنے کی کوشش کریں۔ انہی خطرات کی وجہ سے ہمارے اکابر اولاً تو عہدوں اور منصبوں سے دور بھاگتے تھے، اور کوئی ذمہ داری زبردستی ڈال ہی دی جاتی تو پائی پائی کے بارے میں جواب دہی کا احساس رکھتے تھے۔ حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ فرماتے تھے: مدارس کا دنیا کے لئے چلانا آخرت کا سب سے بڑا عذاب ہے اور آخرت کے لئے چلانا دنیا کا سب سے بڑا عذاب یعنی انتہائی مجاہدہ و محاسبہ کا کام ہے۔ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب مدرسوں کی ذمہ داری اور سرپرستی قبول کرنے سے بہت گھبراتے تھے اور فرماتے تھے کہ شخصی طور پر کسی معاملت میں خیانت ہو جائے تو جب احساس ہو آدمی اس سے معافی مانگ کر یا تلافی کر کے عہدہ برآ ہو سکتا ہے مگر قومی املاک و اموال میں خیانت کرنے والا کس کس سے معافی مانگ سکتا ہے؟ کسی ایک آدمی کی چیز تو ہے نہیں۔ اسی لئے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے وصیت فرمائی تھی کہ دینی اداروں کے پہلے تو ذمہ دار نہیں ہی نہیں اور اگر ضرورت پر بننا پڑے تو معاملہ ایسا رکھیں کہ مدرسہ سے تو ہمیں کچھ ملنا باقی ہو مگر ہمارے ذمے مدرسہ کا کچھ نہ نکلے۔ بے شمار واقعات ہمارے اکابر کے ایسے موجود ہیں کہ باوجود حساب و کتاب صاف ستھرا رکھنے اور اور مالیات میں خوفِ خدا کا لحاظ رکھنے کے بھی وقفے وقفے سے احتیاطاً مدرسہ میں چندہ دیتے رہتے تھے کہ انجانے میں بھی کوئی بے احتیاطی ہو گئی ہو تو اس طرح تلافی ہو جائے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے اسلاف کا سچا جانشین بنائے بالخصوص مالیات کے باب میں غایت احتیاط کی صفت نصیب فرمائے۔ آمین

(اداریہ ستمبر ۱۳ء)

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ہمارے ملک میں اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ منصوبہ ساز ادارے آزادانہ منصوبہ بندی کے بجائے بڑی طاقتوں اور عالمی سیاستوں کے مقاصد و منافع کے تابع رہنے پر مجبور ہیں، اسی لئے وقفے وقفے سے ایسے مسائل اٹھائے جاتے رہتے ہیں جو ماضی میں اُٹھ چکے اور قوم ان کی مخالفت کر چکی ہے، بالخصوص مسلم اقلیت اور ان کی مذہبی تہذیبی آزادی کے حوالہ سے بعض مسائل کا مختلف روپوں میں اٹھتے رہنا اور ختم نہ ہو جانا حکمرانوں اور پالیسی سازوں کی اس مجبوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دینی مدارس اور مساجد کے سلسلہ میں حکومت کی جانب سے مالی تعاون کی بات کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی مرکزی سطح پر کبھی ریاستی لیول پر مختلف انداز اور مختلف آواز سے اُٹتی رہتی ہے، مرکزی مدرسہ بورڈ کا مسئلہ ٹھنڈا پڑا تو لازمی حق تعلیم کی شکل میں پھر نمودار ہوا، اس میں سپریم کورٹ کی رولنگ سے راحت ملی تو آندھرا پردیش حکومت نے ریاستی سطح پر اس مسئلے کو اٹھایا، ازیں قبل ائمہ مساجد کی تنخواہوں کی بات چل رہی تھی، ممکن ہے یہ بجٹ ناقابلِ تحمل محسوس ہوا ہو گا اس لئے سرد خانے میں پڑ گیا، خارجاً معلوم ہوا ہے کہ مدرسہ بورڈ کے قیام پر ممتامی حکومت ابھی بھی مُصر ہے۔ اسی اثناء میں مہاراشٹر گورنمنٹ کی طرف سے دینی مدارس کے تعاون کا پیشکش سامنے آیا، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب تک کی صورتحال کے بالکل برعکس مہاراشٹر کے علماء اور جماعت نے اس کا خیر مقدم کیا ہے، بلکہ اطلاع ہے کہ سینکڑوں مدارس نے حصول فنڈ کیلئے درخواستیں بھی پیش کر دی ہیں۔

ایسے حالات میں لگتا ہے امامت و تدریس کی اس عظیم امانت کو خود ہم مسلمان اپنے ہاتھوں ضائع کر کے سرکاری ملازم بن جانے کے لئے راضی ہو گئے ہیں، جن کے ذمے قوم و ملت کی صحیح راہنمائی اور دین و شریعت کی بے لوث حفاظت کا کام تھا وہ بھی اپنے اسلاف و اکابر کے زیر سایہ و مشورہ رہنے کے بجائے خود اپنی آراء و افکار کی اتباع کو ترجیح دے رہے ہیں، اگر یہی صورتحال رہی تو ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مراکز، مساجد اور مدارس سب خطرے کی زد میں آجائیں گے اور شاید لمحوں کی یہ خطائیں صدیوں تک سزا پانے پر مسلمانانِ ملک کو مجبور کریں گی، الامان الحفیظ!

جی چاہتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے اسلاف و اکابر کی فکر و نظر اور طرزِ عمل کی روشنی میں کچھ معروضات علماء کرام کی خدمت میں پیش کروں مگر وقتی مشاغل و مصروفیات نے اس کا موقع فراہم ہونے نہیں دیا، ہماری ریاست کے معروف اور پختہ فکرو نظر عالم دین حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ نے ۶ ستمبر کے ”منصف“ میں اپنے کالم ”شمع فروزاں“ کے تحت اس عنوان پر ایک فکر انگیز مضمون شائع فرمایا تھا، میں اس وقت یہی مضمون ”اشرف الجرائد“ کے قارئین کی خدمت میں روزنامہ ”منصف“ اور حضرت مولانا مدظلہ کے شکر یہ کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ ملک میں ہماری دینی قیادت کیلئے صحیح فکر اور مضبوط عزم کے اسباب پیدا فرما کر اپنے اسلاف کے سچے اخلاف بننے کا شرف عطا فرمائے اور ہر طرح کے خطرات سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

(اداریہ اکتوبر ۱۳ء)

لوٹ پیچھے کی طرف اے مسلمان تو

اسلامی تقویم کی ابتداء سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے بعد دین اسلام کے ایک اہم ترین تاریخی واقعہ — یعنی نبی کریم ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کے واقعہ کو بنیاد بنا کر کی گئی، اسی وجہ سے اسلامی سن سن ہجری کہلاتا ہے، اس واقعہ — کو اس ماہ ذی الحجہ کے اختتام پر چودہ سو چونتیس سال مکمل ہو جاتے ہیں، مسلمانان مکہ کی ہجرت اور مسلمانان مدینہ کی نصرت دوایسے مبارک عمل ہیں جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دین اسلام اور صحابہ کرامؓ کو دونوں جہاں میں کامیاب و بامراد کر دیا۔

آدمی کا وطن خواہ کتنا ہی پس ماندہ کیوں نہ ہو اسے محبوب ہوتا ہے اور غریب الوطنی خواہ کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو وطن کی محبت و لذت سے بے نیاز نہیں کرتی، بالخصوص وطن اگر جذباتی و روحانی کشش بھی رکھتا ہو، وہاں روحانیت کا سرچشمہ اور تقدس مآب بیت اللہ بھی موجود ہو تو اس سے علاحدہ ہونا بلکہ زبردستی باشندگان وطن کی طرف سے علاحدہ کیا جانا کوئی معمولی مجاہدہ اور سرسری حادثہ نہیں ہو سکتا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی، نبیوں کے امام حضرت محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کرامؓ نے مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر باذن الہی مکہ مکرمہ کو خیر باد کہتے ہوئے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کر لی۔ کعبۃ اللہ کے جوار سے یہ دوری امام الانبیاء ﷺ کے قلب مبارک پر کتنی گراں تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے روانہ ہو رہے تھے تو — بقول ابن عباس

رضی اللہ تعالیٰ عنہ — آپ سے جذبات قلبیہ زبان مبارک کے اس طرح ظاہر ہو رہے تھے:

”اے مکہ! تو انتہائی پاکیزہ اور میرا محبوب ترین شہر ہے، اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں (تجھے چھوڑ کر) کسی اور جگہ کبھی قیام نہ کرتا“ (ترمذی: ۵/۶۷۹)

ایک دوسری روایت میں ہے:

”بخدا اے مکہ! اللہ کے نزدیک تو اس زمین کا سب سے بہترین بقعہ اور محبوب ترین حصہ ہے، اگر یہاں کے لوگ مجھے زبردستی نہ نکالتے تو میں کبھی یہاں سے نہ نکلتا“ (مسند احمد: ۴/۳۰۵)

صحابہ کرامؓ کے جذبات بھی مکہ مکرمہ کے بارے میں ان کے عشق رسول اور جذب و محویت کی روشنی میں صاف ظاہر ہیں کہ یہی تھے۔ اسی لئے اللہ پاک نے ہجرت کے اس عمل کو عظیم عمل اور ایمان کے بعد سب سے قیمتی عبادت قرار دیا:

”جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اپنی جان و مال راہِ خدا میں قربان کئے اللہ کے ہاں ان کا بلند مقام ہے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں“ (التوبہ: ۲۰)

یہ ہے ”ہجرت“ کرنے والوں کا مجاہدہ و ایثار اور اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ و مقام، اس کا دوسرا پہلو ”نصرت“ بھی نہایت قابلِ عبرت ہے کہ جب آپ ﷺ اور ان کے اصحاب اللہ پاک کے حکم سے ترک وطن کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے تو باشندگانِ مدینہ (اوس اور خزرج) نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کشادہ دلی، خندہ جمینی اور وسعتِ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے ان پر دیسیوں کا بھرپور خیر مقدم کیا، اپنے گھر، زمین، جائیدادیں، اموال و املاک ان پر نثار کر دیئے، سب جانتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنا مال محبوب ہوتا ہے، وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا، اپنی جائیدادیں مرغوب ہوتی ہیں، وَمَسْكِنٌ تَرَضَوْهُنَّ، اپنی تجارتوں سے دل جڑا ہوا ہوتا ہے، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا، اسی

وجہ سے اس کا دوسروں پر صرف کرنا آدمی پر بارِ گراں ہوتا ہے چہ جائے کہ سب کا سب لٹا دینا اور قربان کر دینا، ظاہر ہے کہ یہ اہل مدینہ کا تاریخی اقدام اور قابلِ تعریف و تحسین کارنامہ تھا۔ اس بے مثال اخوت و بھائی چارگی اور حمیت و ہمدردی نے اہل مکہ کو اپنے وطن، اعزہ و اقرباء اور اموال و املاک سے محروم ہونے کے غم سے نجات دلا کر سکون و سرور نصیب کیا خلاصہ یہ کہ جہاں مہاجرین کا عمل ہجرت راہِ خدا کی بے مثال قربانی تھی تو انصار کا عمل نصرت تاریخ سخاوت میں ایک بے نظیر ایثار تھا، حق تعالیٰ شانہ نے ان دونوں عملوں کو جو خلوص و للہیت کے اعلیٰ معیار پر تھے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور قرآن کریم میں اس کی سند نازل کی:

”اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا (یعنی مہاجرین کرام) نیز وہ لوگ جنہوں نے (اپنی سرزمین پر) انہیں ٹھکانہ دیا اور ان کی نصرت کی (یعنی انصارِ مدینہ) یہی لوگ پکے مومن ہیں، ان کے لئے (اللہ تعالیٰ کے ہاں) مغفرت اور رزقِ کریم (کا وعدہ) ہے“ (الانفال: ۷۴)

تاریخ اسلام میں نبوت کے تیرھویں سال وجود میں آئے ”ہجرت و نصرت“ کے یہ دو عمل ہی وہ مبارک اعمال ہیں جنہوں نے دین اسلام کو ایک مضبوط قوت، متحد امت اور مثالی سماج کی شکل میں انسانیت کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ظالموں سے قتال اور اسلامی نظام حیات کے احکام پئے بہ پئے نازل فرمائے، اور نبی کریم ﷺ نے ان احکامات کا عملی نفاذ فرمایا، یہاں تک کہ اسلام پورے جزیرۃ العرب میں غالب ہو کر ”لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ“ کی تفسیر بن گیا۔

اسلامی تقویم کے سلسلہ میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہجرت کو معیار بنانا اور اسکی طرف منسوب کرنا ان کی دوراندیشی اور فراستِ ایمانی کا مظہر ہے، تاکہ ہر سال، سال کا ہر مہینہ، مہینہ کی ہر تاریخ مسلمانوں کے سامنے ان کے نبی اور اصحابِ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے ایثار و قربانی کی یاد تازہ کرتی رہے اور وہ اس کی روشنی میں یاد رکھ سکیں کہ کسی قوم کی ترقی و کامرانی کا خواہ کوئی وسیلہ ہو مسلمانوں کی کامیابی و ترقی تو اسلام کے تئیں ایثار و قربانی اور ہجرت و نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔

آئیے! ہم عہد کریں کہ اسلامی سال ۱۴۳۴ھ کے اختتام اور ۱۴۳۵ھ کے آغاز پر اپنے گزرے ہوئے سالوں کا جائزہ ”ہجرت و نصرت“ کے ان عظیم وقائع کے تناظر میں لیتے ہوئے انہی کی روشنی میں اگلے سال کا عملی منصوبہ تیار کریں گے، تاکہ ہمیں بھی اس فتح و غلبے سے کچھ بہرہ مل سکے جو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملا تھا۔

اس عہد کے ساتھ یہ دعا بھی کریں کہ اللہ پاک نئے سال کا آغاز عالم اسلام اور مسلمانوں کے حق میں غیبی نصرت، خیر و برکت، اور یمن و سلامتی کا مشردہ لے کر ہو اور مسلمان نئے عزائم اور مضبوط ارادوں کے ساتھ عبیدیت و بندگی کا فریضہ ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ آمین

(اداریہ: نومبر ۱۴۳۳ء)

تبصرہ بر

عمدة الاقاول فی تحقیق الاباطیل

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ہی واضح ہے غیر معتبر و من گھڑت احادیث کی نشاندہی پر مشتمل ہے، احادیث مبارکہ دین اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے ایک اہم مآخذ ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح حفاظتِ قرآن کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح حفاظتِ حدیث کا بھی معجزانہ نظام بنادیا ہے، مسلمان ہمیشہ اسلام کی ان دونوں بنیادوں کی حفاظت کے آسمانی و غیبی نظام سے مطمئن اور اس پر مفتخر رہے، بلکہ اقوامِ عالم بالخصوص ان کے اہل علم حفاظتِ قرآن و حدیث کے اس عظیم الشان اور حیرت انگیز معجزانہ نظام کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

کسی قوم کے پاس اس کے پیشوا کی زندگی کی مکمل تاریخ، اعمال و اقوال، حرکات و سکنات، احکام امر و نہی اور اخبار و اعلام محفوظ نہیں، نہ ہی ان کے پاس راویوں کے صدق و کذب اور ان اخبار و آثار کی صحت و سقم کو پہچاننے کا کوئی معقول و موثر ذریعہ موجود ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تعلیمات کی جگہ مفروضات و مزعومات اور شخصیت کی جگہ تخیلات و توہمات غالب آکر ان کا مذہب حق و صداقت کے بجائے وہم و خیال کا معجون مرکب بن گیا ہے۔

حفاظتِ حدیث کا اصل سبب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے کسی

بھی معاملے میں بالخصوص دین کے سلسلہ میں کذب و وضع پر سخت تنبیہ و تہدید ہے، ارشادِ ربانی ہے: ”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر آدمی کوئی بات لائے تو تم اس کی تحقیق کرو“۔ (سورۃ الجرات: ۶)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو کوئی میری جانب جان بوجھ کر کسی بات کو عنط منسوب کر دے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے“ (بخاری: کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ---۶/۲۹۶) وغیرہ

ان ہدایات کا صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور بعد کے محدثین و رواۃ پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ حدیث رسول کو نقل کرتے ہوئے خوف کرتے اور انخبام سے ڈرتے تھے، قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر کسی بات کو نقل کرنا ان کے لئے ہر مشکل سے بڑی مشکل بن گئی تھی، ان حضرات کو نقل حدیث کے وقت ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے، روتے ہوئے دیکھا جاتا تھا، یقین کے بغیر تو بیان کرتے ہی نہ تھے یقین کے باوجود غایت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایسے دیانت دار و امانت دار پر وقار و باعتبار لوگوں کے درمیان او آخر خلافت راشدہ میں بعض منافق خصلت، خبیث الفطرت اور شرارت پیشہ لوگ گھس آئے جو اگرچہ بہت ہی کم تعداد تھے مگر مکر و خداع کے ذریعے انہوں نے ایک گروہ اپنے ہم نواؤں کا تیار کر لیا تھا جو سادگی و نادانی سے ان کے مقاصد و مفسد کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور ان کی ہر رطب و یابس پر اعتماد کر کے خود بھٹکتے اور دوسروں کو بھٹکانے کی کوشش کرتے تھے، ان خبیثوں نے اپنا مقام بنانے اور اپنی اباطیل و اقاول کا سکہ جمانے کے لئے اپنی من گھڑت باتوں اور خرافات کو حضرت نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا مشروع کیا، لیکن جب یہ باتیں منظر عام پر آئیں تو خود صحابہ کرامؓ نے اور ان کے بعد تابعین و محدثین نے ایسی باتوں کا مضبوط تعاقب کر کے پانی کو دودھ سے اور سیاہی کو سفید سے ممتاز کر دیا۔

اس کام کیلئے جو شرعی تدابیر اختیار کی گئیں وہ بالآخر باضابطہ اصولوں پر مشتمل ایک فن کی

شکل اختیار کر گیا، روایت سے متعلق پانچ لاکھ اشخاص کے احوال زندگی اور معیار دیانت مرتب ہوا، اس فن اور رجال کے ماہرین وجود میں آئے جس کے نتیجے میں بفضلہ تعالیٰ قیامت تک کے لئے احادیث نبویہ میں تدلیس و تلبیس اور وضع و کذب کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس انتظام سے قبل احادیث میں جو کچھ گڑبگڑ مختلف اشخاص سے مختلف اسباب کے تحت ہو چکی تھی وہ پکڑی گئی، پوری بصیرت و اعتماد کے ساتھ ان کا قلع قمع کیا گیا، ایسی موضوع احادیث کو تلاش کر کے انہیں علاحدہ کتب میں جمع کیا گیا، تاکہ آسانی سے ان کی پہچان ہو سکے اور ان کے ضرر سے بچا جاسکے۔

یہ کام عربی زبان میں تو متقدمین و متاخرین دونوں طبقوں نے انجام دیا تھا مگر اردو زبان میں ماضی قریب سے اس کا سلسلہ شروع ہوا، اردو زبان میں تیار کردہ اس قسم کے لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر لوگوں نے یہ کام خالی الذہن ہو کر حفاظت حدیث کے مقصد سے انجام نہیں دیا بلکہ مخصوص نظریات و مفادات اور اغراض کے تحت انہوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا، کیوں کہ ان کتابوں میں مصنف کا انداز اور اسلوب اس کی طرف صاف اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے، مثلاً منکرین حدیث نے نفس حدیث ہی کو مجروح کرنے کا اسلوب اختیار کیا، علامہ تمنا عمادی اور علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی کی کتابوں میں رواۃ اور روایات کی کچھ اس طرح تشخیص و تخریج کی جاتی ہے کہ ذخیرہ حدیث ہی پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور روایان حدیث ورع و تقویٰ اور علم و فضل کے باوجود قاری کی نظر میں جعل سازوں اور افسانہ نویسوں کا ٹولہ دکھائی دینے لگتے ہیں، بلکہ علامہ کاندھلوی نے تو اپنی کتاب کا نام ہی ”مذہبی داستانیں“ رکھا۔ اسی طرح ایک کتاب ”موضوع روایات کا چلن“ کے نام سے چھپی، جس میں مصنف نے سارا زور ”فضائل اعمال“ کی مرویات پر صرف کر کے کتاب اور اس کے مصنف کا اعتماد مجروح کرنے کو نشانہ بنایا، اسی طرح بعض لوگوں نے یہ خدمت صرف حقیقت کی بیخ کنی کے لئے سرانجام دی، غرض یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ اور دیانتدارانہ طور پر

اردو زبان میں یہ کام کم از کم ہمارے سامنے نہ آسکا۔
 زیر تبصرہ کتاب اگرچہ اسی موضوع پر ہے — یعنی موضوع روایات کی تنقیح اور تعیین
 — مگر بچہ وجوہ متقدم کتب سے ممتاز ہے۔

الف: مصنف نے سب سے پہلے حفاظتِ حدیث کے اسباب و عوامل، وسائل
 و ذرائع، وضع حدیث کے اسباب و عوامل، اس کی تعریف، اس کا حکم، اس کی اقسام، اس کی
 تاریخ، اس کو پرکھنے کے اصول، ان اصول کی تدوین، ان کی خصوصیات، ان کے ماہرین،
 طبقات و شخصیات، جرح و تعدیل کے بنیادی قواعد، موضوع روایات کی نشاندہی کرنے والی
 کتب کا تعارف اور مقام، نقد کا طریقہ کار، اس کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ اور ان
 کی قوت اثر، جمع احادیث کی اقسام اور ان کے احکام وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مشتمل
 ایک تحقیقی مقالہ شامل کیا ہے، جو بجائے خود ایک کامل رسالہ ہے، جس سے اردو دانوں کو فن
 حدیث کی اہمیت اور اس کے لئے درکار اہلیت — تیقظ و بیدار مغزی کے ساتھ و فور علم
 و دقت نظر کی ضرورت — کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ ہر کسی مدعی
 معلومات کا چند حرف جان کر اپنے کو فن حدیث کا امام سمجھ بیٹھنا اس فن کی کیسی نادری اور
 اس شخص کی کس قدر نااہلی کا ثبوت ہے۔

ب: پوری کتاب پر وقت کے اساطین علم اور اساتذہ حدیث بالخصوص حضرت مولانا
 نعمت اللہ صاحب مدظلہ، حضرت مولانا زین العابدین صاحب رحمہ اللہ جیسی عبقری و متقی
 شخصیات نے نظر ثانی کر کے تائید و توثیق فرمائی ہے جس سے کتاب موثوق تر ہو گئی ہے،
 جب کہ خود مصنف کا مقام علم بھی اس کے لئے کافی تھا

ج: مصنف نے جہاں موضوع حدیث کی نشاندہی کی ہے وہیں اگر وہ حدیث
 دوسرے طریق یا دیگر الفاظ کے ساتھ معتبر مانی گئی ہے تو اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے کیوں
 کہ بسا اوقات نفس مضمون رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوتا ہے، اگرچہ وہ روایت یا متن

موضوع ہوتا ہے، اس کی نشاندہی نہیں ہونے سے — جیسا کہ بہت سے لوگوں نے نہیں کی — عوام الناس فی نفسہ اس مضمون ہی کو موضوع اور خلاف اصل سمجھنے لگتے ہیں۔

و: اسی طرح اگر کسی حدیث موضوع کا مفہوم کتاب و سنت کے مطابق ہو، یا وہ بات صحابہؓ یا اولیاء سے ثابت ہو تو اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے کیوں کہ بسا اوقات کسی صحابی کا اثر، یا کسی بزرگ کا قول ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب ہو گیا یا کر دیا گیا تو جہاں اس غلطی یا گستاخی کی تشخیص ضروری ہے وہیں اس قول کی واقعیت سے صحیح نسبت کے ساتھ فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ کتاب متعدد خصوصیات کی وجہ سے اپنی مثل آپ ہے، کتاب کو مفید، موثر اور معتبر بنانے کے لئے مصنف نے کتنی محنت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دوران تصنیف ایک سو پچیس کتابوں کو مد نظر اور بیسیوں علماء حدیث سے ربط رکھا ہے۔

بہر حال یہ ایک عمدہ کام اور بہتر سلسلہ ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہو چکے کام کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور بقیہ کام کی جلد تکمیل ہو کر منظر عام پر آنے کا سامان فرمائے۔ آمین امید کہ علماء و علم دوست عوام اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

(تبصرہ شمارہ دسمبر ۱۳ء)